آپ بیتی

رشید احمد صدیقی

مرتبہ

ڈاکٹر سید معین الرحمن

"—— ڈاکٹر سید معین الرحمن نے جس کاوش اور جانفشانی سے رشید صاحب کی آپ بیتی تشکیل دی ہے، وہ لائقِ تحسین ہے"

—— مختار مسعود

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہیں مسلسل اپنے حالات
قلم بند نہیں کیے، زیرِ نظر "آپ بیتی"، رشید صاحب کی مختلف،
... اور منتفرق تحریروں کی مدد سے مرتب اور مقتبس کی گئی ہے
رت، نفسِ عبارت اور اس کا نشر و اعلان سب کا سب رشید صاحب
کے قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں کہیں "بوئے خیر" نہیں آئے گی۔ میں
ف انتخاب اور اس کی جمع و ترتیب کا قصوروار ہوں۔ ذیلی
اشی میں صفحہ وار، اصل متن کے حوالے ہر جگہ درج کر دیے گئے
ہیں کہ جس نوع کی یہ کوشش اور کاوش ہے، اس کا عین اقتضا
یہی تھا ——

میں نے سنین اور تاریخوں کی تکرار اور بھرمار سے تحریر
گراں بار کرنے یا اچھے "کارناموں" کا اشتہار بنانے کے بجائے
اُس فضا و ماحول اور اُس منظر و پس منظر کو سامنے لانے کی
شش کی ہے جو رشید صاحب کی سیرت و شخصیت، اور
بحیثیتِ مجموعی اُن کی قسمت کی تشکیل کا موجب بنا۔
"زندگی کی تعبیر فضا سے کی جاتی ہے، نہ کہ واقعات و
حادثات سے ——" اس آپ بیتی کی ترتیب و تدوین میں
یہی اصول مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس صراحت کی یوں ضرورت
پیش آئی کہ قارئین اس سے وہ کچھ یا ایسی کچھ توقعات
وابستہ نہ کر بیٹھیں، جنھیں پورا کرنے کا میں نے قصد بھی
نہیں کیا۔

—— ڈاکٹر سید معین الرحمن

١١٦٩

786
١١٢٨

آپ بیتی

رشید احمد صدیقی

آپ بیتی

رشید احمد صدیقی

[حیات، اُفتاد اور فتوحات]

○

مرتبہ

ڈاکٹر سیّد مُعین الرّحمان

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لائلپور

○

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اُردو بازار۔ لاہور

اشاعت اوّل ۱۹۷۴ء

نیاز احمد نے
منظور پرنٹنگ پریس سے
چھپوا کر شائع کی

قیمت ۱۵ روپے

مُرتب : ڈاکٹر سیّد مُعین الرّحمٰن

ایم-اے، پی ایچ-ڈی

مَشاغل :

ریسرچ اسکالر، ترقیِ اردو بورڈ، کراچی	۶۴ — ۱۹۶۳ء
لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، بہاولنگر	۶۵ — ۱۹۶۴ء
لیکچرار شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورئنٹیل کالج، لاہور	۶۶ — ۱۹۶۵ء
لیکچرار شعبۂ اُردو، ایف سی کالج، لاہور	۱۹۷۳ — ۱۹۶۷ء

مَوجودہ مَصروفیت :

وائس پرنسپل، پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لائل پور

تصنیفات و تالیفات :

۱ : بابائے اُردو — احوال و افکار	۱۹۶۴ء
۲ : سیّد وقار عظیم (سوانحی خاکہ)	۱۹۶۷ء
۳ : نقدِ عبد الحق	۱۹۶۸ء
۴ : خیالستان (ترتیب مع مقدمہ)	۱۹۶۸ء
۵ : اِشاریۂ غالب	۱۹۶۹ء
۶ : آپ بیتی : رشید احمد صدیقی	۱۹۷۰ء
۷ : مُطالعۂ یلدرم	۱۹۷۱ء
۸ : غالبیات کا تحقیقی مطالعہ	۱۹۷۲ء
۹ : غالب اور انقلاب ستاون	۱۹۷۴ء

مُستقل پتا :

بہاولنگر : رحمان اسٹریٹ نمبر ایک، بہاولنگر

لاہور : ۱۴۶ - راوی روڈ، لاہور - ۲

اُردو کے جانباز سپاہی اور اپنے کرم فرما

بھائی ظہیر الدین احمد مرحوم

کی یاد میں:

"مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا، ترے پیچھے"

"میرا ذہن تو لبواری پیدل سفر کرتا ہے اور دماغ
میں وہی باتیں آتی ہیں جو خود مجھ پر گزر چکی ہیں —"

— رشید احمد صدیقی

ترتیب

یہ کتاب : صفحہ ۱۱

دیباچہ : عُذرِ تقصیر! ۱۳

۱ : "نہ پوچھ مجھ سے نامۂ اعمال کی دل آویزی" ۱۹

۲ : "کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے!" ۲۵

۳ : "مٹی کھانے پر ایک دن والد صاحب نے . . ." ۳۱

۴ : ". . . مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے" ۳۹

۵ : "پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور . . . ." ۵۱

۶ : "مولانا سہیل اور کچی بارک کے طفیل ذاکر صاحب . . ." ۶۱

۷ : "علی گڑھ مجھے کھیلنے کا شوق لایا -" ۷۵

۸ : "پروفیسر صاحب مجھ سے کلاس میں برہم ہو گئے" ۸۵

۹ : "آپ اپنے آپ کو اِس سند کا اہل ثابت کریں گے!" ۹۹

۱۰ : "رفتید ولے نہ اَز دلِ ما!" ۱۱۵

۱۱ : "طرح طرح کے کردار یاد آتے ہیں۔" ۱۸۲

۱۲ : "بچے خدا کا مصرعۂ طرح ہوتے ہیں۔" ۱۸۹

۱۳ : "وہ مرا پہلے پہل 'داخلِ زنداں' ہونا!" ۲۱۳

۱۴ : "سیر کر دنیا کی غافل، نوجوانی، پھر کہاں!" ۲۲۵

۱۵ : "دو حماقتیں ضروری ہیں: ایک شادی، دوسری شاعری!" ۲۴۹

۱۶ : "آدمی کی سیرت و شخصیت کا اندازہ اس سے بھی لگاتا ہوں کہ..." ۲۶۳

۱۷ : "میرے مضامینِ غزل کی نوعیت کے ہوتے ہیں۔" ۲۷۳

۱۸ : "میری داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ..." ۲۸۷

یہ کتاب!

یہ کتاب ۶۴-۱۹۶۶ء دو برس میں مرتب ہوئی اور چار برس بعد ۱۹۷۰ء میں چھپی لیکن بوجوہ چھپی رہی اور شائع نہ ہو پائی — مزید چار برس بعد، اب کہیں یہ اشاعت کا سفر پورا کر رہی ہے! یہ زمانہ کتاب اور مرتب، دونوں پر بڑا سخت گزرا — اب بھی سنگ میل پبلی کیشنز کے جناب نیاز احمد اس کی طباعت و اشاعت میں دلچسپی نہ لیتے تو جانے یہ کب تک منظرِ عام پر نہ آتی — ان کے لطفِ خاص کا شکر کیوں کر ادا ہو سکتا ہے!!

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج لائل پور

۲۵-جون ۱۹۷۴ء

عذرِ تقصیر!

"الزبیر" کا آپ بیتی نمبر موصول ہوا۔ آپ نے جس طور پر میری آپ بیتی کو ترتیب دیا ہے، اُس سے آپ پر کیا بیت گئی ہوگی اُس کا اندازہ آپ نہیں، مَیں کر سکتا ہوں۔ آپ نے محبت و عقیدت میں ہر دُشواری کو آسان ہی نہیں، پُر لطف بنا لیا ہو، تو عجب نہیں۔" (رشید احمد صدیقی بنام سیّد معین الرحمٰن)

۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ میں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کہانی، اُن کی زبان اور اُنھی کے بیان میں مُرتّب کی۔ تیس بتّیس صفحات کی یہ کہانی، اُردو اکیڈمی، بہاولپور کے سہ ماہی رسالے "الزبیر" کے 'آپ بیتی نمبر' میں چھپی۔ احباب نے اسے پسند کیا۔ خود رشید صاحب نے دل دہی کی لیکن چشم نمائی بھی فرمائی:

"اکثر یہ خیال ذہن میں آیا ہے کہ دُنیا میں ہم جس شخص کو جیسا سمجھ رہے ہیں، عقبیٰ میں اُس کو ایسا نہ پایا تو کیا ہوگا؟ اس لیے حتی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ لوگ میرے بارے میں رائے قائم کرنے میں احتیاط و اعتدال سے کام لیں۔ اسی میں دونوں کا بھلا ہے۔ آپ اور مَیں بفضلہٖ ابھی بقیدِ حیات ہیں، اِس لیے اس کا لحاظ رکھیں تو اچھّا ہوگا۔"

اِس "فہمائش"، پر مَیں مُتنبّہ ہوا لیکن بایں ہمہ رشید صاحب کی ایک سَیر حاصل آپ بیتی، ترتیب دینے کا خیال دل سے نہ نکلا۔ اِسی شوق اور جرأت رندانہ کا نتیجہ، وُہ سب کچھ ہے آپ آئندہ صفحات میں مُلاحظہ فرمائیں گے۔

○

رشید احمد صدیقی نے کہیں مسلسل اپنے حالات قلم بند نہیں کیے، لیکن یہ کوئی ایسی بات تسلسل اور تواتر کے ساتھ اُنہوں نے کچھ لکھا ہی کب ہے۔ پھر یہ صحیح ہے کہ اُنہوں نے کہیں یک جا اپنا تذکرہ نہیں لکھا لیکن نادرست یہ بھی نہیں کہ کب اور کہاں وُہ اپنے سے چوکے ہیں!

رشید صاحب بہت سُرتا سیانے، سریع الحس، تصوّراتی اور تخیلی ہیں۔ کیسی معمولی بات ہی کیوں نہ پیش آجائے، ماضی کے واقعات، خواہ وُہ کتنے ہی دُور پار یا آس پاس کے زمانے میں کیوں نہ گزُرے ہوں۔ اُن کے ہاں، حال کے آئینے پر ایک مخصوص معنویت کے ساتھ منعکس ہونے لگتے ہیں۔ حال اور مستقبل پر اُن کی نظر نہ رہتی ہو، ایسا نہیں، لیکن اِس کی تعبیر وُہ ضرور ماضی حوالے سے کرتے ہیں۔ اس لیے، کہ اُن کے نزدیک ماضی، ماضیٔ مطلق ہی بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ بشکلِ دگر وُہ حال میں دخل دینے اور اس پر اثر انداز ہونے کے لیے برابر ہمارے تعاقب میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ اپنے ماضی کے ذکر سے باز نہیں رہتے، رہ سکتے بھی نہیں۔ اُنہیں اپنا ذکر مرغوب ہی نہیں، وُہ اس پر مجبور بھی ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج اُفتاد ہی کچھ یہ ہے!

○

فنونِ لطیفہ میں دخل اور درک کے لیے بڑے ریاض، گیان دھیان، ضبط و ظرف اور تحمّل و تعقّل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اَدب، یعنی لفظوں کا فن بھی بڑی جاں کاہ اور کار آگاہی چاہتا ہے اور اَدب کی سب سے زیادہ دُشوار گزار اور اندیشہ ناک مہم اور منزل ہے: آپ بیتی! ابراہم کاؤلے (ABRAHAM COWLEY) نے سچ کہا ہے کہ:

"اَپنے حالات، آپ لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے۔

اگر انسان اپنی برائی کرے تو اپنا دل دُکھتا ہے اور تعریف
کرے تو پڑھنے والوں کو بُرا لگتا ہے۔"

اِس "مُشکل اور نازک" معاملے اور مرحلے سے رشید صاحب جس خوش دلی اور خوش سلیقگی سے گزرتے ہیں، وُہ کچھ اُنہی کا حصّہ ہے۔ لاریب، اِس وادی میں اُن جیسا آبلہ پا، کوئی دوسرا نہیں۔ نئی نسل کی تن آسانی، خود فریبی اور سہل انگاری کو دیکھتے ہوئے، یہ کہنے میں بھی کچھ تامّل محسوس نہیں ہوتا کہ اُن جیسا بے زنہار آبلہ پا، اس وادی کو، کوئی دوسرا شاید میسّر آئے گا بھی نہیں۔ وُہ مُسلّمہ طور پر اس وادی کے امام ہیں۔ لیکن اِسی وادی پر کیا موقوف، اَدبیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی طرف اُنھوں نے نظر کی ہو، اور اُس کے امکانات محدود تر نہ رہ گئے ہوں ۔ اور یہ اَدَبی کرشمہ ہے، اُن کی شخصیت کے تصرّف کا!

رشید صاحب کی شخصیت میں بڑی محکمی، سطوت اور رفعت ہے۔ وُہ بڑے رچے، کڑھے ہوئے، بے پناہ اور بھرپور ہیں۔ جس وقار و اعتبار، التفات و افتخار اور امتیاز و اعتماد سے اُنہوں نے جہاں تہاں اپنی ذات کا مطالعہ کیا ہے، محض کہنا ہی ہو، تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کی مثال اُردو اَدب میں کوئی، اور کہیں، نہیں ملتی۔ لیکن میں ایسی کوئی بات نہیں کہنا چاہتا جو رشید صاحب کے صریح حق میں جاتی ہو، نہ اس لیے کہ بہتوں کی نظر میں معتوب ہونے سے ڈرتا ہوں، بلکہ اِس لیے کہ خود رشید صاحب کی نظر میں مشکوک نہیں ہونا چاہتا — کہ رشید صاحب کی تعریف کیجیے تو ہنستے ہیں، لیکن اِس طور پر گویا تعریف کرنے والا احمق ہے!!

○

زیرِ نظر آپ بیتی، رشید صاحب کی مختلف، مُنتشر اور مُتفرق تحریروں کی مدد سے مُرتّب و مقتبس کی گئی ہے۔ عبارت، نفسِ عبارت اور اس کا نشر و اعلان سب کا سب رشید صاحب کے قلم کا نتیجہ ہے۔ اِس میں کہیں "بوئے غیر" نہیں آئے گی۔ میں صرف انتخاب اور اس کی جمع و ترتیب کا قصوروار ہوں۔ ذیلی حاشیوں میں صفحہ وار اصل متن کے حوالے، ہر جگہ درج کر دیے گئے ہیں۔ یہ اہتمام محض رشید صاحب کے ڈر کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ اس کی یوں بھی ضرورت تھی کہ جس نوع کی یہ کوشش اور کاوش ہے، اُس کا عین اقتضا یہی تھا۔

اِس آپ بیتی کی ترتیب و تسوید کے سلسلے میں رشید صاحب کی تصنیفات کے مندرجہ ذیل نسخوں کو بُنیاد بنایا گیا ہے:

۱ - مضامینِ رشید، مکتبہ اُردو، دہلی، سن ندارد
۲ - آشفتہ بیانی میری مکتبہ جامعہ، دہلی اگست ۱۹۶۲ء
۳ - ذاکر صاحب کتابی دُنیا، دہلی، س ن
۴ سہیل کی سرگزشت، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن، س ن
۵ شیخ نیازی، اشاعت ششم، سرسید بکڈپو، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء
۶ طنزیات و مضحکات، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، س ن
۷ گنج ہائے گراں مایہ، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء
۸ ہم نفسانِ رفتہ، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء
۹ خنداں، مکتبہ جامعہ، دہلی (اس سے پوری طرح استفادہ نہیں کیا جاسکا)

متذکرہ بالا مستقل تصانیف کے علاوہ رشید صاحب کی جن دوسری تحریروں سے استفادہ کیا گیا، اُن کی تفصیل یہ ہے:

۱ - مقدمہ باقیاتِ فانی، دوسرا ایڈیشن، مطبع آگرہ اخبار، س ن
۲ - ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں، نگار، کراچی، اپریل ۱۹۶۵ء
۳ - جدید اُردو غزل، نگار، کراچی، اگست ۱۹۶۵ء
۴ - اِدھر اُدھر کی، آج کل، دہلی، فروری ۱۹۶۴ء
۵ - ترسم نہ رسی بکعبہ ای اعرابی، فکر و نظر، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۳ء
۶ - کچھ حسرت کے بارے میں، نگار، لکھنؤ، حسرت نمبر ۱۹۵۲ء
۷ خطبہ صدارت، کل بہار ریاستی کانفرنس، پٹنہ ۱۲-۱۴ مئی ۱۹۵۱ء
مطبوعہ، مسلم یونیورسٹی میگزین ۵۲ - ۱۹۵۱ء
۸ - کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ نقدِ غالب، علی گڑھ، ۱۹۵۶ء
۹ - دیباچہ "دُنیائے تبسّم" (شوکت تھانوی)، س ن

۱۰ - نقوش، لاہور شخصیات نمبر جلد اوّل

۱۱ - نقوش، لاہور، شمارہ ۹۷، مارچ ۱۹۶۳ء

رشید صاحب کی نگارشات کی فراہمی، ان کے موازنے اور مقابلے، اخذ و انتخاب اور ماخذ و مصادر کی جستجو میں کہاں کہاں اور کس کس کے پاس نہیں گیا، کیا کیا کچھ نہ کرنا سُننا پڑا ـــ یہ داستان اپنی جگہ بڑی طویل ہے اور خاصی دل چسپ اور تحیّر آمیز بھی! لیکن اِسے چھیڑے کون، اِس لیے کہ پھر اس کا سمیٹنا بہت مشکل ہوگا۔

○

بڑے لوگوں سے مُصافحے، خیراتوں کے حساب اور مشائخ کے مزارات پر حاضری کی یادداشتوں کو، مَیں آپ بیتی نہیں سمجھتا ـــ اَدب اور نفس افزائی قطعاً مختلف باتیں ہیں اور ایک ساتھ ہوں تو لازماً مُزخرفات اور مُہمل بھی! زندگی مُجرّد واقعات کا مجموعہ نہیں، پیچیدگیوں کی ایک گرہ ہے۔ یہاں ہر فعل کسی رعائت، کسی تقاضے سے سَرزد ہوتا ہے۔ اِس طرح نوعیت کے اعتبار سے مشرق مغرب واقعے بھی بیچ در پیچ ایک دوسرے سے کہیں نہ کہیں ضرور گُتھے ہوتے ہیں۔ یوں کسی واقعے کو اُس مخصوص فضا اور اُس خاص عقب اور پس منظر میں رکھ کر، جس میں اُس کا خمیر اُٹھا ہے، پیش کرنے کے بجائے "واقعہ مطلق" کے طور پر بیان کر دینے سے بات نہیں بنتی!

مَیں نے سنین اور تاریخوں کی تکرار اور بھرمار سے تحریر کو گراں بار کرنے یا اسے "کارناموں" کا اشتہار بنانے کے بجائے، اُس فضا و ماحول اور اُس منظر و پس منظر کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو رشید صاحب کی سیرت و شخصیت اور بحیثیت مجموعی اُن کی قسمت کی تشکیل کا موجب بنا: "زندگی کی تعبیر فضا سے کی جاتی ہے، نہ کہ واقعات و حادثات سے" اِس آپ بیتی کی ترتیب و تدوین میں یہی اُصول مدّنظر رکھا گیا ہے۔ اِس صراحت کی یوں ضرورت پیش آئی کہ ناظرین اِس سے وُہ کچھ یا ایسی کچھ توقّعات وابستہ نہ کر بیٹھیں جن کو پورا کرنے کا مَیں نے قصد بھی نہیں کیا۔

○

یہاں ایک خدشے کا مجھے اور اظہار کرنا ہے جو اس کام کے دوران میں برابر میرا پیچھا کرتا رہا کہ میری یہ حرکت شاید رشید صاحب کے پسندِ خاطر نہ ہوگی ۔ رشید احمد صدیقی صاحب سے مجھے بڑی عقیدت ہے ۔ میرا ان سے ایک واسطے سے تلمّذ کا رشتہ بھی ہے ۔ بزرگوں، جی جان سے عزیز بزرگوں کی خفگی سہنے کے "دو چار سخت اتفاق" مجھے ضرور ہوئے ہیں اور میں ان سے بسلامت گزر بھی گیا ہوں لیکن رشید صاحب کے عتاب کو جو بے نام خاموشی اور بے نیازانہ لاتعلقی سے مرصّع ہوتا ہے، انگیز کرنے کی میں اپنے آپ میں سکت نہیں پاتا ۔ اس لیے جیسے جیسے، اُن کی کہانی اُنھی کی زبانی میرے ہاتھوں پھیلتی اور پھیلتی گئی ہے، میرا جی خوش لیکن خون خشک ہوتا رہا ہے ۔ ایک سہارا تھا اور ہے تو صرف یہ، کہ رشید صاحب نوجوانوں کی بعض لغزشوں کو، بوڑھوں کی اکثر موشگافیوں، سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں ۔

○

رشید صاحب کی "حیات، افتاد اور فتوحات" کے پیشِ نظر تذکرے کی ترتیب و تکمیل میں مجھے اپنے بعض بزرگ دوستوں اور عزیزوں سے بڑی مدد ملی ۔ امداد کی نوعیتیں مختلف تھیں ۔ کسی نے بات بنائی، کسی نے داد واکی، کسی کا دم رشید صاحب سے "شناسائی" اور ان تک رسائی کا موجب ہوا ۔ کسی نے کام جاری رکھنے اور ختم کرنے پر مسلسل اصرار کیا ۔ کسی کی سرخوشی و خوشنودی کا محض خیال ہی بجائے خود کام جلد ختم کرنے اور دیکھ بھال کر ختم کرنے کا محرّک ہوا ۔ اور کسی نے بیک وقت کم و بیش یہ سب اور بہت سے دوسرے ایسے وظائف انجام دیئے کہ میرے لیے موجودہ صورت میں اس کام کی تکمیل ممکن ہوسکی ۔

اس موقع پر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اُن عزیز اور محبوب چہروں کے نام لوں جن کے خلوص اور محبّت نے خود مجھے اپنی نظر میں آپ معتبر اور محترم بنایا، لیکن اندیشہ ہے کہ پھر اس کا سمیٹنا آسان نہ ہوگا ۔ اس لیے اس داستان کو ناگفتہ چھوڑتا ہوں ۔ یوں بھی، کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو بھلا اس بیان سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے ۔ یہ تو صرف میرے دل کا معاملہ ہے، اور :

اس دورِ بے اماں میں ہے دل کی بساط کیا !

سیّد معین الرّحمٰن

۱

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دِل آویزی
تمام عمر کا قصّہ لکھا ہوا پایا

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصّہ لکھا ہوا پایا

نامۂ اعمال کا حال تو حشر میں کھلے گا۔ اِس شعر کے دل آویز ہونے میں کلام نہیں جس کو پڑھتے ہی تمام عمر کا قصّہ سامنے آجاتا ہے عشق کی جنوں انگیزی، عقل سے سرشاری اور نہ کردہ گناہوں کی حسرت کی داستانیں، انسانی یادداشت اور تخیل کی صدگوناں پیکر تراشی اور فسوں کاری کو کیا کہیے کہ ماضی کی وُہ تصویریں جو اپنے وقت میں کچھ ایسی قابل التفات نہ تھیں اَب اس طرح سامنے آتی ہیں جیسے ان سے زیادہ دل نشیں نہ کوئی تصوّر ہو نہ تصویر۔

کبھی ایسا نظر آنے لگتا ہے جیسے شام کے وقت کسی لق و دق ریگ زار میں، دور بہت دور اُفق پر اُونٹوں کے لدے پھندے قافلے، تھکے لیکن ہموار قدم اور ناقابل شکست عزم و اُمید کے ساتھ گزر رہے ہوں اور ان کی پرچھائیں سورج کی آخری لرزاں و رقصاں کرنوں میں آسمان و زمین کے موہوم خطِّ فاصل پر ایک دوسرے کے پیچھے رینگتی چلی جارہی ہو، جیسے کسی سیاہ دفتی سے اُونٹوں کی تصویریں تراش کر نہ دکھائی دینے والے تار میں منسلک کردی گئی ہوں اور کوئی غیبی طاقت ان کو کشاں کشاں کسی نامعلوم منزل کی طرف لیے جارہی ہو۔ تصوّر کی عجوبہ تراشی کبھی یہ سینما پیش کرتی ہے جیسے ماضی کے دھندلکے سے یادوں کا یہ کارواں اس طرح گذر رہا ہو جیسے زمین کے شمالی سرے کے ناپیدا کنار برف زاروں سے سفر نصیب مرغابیوں کی لمبی لمبی لہریئے دار

لے ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں، نگار (اپریل ۱۹۶۵ء) صہ۵۷

قطاریں تن بہ تقدیر اُڑتی چلی جارہی ہوں۔ جیسے ان کا سفر کبھی ختم نہ ہونے والا ہو اور وُہ ہمیشہ کے لیے کسی سرد و ساکن اور پراسرار اُفق میں اسیر پرواز ہوں، سمجھ میں نہیں آتا ان لامتناہی یادوں کے کارواں کو کیسے اور کہاں گرفت میں لاؤں۔

معلوم نہیں کیا عمر تھی، کون سا قریہ یا قصبہ تھا۔ اُن اشخاص کا بھی علم نہیں جو میری پرورش اور دیکھ بھال کرتے تھے البتہ کچی دیوار کی ایک کشادہ کوٹھری یاد ہے۔ اِس کی مٹیالی لیکن ستھری اور روشن دیواریں اور دروازے۔ سوچتا ہوں یہ بات کیا ہے کہ کوئی چلتا پھرتا، مجھے چھوتا اور سنبھالتا ہوا شخص کیوں نہیں یاد آتا۔ وُہ کوٹھڑی کیوں ذہن پر نقش ہے۔ ایسا تو نہیں کہ انسان کی آنکھ سب سے پہلے اشخاص پر نہیں بلکہ کھلی ہوئی یا چھپی وسیع پُرکشش اور بوقلموں کائنات پر کھلتی ہو، پیدا ہوتے ہی نہیں، مرتے وقت بھی۔ یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگ یا اس کوٹھری کے باہر کے اطراف و مقامات کب اور کیسے پہچان میں آئے۔

کچھ دنوں بعد ایک دوسری جگہ یاد آتی ہے۔ سڑک کے کنارے معمولی سا ایک مکان، گھنے، مضبوط شاداب درختوں اور ان سے چھن کر آنے والی سورج کی کرنوں کی دھوپ چھاؤں میں لوگ چلتے پھرتے نظر آتے۔ آدمی آتے جاتے رہتے لیکن نگاہ سائے اور روشنی کے ان بے ترتیب اور ان گنت نقشوں پر جمی رہتی جو زمین پر جا بجا بکھرے ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے دُنیا میں جو کچھ تھا یہی تھا اور اتنا ہی تھا پھر ایک اور جگہ سے سابقہ ہوا۔ وہاں تصوّرات میں وسعت آئی ماں باپ کو پہچاننے لگا اور ہر تکلیف و راحت میں یاد آنے لگے۔

چاروں طرف طرح طرح کے لوگ، چیزیں، حالات و حوادث، روز بروز بڑھنے لگے پھیلنے لگے۔ اچھا کھانا، اچھا لباس، اچھا سلوک، اچھے لوگ پسند آنے لگے۔ بُرے اور بدصورت بُرے معلوم ہونے لگے۔ کیوں اور کیسے؟ یہ نہیں معلوم جس "تاثراتی تنقید" سے آج مُتہم ہوں اُس کی چھوت شاید اُسی وقت سے دامن گیر ہو۔

اِس کے بعد وُہ زمانہ آتا ہے جب پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب مُقرّر کیے گئے۔ جو کچھ پڑھاتے وُہ سمجھ میں نہ آتا۔ اُن کی شکل بھی اچھی نہ تھی لیکن اُن کا طور طریقہ بات چیت کرنے اور بتانے سمجھانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بہتوں کی خوبصورتی سے اُن کی بدصورتی زیادہ

اچھی لگتی۔ بہت دنوں بعد خیال آیا کہ وہ مذہبی آدمی تھے۔ اِتنے ہندو مسلمان کے معنوں میں نہیں جتنے اللہ رسول کے مفہوم میں۔ دُنیا کے کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرا ہوں، مذہب و اخلاق کے اس برہم پاکشش سے میں نے اپنے کو آزاد نہ پایا۔ کتنی ہی دیر ہو جائے، کتنا ہی دُور ہو جاؤں، ہر پھر کر اسی دائرے میں قدم پڑنے لگتے ہیں۔ طفولیت کے اس خیاباں سے شگفتہ و شاداب یادوں کی کیسی دلنوازخوشبو آتی ہے۔

مولوی صاحب کے ہمہ گیر و ہمہ وقت تسلّط کے علاوہ دیہات کے اسکول کی گرفت میں آیا۔ جہاں ہم عمروں کے ساتھ پڑھنے، لکھنے، سیکھنے، کھیلنے، جھگڑنے اور جلد صلح صفائی کر لینے کے لطف اُٹھانے کے طور طریقے سیکھے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں میں نے گھر میں پلے ہوئے جانوروں کے علاوہ اِنسانوں سے محبت کرنے اور ان کی محبت سے سرخوش و سرفراز ہونا محسوس کیا۔ ہر روز گھر سے خوشگوار اُمیدوں کے ساتھ جانا اور اس ناقابلِ اظہار احساس سے مُطمئن و مفتخر واپس آنا کہ گھر پر کتنا پُرتپاک خیر مقدم ہو گا جیسے میرا جیسا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اپنے سے خوش رہنا اور اپنے اُوپر بھروسہ کرنے کی نعمت شاید مجھے اُسی وقت سے میسّر ہے۔

دیہاتی مدرسے سے شہر کے انگریزی اسکول میں آنا یاد ہے۔ عمر و شعور کے بڑھنے اور ماحول کے بدلنے سے دفعتاً اَب معلوم ہوا جیسے زمان و مکان، حالات و حوادث انسان واشیا سبھی بدل گئے ہوں۔ معلومات کے کتنے دروازے کھلتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ کیسے کیسے مسائل سے سابقہ ہونے لگا۔ بڑوں کا پاس، اعلیٰ اقدار سے وابستگی اور کبھی کبھی ان سارے بندھنوں سے آزاد ہو جانے کی بے پناہ خواہش۔ اُن بزرگوں اور خاندانوں کی یاد کتنی قوی، تازہ اور متحرک ہے جن سے وہ شہر معمور تھا، جو اپنے سے چھوٹوں کے لیے خواہ وہ کسی طبقے سے ہوں، اپنی بزرگی اور ذمہ داری کو کبھی نہ بھولتے تھے۔ کوئی اُن دنوں شریف و وضع نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اپنے سے چھوٹوں کے لیے شریف و وضع تھا۔ یہ یادیں ہیں یا رگ و پے میں پیوست زنجیریں جن سے اَب تک رہائی نہ ملی۔

اسکول اور کالج کے درمیان کا ایک سال ایسا گزرا جب زندگی کا قافلہ راستے سے بھٹک گیا۔ اَب معلوم ہونے لگا جیسے دُنیا میں کوئی خوبی باقی رہی ہے نہ خوبصورتی۔ اپنے

اور دوسروں کے بارے میں جتنی اچھی رائے قائم تھی وُہ نقش بر آب نظر آنے لگی - دل میں یہ خیال گزرنے لگا جیسے مجھ جیسا بے مصرف آدمی اور کوئی نہ ہوگا - کیسی بد دلی اور بے بسی کے دن تھے - یادوں کے وُہ کریہہ و قبیح پیکر ماضی کے دھندلکوں میں کریہہ و قبیح تر نظر آتے ہیں - یکایک فلم کا یہ فیتہ کٹ گیا اور وُہ منظر سامنے آتا ہے جب علی گڑھ کالج میں داخل ہوا - یہ زمانہ اور کتنا زمانہ حاصل زندگی رہا - اعلیٰ با مقصد زندگی کے کیسے کیسے امکانات کا علم ہوا اور ان پر عمل کرنے کی سہولتیں نصیب رہیں - یہ سہولتیں مجھے کہیں اور میسّر نہیں آسکتی تھیں - کیسے دن تھے جب بڑے بڑے قصور کو ادنیٰ بہانے پر معاف کر دینے کی خوشی اور بڑائی حاصل ہوتی تھی -

اعلیٰ اقدار و روایات کا احترام، خوردوں کی سعادت مندی، بزرگوں کی شفقت، علم و ہنر کا چرچا، ذوق کی تازہ کاری، طرح طرح کی شوخی و شرارت، رزم ہو یا بزم، اعلیٰ انفرادی، انسانی صلاحیتوں کو کام میں لاکر ممتاز رہنے کا حوصلہ، یہ یادیں محض یادیں نہیں ہیں - وُہ تو جسم و جاں کا جزو اور سوچنے کا انداز بن چکی ہیں - یہ وُہ جگہ تھی جہاں نہ صرف اچھی صلاحیتوں کو برگ و بار لانے کا موقع ملتا ہے بلکہ یہ صلاحیتیں یہاں پیدا بھی کی جاتی تھیں - میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ جن بعض اچھی استعدادوں کو پیدا کرنے میں فطرت بخل کرتی تھی، یہ دانش گاہ اُسے بڑی فیاضی سے اپنی طرف سے پورا کر دیتی تھی -

معلوم نہیں کیسے کیسے تہذیبی عوامل، یہاں کس کس طرح اور کن لوگوں کے ذریعے کارفرما رہے ہوں گے جن کے طُفیل یہ یادیں شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی کا کام دے رہی ہیں -

○

۲

"کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے!

۰

جہاں جائیں وہاں تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں[1]
کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے

میری تحریروں میں یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ان میں "علی گڑھ" بہت ہوتا ہے اس لیے وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے اُن کو اِن مضامین یا اس طرح کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ میری اِس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑھنے بھی لگے ہیں۔ اُن سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے۔ وہ یہ کہ وہ خود علی گڑھ سے کیوں نہیں واقف ہیں! اُردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اُردو کا نام علی گڑھ بھی ہے!

علی گڑھ[2] نے کسی کام کا نہ رکھا۔ اِس نے اپنا بنا لیا۔ یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکّی[3] محبوب ہے، نہیں چاہتا کہ اس کے ادنیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کی جائے۔ اِس نے مجھے میری نظر میں محترم کر دیا، اِس قید سے مخلصی کہاں بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ! مجھے[4] جو شئے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہو جائے کسی[5] اجنبی سے ملاقات ہوتی ہے اور اُس کے طور طریقوں سے خوش ہوتا

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۹ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۳ [3] گنجہائے گراں مایہ، ۷۶

[4] ہم نفسانِ رفتہ، ۸۰ [5] آشفتہ بیانی میری، ۱۳

ہوں تو اکثر پوچھ لیتا ہوں کہ وُہ کبھی علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا ہے یا نہیں، ہوتا ہے تو فخر[1] سے گردن اونچی اور مسرّت سے دل لبریز ہو جاتا ہے (اور[2]) اُس کے خوش اوقات، خوش مذاق ہونے پر تعجب نہیں ہوتا۔، نہیں[3] ہوتا تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا آدمی علی گڑھ کے فیضان سے بھی کیوں محروم رہا۔ اِس[4] سے یہ جتانا مقصود نہیں کہ علی گڑھ کا ہر پڑھا لکھا ہر خوبی سے متصّف ہوتا ہے اور جو علی گڑھ کا نہیں ہوتا وُہ اِن خوبیوں سے عاری ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کا ایک خاص رنگ، رکھ رکھاؤ یا ٹھپّا ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے مُمتاز یا مُمتائز کرتا ہے۔ اِس ٹھپّے کے بھی اقسام ہیں بعض پسندیدہ بعض ناپسندیدہ۔ علی گڑھ کوئی جنت یا جہنم نہیں ہے جہاں صرف منتخب لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست رہتا ہو۔ وُہ تو اِسی دنیا جیسی چیز ہے جہاں اپنی جنت یا جہنم بنانے کی ہر شخص کو آزادی ہوتی ہے۔ محض علی گڑھ کا ہونا کسی شخص کے معقول ہونے کی دلیل نہیں، جس طرح محض مُسلمان ہونا، ہمارے آپ کے معقول و مُعتبر ہونے کا ثبوت نہیں!

بہت دنوں[5] کی بات ہے، گو بڑھاپے کی وجہ سے کل کی بات معلوم ہوتی ہے جب طالب علمی سے مُعلّمی کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ مَیں نے اپنی ایک کتاب طنزیات و مُضحکات کا انتساب علی گڑھ کے نام اِن الفاظ میں کیا تھا:

"اپنے کالج کے نام جس کے فیضان نے کسی
دوسرے کے فیضان کا محتاج نہ رکھا۔"

حال ہی میں ایک اہم موقع پر جہاں فضلائے عظام کا اجتماع تھا جس میں علی گڑھ اور باہر کے حضرات بھی شامل تھے، یہ سوال کیا گیا کہ میں نے لکھنے کا انداز کہاں اور کیوں کر پایا۔؟ معلوم نہیں کیوں اور کیسے، بے اختیار زبان پر یہ فقرہ آیا۔ "علی گڑھ نے دیا!" تفصیل کسی نے نہ پوچھی، مُطمئن سب ہو گئے! ذہن میں یہ بات (آتی ہے) کہ (یہاں) اِسی امر کو واضح کرنے کی کوشش کیوں نہ کروں کہ علی گڑھ نے مجھے کیا دیا اور کیسے دیا!؟

(مگر) یہ وسوسہ پیدا (ہوتا ہے) کہ شاید مجھ پر یہ الزام رکھا جائے کہ میں اپنا

---

1. گنجہائے گراں مایہ، ۶۷، 2. آشفتہ بیانی میری، ۱۳ 3. گنجہائے گراں مایہ ۶۷،
4. آشفتہ بیانی میری، ۱۳ 5. آشفتہ - ۲۱، ۶ ۱۹۶۶

Propaganda کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں (آتی ہے) کہ میرا Propaganda دوسرے کیا کم کرتے ہیں کہ میں خود کرنے لگوں پھر عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں Propaganda نہیں کرتے توبہ و استغفار کرتے ہیں یا عقدِ ثانی و ثالث۔ مجھے اَب تک اِن میں سے ایک کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ ممکن ہے آئندہ بھی نہ ہو۔ اِس لیے کہ کچھ اِس طرح کا اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں توبہ و استغفار اَور عقدِ ثانی و ثالث لازم و ملزوم تو نہیں ہیں؟

ایک بات کا اور خیال آتا ہے۔ وُہ یہ کہ علی گڑھ نیز اپنے بارے میں اکثر لکھتا رہا ہوں۔ کبھی اپنی عادت سے بے اختیار ہوکر، کبھی دوستوں اور عزیزوں کے تقاضے سے برافروختہ ہوکر۔ نا دانستہ طور پر بھی وہی باتیں یہاں دہرائی گئیں تو ممکن ہے ناظرین پر گراں گزریں لیکن اِتنی فرصت نہیں اور جی بھی نہیں چاہتا کہ پچھلی تحریروں میں اس طرح کے حالات اور واقعات اس خیال سے تلاش کرتا پھروں کہ ان کو یہاں دہرانے سے بچوں! ضمناً یہاں اپنی ایک کمزوری کا بھی اعتراف کر لینا چاہتا ہوں وُہ یہ کہ اَب تک جتنے مضامین لکھ چُکا ہوں وُہ سب میری نظر سے گر چکے ہیں۔ اگر کوئی ان کا ذکرِ خیر کرتا ہے لیکن مجھ سے طاقتور رہوتا ہے تو دَرگزر سے کام لیتا ہوں، کمزور رہوتا ہے تو اقلاً اس کو مار ڈالنے کا جی چاہتا ہے! اِسی بنا پر میں اپنے مطبوعہ مضامین دوبارہ پڑھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا اَپنے چھپے ہوئے مضامین بہ طیبِ خاطر شاید ہی مَیں نے دوبارہ پڑھے ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں ایسے لوگ نا پید نہیں ہیں جو اپنے کسی مُپرس رشتے داروں یا ہم وطنوں سے رُتبے یا روپے کے اعتبار سے اُونچے ہو جاتے ہیں تو اُن سے تمام عمر منہ چھپاتے پھرتے ہیں!

(بہر نوع) آئندہ صفحات[1] میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وُہ علی گڑھ کے بارے میں میرے ذاتی خیالات اور تأثرات ہیں اور زیادہ تر مجھی سے متعلق ہیں۔ اِن میں کہیں دَرازنفسی ملے گی، کہیں ژولیدہ بیانی، کہیں خودُ کلامی یا حدی خوانی۔ ایک آدھ جگہ خام خیالی بھی۔

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۱

جابجا "رندانِ درمیکدہ" کی گستاخی نظر آئے گی۔ فقیہہِ شہر یا مُلّائے مکتب کے فیصلے یا فضیحے سے بھی سابقہ ہو تو عجب نہیں لیکن اِن سب پر بھاری وُہ منطق ہے جو اس شعر میں ملے گی

حدیثِ دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشان را

"قصۂ زلف پریشاں" میں یہ سب (اکثر ان سے زیادہ بھی) انگیز کرنا پڑتا ہے۔ اِس سے اپنی ہی کوتاہیوں کی جواب دہی مقصود نہیں ہے اِن سطور کے پڑھنے والوں کے بھی کسی نہ کسی قصّۂ زلفِ پریشان کی جواب دہی مدِّنظر ہے! اگر ان خیالات و تأثرات سے کسی کو اتفاق ہو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اختلاف ہو تو تعجب نہ ہوگا۔ علی گڑھ سے متعلق بعض دوستوں اور عزیزوں کے خیالات یقیناً ویسے نہ ہوں گے جیسے کہ میرے ہیں۔ وُہ علی گڑھ کو اُس رنگ میں اور اُس طرح پر دیکھنا چاہتے ہوں گے جو اُن کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ لاریب یہ بھی علی گڑھ کی خیر اندیشی میں ہوگا۔

زیرِ نظر صفحات[۱] میں جو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا وُہ علی گڑھ کے بارے میں ایسے دیرینہ اور مسلسل تأثرات ہیں جو اَب میرے لیے تجربے کا درجہ رکھتے ہیں اِس لیے ممکن ہے ان میں "واقعیت" کی کمی ہو لیکن اس کو کیا کروں بعض اوقات مجھے اپنے تأثرات، اپنے تجربات سے زیادہ عزیز اور زیادہ مُعتبر ہوتے ہیں۔ یوں بھی مخلصانہ خامی کو میکانکی خوبی پر، کبھی کبھی ترجیح دیتے رہنا چاہیے! یہ بات اِن سطور کے پڑھنے والوں کے لیے قابلِ وقعت ہو یا نہ ہو، اِن سطور کے لکھنے والے کے لیے بہت اَہم رہی ہے۔

جن باتوں کو جس طرح بیان کرنا چاہتا ہوں معلوم نہیں اُس میں کامیابی ہوگی بھی یا نہیں۔ اِس وقت کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے میرا حال VICTOR HUGO کے مشہور ناول* The Hunch Back of Notre-Dame کے

---

[۱] آشفتہ بیانی میری، ۱۴۷

* یہ فرانسیسی زبان کا ناول ہے اس کا ہیرو ایک کبڑا ہے جو خود کو نوتردام (یعنی گرجا گھر) میں جذب کر دیتا ہے اور اپنی الگ ہستی نہیں مانتا۔ اس ناول کی بنا پر انگریزی میں ایک فلم بھی بنا ہے جس کا نام ہے "دی ہنچ بیک آف نوتردام" (یعنی! نوتردام کا کبڑا)

عجیب الخلقت کریہہ منظر کُبڑے QUASIMADO کا سا ہو جو مدت العمر نوتر دام کے مشہور گرجے کا گھنٹہ بجانے پر مامور رہا اور بجاتے بجاتے اُس پر ایسی وارفتگی طاری ہوئی تھی جیسے وُہ نوتر دام یا نوتر دام اُس میں پیوست ہو گیا ہو! ممکن ہے میں علی گڑھ کے نوتر دام کا کُبڑا بن گیا ہوں!

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیتِ مجموعی "شخصیت" کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علی گڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیے۔ اگر میں علی گڑھ نہ آتا اور میری صلاحیتوں کا سابقہ اس کسر و انکسار سے نہ ہوتا جو علی گڑھ کہلاتا ہے تو مجھے اندیشہ ہے وُہ صلاحیتیں (کُل نہیں تو اکثر) مفید ہونے کے بجائے میرے اور دوسروں کے لیے مُضر ثابت ہوتیں۔ اب تک مَیں نے یہ کبھی محسوس نہ کیا نہ کسی نے بتایا کہ مجھ پر علی گڑھ کا جو اثر ہوا وُہ فی الجملہ میرے یا دوسروں کے لیے نامُبارک ثابت ہوا۔ البتہ علی گڑھ نے جتنا فائدہ مجھے پہنچایا، اُس سے یقیناً بہت کم میں اُسے پہنچا سکا۔

مجھے اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے اور اس کے جواز میں کسی طرح یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ایسا کون ہے جس میں کمزوریاں نہیں ہوتیں! لیکن یہ علی گڑھ کی دی ہوئی نہیں ہیں۔ مَیں ان کو ساتھ لایا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ شاید علی گڑھ کی پیدا کی ہوئی مجھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے اگر ہے تو اُس کو بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے کہ جب تک آدمی رُتبے میں بہت بڑا نہ ہو جائے کمزوریوں کے اقرار کرنے میں نہ اس کا فائدہ ہے نہ دوسروں کا۔ پولیس کی دست اندازی یا مُلّاؤں کی دست درازی کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔

۳

"مٹی کھانے پر والد صاحب نے ایک دن میرے دونوں
کان پکڑ کر مجھے اِتنا اُونچا کر دیا جِتنا کہ اَب میں ہوں"

بہت دِن[1] کی بات ہے جب میں (بہت ہی) چھوٹا تھا . . . میرا خیال ہے کہ مَیں نے شرارت کبھی نہیں کی لیکن (اَب یہ) کیا چھُپانا، بے وقوفیاں البتہ (خوب خوب) کی ہیں - مَیں[2] بیوقوف ہوں اسی لیے (بچے) عقل مندی سیکھنے کے لیے میرے پاس آتے رہتے ہیں -

بچے بڑے ہوں گے تو اُن کو ایسے بہت سے عقل مند ملیں گے جنہوں نے بے وقوفوں سے عقل مندی سیکھی ہو گی - خود مَیں نے ایسے ہی عقل مندوں سے بے وقوفی سیکھی ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں بے وقوف ہوں — مَیں[3] نے شرارت کبھی نہ کی اس لیے ماں باپ کے ہاتھ سے کبھی نہیں پٹا لیکن بے وقوفیوں کے سلسلے میں مجھے بعض سزائیں (ضرور) بھگتنی پڑی ہیں میں جہاں رہتا تھا اُس سے قریب ہی ایک ٹوٹی مسجد تھی جس میں بہت سارے چمگادڑ تپسیا میں اُلٹے لٹکے رہتے تھے - کچھ بے ٹونٹی کے مٹی کے لوٹے جہاں تہاں رکوع اور سجود میں نظر آتے تھے - کسی زمانے میں مسجد کے گرد احاطہ بھی تھا، جس کی دیواریں گر چکی تھیں، لیکن سامنے کا دروازہ قائم تھا جس میں کواڑ اور کنڈی بھی تھی - گھر کا ایک بوڑھا ملازم تھا فضلو - نہایت دُبلا پتلا - اُس کے ہاتھ ایسی لکڑی کے بنے معلوم ہوتے تھے جس پر سے سوکھی چھال علیحدہ نہ کی گئی ہو - خاموش جھکا ہوا، بالکل اسی ٹوٹی مسجد کی مانند - کبھی کبھی میں اُسے پسند بھی کرتا تھا لیکن آگے چل کر آپ کو معلوم ہو گا کہ میں کیوں اُس سے بیزار ہو گیا -

---

[1] شیخ نیازی، ۸۳ [2] شیخ نیازی، ۸۴ [3] شیخ نیازی، ۸۵

والدہ کی تاکید تھی کہ بڑے بھائی کا نام نہ لیا کرو۔ اس زمانے میں اپنے سے بڑے کا نام لینا اور رشتہ یا تعظیم کا کوئی لفظ شامل نہ کرنا بدتمیزی خیال کیا جاتا تھا۔ بڑے بھائی کا پیار کا نام صمنا تھا۔ اکثر غصّے میں اُن کو صمنا کہہ دیتا اس کی شکایت ہوتی تو ماں باپ مجھ کو سمجھاتے اور بُرا بھلا کہتے۔ چنانچہ معلوم نہیں کیوں اور کیسے میں یہ سمجھنے لگا کہ صمنا نام نہیں بلکہ کوئی گالی یا بدتمیزی تھی۔

ایک دن بھائی صاحب کی شکایت کرنے ماں کے پاس پہنچا۔ بے وقوف ہونے کے [illegible] میں کمزور اور مریض بھی تھا اس لیے ہر شکایت رو کر پیش کرتا ہی نہیں بلکہ روتا زیادہ اور شکایت کم کرتا! والدین سمجھنے لگے تھے کہ جب تک میں رونے کا پورا کورس ختم [illegible] گا مطلب کی بات زبان پر نہ آنے دوں گا۔ اس لیے میرے رونے کی طرف توجہ نہ کرتے۔ اِس سلوک سے ظاہر ہے مجھے اور زیادہ رونا پڑتا۔ رونے میں میرا کچھ بگڑتا نہ تھا اور ظاہر ہے اس طرح کے رونے سے میں کسی اور کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا، اس لیے میرے رونے کی مدّت ہمیشہ بڑھتی رہی لیکن جلد ہی مجھ پر یہ بھید کھُلا اور آنکھیں کھُلیں (میں آنکھ بند کرکے روتا تھا) کہ اِس طرح روتے رہنے میں اتنی دیر لگ جاتی ہے کہ شکایت کرنا ہی بھول جاتا ہوں۔ اِس طرح نہ جانے میری کتنی معصوم شکایتوں کا خون ہوتا رہا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی باوجود اِس کے کہ میں کافی اونچے سُروں میں روتا تھا۔

آخر میں مجھے کچھ ایسا بھی معلوم ہونے لگا تھا کہ شاید میرے رونے کا تال سُر ٹھیک نہ تھا، اس لیے کہ لوگ ہمدردی کرنے کے بجائے مجھ پر ہنسنے لگتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تو ایسا کچھ بُرا بھی نہ تھا۔ رونا تو اس کا تھا کہ وُہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنستے۔ اسی لیے خاص طور پر میں نے آنکھیں بند کرکے رونا شروع کر دیا تھا۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ تال سُر سے رونا بہتر ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی کے رونے پر ہنسنا اچھی بات نہیں ہے اور کسی کے ہنسنے پر رونا تو اور زیادہ ہنسی کی بات ہے! لیکن میں بے وقوف ہوں، میری اپنی ذمّہ داریاں کیا کم ہیں کہ مَیں دوسروں کے رونے ہنسنے پر زیادہ دیر تک سوچوں اور سوچنے سے یوں بھی بے وقوف ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے!

والدہ کے پاس شکایت لے کر پہنچنے کا قصّہ یہ ہے کہ میں نے بھائی صاحب کی کتاب پھاڑ ڈالی ۔ ظاہر ہے اُنھوں نے میری کتاب پھاڑ ڈالی ہو گی گو اُس وقت تک مجھے کاپی کتاب سے کوئی سروکار نہ تھا ۔ یہ بات کسی اور کی سمجھ میں آتی ہو یا نہیں میری سمجھ میں تو خوب آتی ہے کہ کتاب پھاڑنے کا بدلہ کتاب پھاڑنے ہی سے لیا جا سکتا تھا ۔ میں اگر اپنے معصوم ذہن پر زور ڈالتا تو یہ بھی ممکن تھا کہ بھائی صاحب کی کتاب نہ ملتی تو مَیں کسی اور کی کتاب پھاڑ ڈالتا !

جب تک میں روتا رہا والدہ خاموش رہیں ۔ میں یہ سمجھا کہ میرے رونے کا اثر ہو رہا ہے اس لیے مَیں نے اس سلسلے کو جاری رکھا ۔ نتیجہ وہی ہوا جو میں بتا چکا ہوں یعنی رونے کا کورس ختم ہو گیا اور میں وُہ بات بھول گیا جس کے لیے رونا شروع کیا تھا ۔ والدہ نے پوچھا کہ کیا بات تھی تو بجائے بات یاد آنے کے مجھے رونا یاد آ گیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وُہ پھر دوسری طرف متوجہ ہو گئیں مَیں نے چیخ کر کہا کہ بھائی صاحب نے مجھے گالی دی ہے !

والدہ کو گالی سے بڑی نفرت تھی ۔ اکثر کہا کرتیں کہ گالی سے بہتر مار پیٹ ہے ۔ والدہ کا یہ کہنا مجھے یاد تھا ایک دفعہ مَیں نے اس پر عمل بھی کیا لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مار پیٹ یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہوتی ہے ۔ جہاں اس طرح کا طرفہ کاروبار ہو رہا ہو وہاں مجھ جیسا بے وقوف جس کا ذہن یک طرفہ ہوتا ہے ہمیشہ گھاٹے میں رہے گا ۔ بھوت اور بے وقوف دونوں کے بزرگوں نے مار پیٹ سے بچنے کی بڑی قیمتی وصیتیں چھوڑی ہیں !

بھائی صاحب بُلائے گئے اور اُن سے جواب طلب کیا گیا ۔ الزام سُن کر وُہ ہکّا بکّا رہ گئے ۔ پھر بولے اِنھیں سے پوچھیے میں نے کب کونسی گالی دی ہے ۔ ؟ میں نے ایک نعرہ لگا کر کہا ”انھوں نے مجھے بڑے زور سے صمنا کہا ہے ۔“ لیکن مَیں یہ دیکھ کر خود ہکّا بکّا رہ گیا کہ سارے گھر والوں نے میرے نعرے سے کہیں بلند قہقہہ لگایا ۔ اس کے بعد بھائی صاحب نے میرے خلاف اپنی کتاب پھاڑ ڈالنے کا جو الزام لگایا اس پر مجھے سزا دی گئی ۔ فضلو بُلایا گیا اور یہ ہدایت کی گئی کہ مجھے لے جا کر ٹوٹی ہوئی مسجد میں بند کر دیا جائے جہاں مجھے سیاہ (گیدڑ) کھا جائے گا ! وُہ مجھے پیٹھ پر لاد کر مسجد لایا اور اندر

دھکیل کر صدر دروزہ کی کنڈی باہر سے چڑھادی!

مَیں دیر تک روتا شور مچاتا اور دروازے کو دَھکّے دیتا رہا۔ اِس میں شک نہیں کہ آس پاس کی دیواریں گری ہوئی تھیں اور میں کسی طرف سے باہر نکل سکتا تھا لیکن میرے ذہن میں یہ بات کس طرح آسکتی تھی اور آتی بھی تو میں اُسے مان کیوں لیتا کہ جس دروازے سے مجھے مسجد میں داخل کیا گیا، نکلنے کے لیے میں اُس کے بجائے کوئی اور دروازہ تلاش کرتا۔ مَیں بتا چکا ہوں کہ میرا ذہن ایک طرفہ تھا۔ قاعدہ کی بات یہ ہے اور بے وقوف سے زیادہ قاعدہ کا پابند کون ہوسکتا ہے کہ جس راستے سے داخل ہوں اسی راستے سے باہر نکلیں۔ اگر وُہ راستہ بند ہے تو قصور اُس راستہ کا ہے۔ اُسے کھلنا چاہیے اور میں یہی کوشش کر بھی رہا تھا۔

کچھ جوان بوڑھے اُس طرف سے گذرے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ ہر طرف سے دیوار گری ہوئی تھی۔ جدھر سے چاہوں نکل جاؤں لیکن میری لڑائی تو دروازے سے تھی۔ میں ان جوان بوڑھوں سے صلح کی بات کیسے کرتا اور کیوں کرتا۔ تھوڑی دیر بعد میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی آیا۔ اُس نے بھی وہی بات بتائی جو اوروں نے بتائی تھی۔ اس کی عمر اور گستاخی دیکھ کر میں نے اس پر ایک ڈھیلا پھینکا جس کا اُس نے قہقہے سے جواب دیا۔ میں آپے سے باہر ہوگیا۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکے سے نپٹنے کے لیے مسجد سے باہر ہو گیا لیکن لڑکا بھاگ گیا اور مَیں پھر مسجد کے اندر دروازے سے جا لگا۔

کہیں کسی طرف سے بات بنتے اور دروازہ کھلتے نہ دیکھ کر میں چپ ہوگیا اور دروازے سے اپنی پیٹھ جما کر کھڑا ہوگیا۔ عام طور سے دروازے سے پیٹھ لگا کر اس لیے کھڑے ہوتے ہیں کہ کوئی شخص باہر سے کواڑ کھول کر اندر آنا چاہے تو نہ آسکے ظاہر ہے میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ مجھے غافل پاکر کوئی دوسرا دروازے کو کھلوانے کی کوشش شروع نہ کردے۔ شاید مجھے کچھ اِس طرح کا اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قید ہونے کی رُسوائی تو مجھے اُٹھانی پڑے اور دروازہ سے نکل جائے کوئی دوسرا۔ کافی دیر بعد فضلو نے دروازہ کھولا اور میں باہر نکلا اور پیدل مکان واپس آگیا اور فضلو کے کہنے پر بھی نہ

تو اُس کی گود میں گیا نہ اُس کی اُنگلی پکڑی۔

میں اپنی ہر بے وقوفی پر مسجد میں قید کیا جاتا۔ سپارہ کبھی نظر نہ آیا۔ اس لیے میں کچھ ایسا سمجھنے لگا تھا کہ مسجد میں بند ہونا اور نہ نکل پانا سپارہ تھا! البتہ مجھے فضلو سے نفرت ہوگئی تھی، اور میں اس پر خدا کا شکر کیا کرتا تاکہ اُس نے میرے لیے مسجد کو سپارہ بنا دیا تھا فضلو کو نہیں! میں اس کی بھی دُعا مانگا کرتا تھا کہ خدا وہ دن لائے جب فضلو کو اپنی پلیٹھ پر بٹھا کر مسجد میں قید کر آؤں!

مجھے مٹّی اور فضلو کو چغلی کھانے کا بڑا شوق تھا۔ میرا یہ شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مجھے اکثر کچھ ایسا بھی خیال ہوا جیسے مَیں نے مٹی نہیں کھائی تھی بلکہ مٹی نے مجھے کھایا تھا۔ ممکن ہے فضلو کے ساتھ چغلی نے بھی یہی سلوک کیا ہو۔ مٹی کھانے میں بڑا مزا آتا تھا یہ مزا فضلو کے چغلی کھانے سے کرکرا ہو جاتا۔ کبھی کبھی مٹی بھی کرکری ہوتی!

مٹی کھانے پر والد صاحب نے ایک دن میرے دونوں کان پکڑ کر مجھے اتنا اُونچا کر دیا جتنا کہ میں اَب ہوں۔ میرے لیے یہ تجربہ بالکل نیا تھا اور تکلیف دہ بھی خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ مٹی منہ میں ہو اور زبان باہر اور مٹی کی یہ دنیا کچھ ایسی معلوم ہو رہی ہو جیسے مٹی کھانے پر اِسے بھی کسی نے کان پکڑ کر اُٹھا لیا ہو! والدہ نے دوڑ کر مجھے زمین پر آنے سے پہلے ہی گود میں سنبھال لیا۔ میں نے اُس وقت خیال کیا کہ جب اپنا کان دوسرے کے ہاتھ ہو اور پاؤں ہوا میں، تو ماں کی گود سب سے اچھی چیز ہے۔ اس واقعہ سے مجھے... فضلو سے سخت نفرت ہوگئی۔

اَب میں نے فضلو سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ میں جانتا تھا کہ کتنا ہی چھپ کر کوئی بات کیوں نہ کروں، فضلو کو ضرور خبر ہو جائے گی۔ عجب طرح کی فکر تھی، فضلو کا ڈر، بدلہ لینے کی دُھن، مٹی کھانے کی چاٹ، یہ تین بلائیں ایک طرف اور دوسری طرف ایک میں بے وقوف! میں سوچتا رہا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اور آئی بھی تو یہ کہ یہ تین بلائیں پہلے سے تھیں سوچنے کی یہ چوتھی بلا کہاں سے آ پہنچی۔ میں نے مٹی کھالی یہ بلا ضرور تھی لیکن مزے دار بھی تھی۔

ا؎ شیخ نیازی، ۹۴

مٹی کھالینے کے بعد ڈر پیدا ہوا - ڈر سے بزدلی اور بزدلی سے ... فضلو سو رہا تھا -
پگڑی سرہانے رکھی تھی میں نے چپکے سے جاکر اُس کی پگڑی سے اپنا منہ صاف کیا - مٹی کے
دھبے دیکھ کر جی خوش ہو گیا کہ فضلو سے بدلا لے لیا - کچھ دیر ٹھہر کر دل ہی دل میں خوش ہوا لیکن
جلد ہی کچھ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ دھبے عجیب عجیب طرح سے مُنہ بنا کر فضلو سے میری
شکایت کر رہے ہوں میں وہاں سے بھاگا - گھر میں سب سو رہے تھے - ماں کی چارپائی پر
لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن فضلو کی پگڑی کے دھبے ناچتے کھاتے تھرکتے قلابازیاں کھاتے
آنکھ بند کیے پر بھی دکھائی دینے لگے - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نہ تو وُہ مجھے سونے دیں گے نہ
بھاگنے دیں گے - میں اُن کی شاید زیادہ پروا نہ کرتا لیکن تھوڑی دیر میں کچھ ایسا معلوم ہونے لگا
جیسے یہ داغ دھبے رہ رہ کر فضلو کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور فضلو کے ہوتے فضلو سے
زیادہ خراب اور ڈراؤنی !

گھبرا کر میں نے اپنے ہاتھ پاؤں چہرہ سب کو سمیٹ کر ماں کے پیٹ اور سینے سے
لگا لیا اور سو گیا - ڈر اور تکلیف میں ماں سے چمٹ کر سو جانا بھی کیسی نعمت ہے - ماں کا سہارا
نصیب ہو تو دنیا کے تمام فضلوؤں اور اُن کی پگڑی کے داغ دھبّوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے

سو کر اُٹھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ فضلو کی پگڑی کے داغ دھبّے کا واقعہ میرے جاگنے میں ہوا
تھا یا سونے میں لیکن مجھ سے رہا نہ گیا - میں نے ماں سے کہا کہ اماں فضلو کو گھر سے نکال دیجیے
اُنھوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا بات یہ ہے کہ فضلو مٹی کھاتا ہے اور پگڑی سے منہ پونچھتا
ہے - مٹی کھانے سے اُس کا مُنہ میلا اور بدبودار ہو گیا ہے - دیکھیے میرا منہ کتنا صاف
ہے - میں نے یہ فقرہ بے وقوفی سے کہہ دیا تھا اور کہا ہی نہیں بلکہ منہ بھی کھول دیا اور بے سوچے
سمجھے منہ کھولنا بے وقوفی ہے - ماں نے دیکھا کہ مٹی کھانے سے زبان ، دانت ، ہونٹ
سارے میلے ہو رہے ہیں -

اِتنے میں فضلو نے دروازہ پر سے آواز دی ، بی بی دیکھیے پگڑی کا ستیاناس ہو گیا -
اس کے بعد جو کچھ ہوا وُہ کوئی نئی بات نہ تھی - میں تھا ، فضلو کی بیٹھ اور مسجد کا سفر ساتھ میں
ناچنے تھرکتے وُہ داغ دھبّے تھے جن کی شکل اَب فضلو ہی کی نہ تھی بلکہ اُس غیر آباد مسجد کی

بھی تھی جس میں دروازہ تھا۔ دیواریں نہ تھیں!

میں نے (شاید) کہیں نہیں کہا کہ یہ واقعات پیش آئے میں نے (غالباً) صرف امکانِ وقوع کا اشارہ کیا ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت یوں سمجھتا ہوں کہ بعض بد مذاق یا ستم ظریف یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ یا تو لکھنے والے پر گزرا ہوتا ہے یا پڑھنے اور سننے والے پر صادق آتا ہے!

لہ مضامین رشید، ۹۰

۴

"کہتے ہیں کہ پھول کی خوشبو سے جوانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے
کنیر اور گیندے کے علاوہ ایسے پھول ہیں جن کی خوشبو سے
مجھے اپنی ہی نہیں دوشیزوں کی جوانی بھی یاد آ جاتی ہے، لیکن
کنیر اور گیندے کی بو مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس سے مجھے
اپنا بچپن یاد آتا ہے! —"

o

جیسا کہ[1] (پچھلے) زمانے کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور تھا، مَیں نے بھی قاعدہ بغدادی کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اُس عہد سے بھی پرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اِس طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے مضحکہ خیز اُردو میں پڑھائیں۔ اِسی دوران میں ایک اور مولوی صاحب سے چند رسالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اِس طرح کا بن گیا تھا کہ جس طرح کے مولوی صاحب ہوں اُسی طرح کی پڑھائی ہو یعنی مولوی صاحب صرف قرآن شریف پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں اور فارسی پڑھا سکتے ہوں تو فارسی۔ عربی جانتے ہوں تو وہی سہی! مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب کی پرورش ہو، گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور محلہ والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو!

اِن مضامین میں اور اس طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو، پہاڑے حساب وغیرہ سیکھنے کے لیے دیہات کے پرائمری (Primary) سے بھی پرائمری اسکول میں جانا پڑتا تھا جس پر پرائمری سے زیادہ پرمٹو (Primitive) ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس بات پر اکثر ہنسی آئی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لیے وجہ معاش قرار پائی یعنی اُردو، وہ مَیں نے اسکول میں سیکھی ایسے ماسٹر صاحب سے جو اُردو میں غالباً صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۳۴

اور جو اتنے ہی کٹّر برہمن تھے، جتنے شریف النفس اور درد مند انسان! کوئی کلاس سامنے ہو وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن۔ لوٹا ڈوری گھر سے ساتھ لاتے۔ راستے میں کسی متبرک کنویں سے پانی بھر لیتے اور صبح اسکول پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی کرسی کو غسل دے دیتے۔ پانی نتھر جاتا تو کرسی پر اُکڑوں بیٹھ جاتے اور اس کی احتیاط رکھتے کہ پاؤں کے تلووں کے سوا جسم کا کوئی اور حصّہ کرسی کو نہ چھُو جائے۔ مضبوط، کھُردری رسّی سے مرصّع و مستحکم کم و بیش چھے انچ اونچی کھڑاؤں پہنتے تھے۔ اِسی کھڑاؤں پر وہ چار پانچ میل کا روزانہ سفر کر کے اپنے گاؤں سے اسکول آتے جاتے تھے۔ اسکول پہنچنے پر دس پندرہ منٹ تک اُن سانپ، بچھو اور مینڈکیوں اور کبھی کبھی ایک آدھ خرگوش کی اچانک رحلت پر تعزیت کے ریزولیوشن پاس کرتے جو ہر روز کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر اُن کے کھڑاؤں ٹرک (TRUCK) کے تلے آکر آنجہانی ہو جاتے! وُہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ لطف نہ رکھتے تھے اس لیے کہ میں نے اُن کو کسی طالب علم کے قلم، پنسل، کاپی، تختی کو چھُوتے نہ دیکھا۔ اُن پر جو کچھ لکھا یا بنا ہوتا، دُور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے۔ نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سُنتے۔ صرف رامائن سُناتے۔ نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے نہ کسی شخص یا شئے کو ہاتھ لگاتے۔ دُور سے ترس کھاتے، مُسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے۔!

اَچھے معلّم کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اُس کا علم متعدی ہو یعنی طالب علم کو اُڑ کر لگے اور ایسا معلّم ناکارہ قرار دیا گیا ہے جس کا علم اُسی تک محدود رہے۔ معلوم نہیں ماسٹر صاحب اِس نکتے سے واقف تھے یا نہیں لیکن اُن کا عقیدہ کچھ اِس طرح کا ضرور تھا کہ چھوت چھات کے اُصول پر پڑھے لکھے طالب علم کا عِلم اُس کے ساتھیوں کو جا لگے گا۔ اِس لیے وُہ خود پڑھانے لکھانے کا دھندا نہ کرتے۔ معلوم نہیں وُہ ایسا کر بھی سکتے تھے یا نہیں اور یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ خود ماسٹر صاحب کلاس میں اس طرح کی علمی یا تعلیمی چھوت چھات سے بہرہ مند ہوئے یا نہیں بہرحال کلاس میں ہوتا یہی رہا کہ پڑھے لکھے طالب علم اَن پڑھ ساتھیوں کو اسکول کا کام بڑی خوش اسلوبی سے کرا دیتے تھے۔ اسکول[1] کے ہیڈ ماسٹر صاحب

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۳۸

چھ فٹ سے اونچے قد کے بڑے کڑوے، اکڑیل ٹھاکر تھے۔ پڑھانے لکھانے سے اُن کو بھی دلچسپی نہ تھی۔ زیادہ وقت لکڑی پھاڑتے اور رسوئی بناتے رہتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رسوئی سے باہر نکل آتے۔ سانس پھولا، چہرہ تمتمایا، آنکھیں انگار سی دہکتی ہوئی..... وسط اسکول میں پہنچ کر نعرہ لگاتے: مہاراج پاٹھ پرساد بند لکھائی پڑھائی کرو۔" ہیڈ ماسٹر صاحب کی گرج سن کر... سارا اسکول یک زبان ہو کر جو دل میں آتا چیخ چیخ کر پڑھنے لگتا جس میں ماسٹر صاحب کی آواز سب سے اونچی ہوتی اور پہچانی جاتی اس لیے کہ ساری بامعنی آوازوں میں وہی ایک آواز بے معنی ہوتی!

اُس[1] زمانے میں تقریباً تمام پوربی اضلاع میں سال کے زیادہ حصّے طاعون پھیلا رہتا۔ اِن مواقع پر ہمارا اسکول پاس ہی کے ایک مندر میں منتقل ہو جاتا.... ہم دو ہی تین لڑکے مسلمان تھے۔ جو مورتیاں (مندر کے) برآمدے اور صحن میں تھیں اُن کو چھونے کی ہم کو اجازت تھی ہم سب یعنی ہندو مسلمان دونوں اس پر خوش تھے کہ مورتیوں کو چھونے کا منصب ہم کو حاصل تھا۔ ماسٹر صاحب کو نہ چھو سکتے نہ سہی۔ ماسٹر صاحب تو ہمارے ہی جیسے گھر یلو قسم کے لوگوں میں تھے۔ اُن کو تو نہ چھونا ہی افضل تھا۔ چھُونے سے معلوم نہیں ہم پر کیا مُصیبت نازل ہو یا ماسٹر صاحب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔

ہر[2] لڑکا مندر ہی کے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔ مندر سے مُتصل گیندے اور کنیر کے پھولوں کا بڑا قطعہ تھا۔ پھول توڑنے اور چڑھانے میں دوسرے بچوں کی طرح مجھے بھی کسی قدر دلچسپی تھی۔ ان پھولوں کی بو عام طور پر لوگ پسند نہیں کرتے، مجھے پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ پھول کی خوشبو سے جوانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کنیر اور گیندے کے علاوہ ایسے پھول ہیں جن کی خوشبو سے مجھے اپنی ہی نہیں دوسروں کی جوانی بھی یاد آ جاتی ہے لیکن کنیر اور گیندے کی بُو مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس سے مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ جوانی کی "ملوث" یاد سے طفلی کی "معصوم" یاد میرے نزدیک زیادہ قابلِ قدر ہے ----

ماسٹر صاحب رامائن بڑے والہانہ انداز سے پڑھتے اور اس کا مطلب اتنی ہی نرمی

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۳۹   [2] آشفتہ بیانی میری، ۴۰

اور محبت سے اپنی زبان میں جو ٹھیٹھ پوربی سے بھی زیادہ ٹھیٹھ کوئی چیز ہوتی سمجھاتے[1] خاص طور پر رامائن کی پوری داستان مجھے یاد ہو گئی جس کی وجہ سے دسہرے کی تقریب کا بڑے شوق سے انتظار کیا کرتا تھا۔ رامائن کا قصہ شوالے کی فضا اور اس کی ایک خاص مہک، کنیر اور گیندے کے پیلے پھول، بچوں کا ہر مذہب یا پڑھائی لکھائی سے بے نیاز و بے خبر ہو کر محض دلچسپ مصروفیت کا دل دادہ ہونا میرے رگ د پلے میں پیوست ہو گیا۔ جس کا تصرف اَب تک محسوس کرتا ہوں۔ داستان طویل اور مزیدار ہے بچپن کی دستان کس کی اس طرح کی نہیں ہوتی۔ دیہات اور شوالے کی فضا میں جو ابتدائی تعلیم میسر آئی اُس نے ذہن و دل کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ طنز و ظرافت، باوجود مُدۃ العمر کے اَدبی مشغلہ ہونے آج تک اِس کا اِتفاق نہ ہوا کہ طنز و ظرافت کا کوئی فقرہ ہند و مُعتقدات کے بارے میں زبان یا قلم سے نکل جائے۔ علی گڑھ آیا تو اس پر مزید مہر لگ گئی اور شاید یہ دونوں کا تصرف تھا کہ حتی الوسع مَیں نے کسی مذہب پر نہ تو کبھی نکتہ چینی کی نہ اس کا مذاق اڑایا۔

دیہات، مندر اور مکتب کی تعلیم کے علاوہ انگریزی اسکول میں داخلہ لینے سے قبل جن مواقع، مقامات اور مردانِ کار آگاہ سے میرا سابقہ رہا شاید ہی کسی اور کا رہا ہو۔ بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی۔ چنانچہ والدین کو جہاں کسی "تیر بہدف" قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بوڑھیا، مُلّا یا مزار کی خبر ملی، مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کر دی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہو گی، جتنی مَیں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے انار کے درختوں میں (کم ہی کسی) کے لیے اتنے نقوشِ سُلیمانی ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لیے!

انٹرینس[2] (Entrance) مَیں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور سے کیا۔ اُس عہد کے اُس بورڈنگ ہاؤس کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔ خاص طور پر جون پور کے اُس بورڈنگ ہاؤس کی جہاں نہ خاص قسم کی کوئی نگرانی کی جاتی تھی نہ قواعد و ضوابط کی ایسی

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۹

[2] آشفتہ بیانی میری، ۲۰

کچھ پابندی تھی۔ عموماً ہر سینیئر لڑکا، جونیئر لڑکے کا نگراں ہوتا۔ یہ بڑی کڑی نگرانی تھی جس سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لڑکے کے نگراں خواہ وُہ جونیئر ہو یا سینیئر کسی لڑکے کے دُور یا قریب کے وُہ رشتے دار ہوتے جن میں سے اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر آئے ہوتے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوتے۔ یہ ناممکن تھا کہ طالب علم اُن کا کہنا نہ مانے یا اُن کی موجودگی میں اُس سے کسی قسم کی لاپرواہی یا بے راہ روی سرزد ہو جائے۔

یہ لوگ قدیم تہذیب اور وضع داری کا نمونہ ہوتے اور اسلاف کے حالات اس شفقت اور اس دلچسپ انداز سے سُناتے اور اخلاق و تہذیب کے حدود میں رہنے کی نصیحت اِس پیرائے میں کرتے کہ لڑکوں پر بڑا اچھا اور گہرا اثر پڑتا۔ اسکول یا بورڈنگ ہاؤس کے حکام ان رشتہ داروں سے تعرّض کرنا درکنار، ان کا خیر مقدم کرتے اس لیے کہ وُہ جانتے تھے کہ طلبہ پر ان رشتہ داروں کا اثر سرکاری نگرانی سے کہیں زیادہ بہتر پڑتا ہے۔

جون پور تاریخی شہر ہے وہاں شاہانِ مشرقی کے آثار اَب تک موجود ہیں... دریائے گومتی وسط شہر سے گزرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پُل ہے۔ برسات میں بالضرور طغیانی آتی ہے۔ یہ زمانہ شہر میں تردّد اور تفریح دونوں کا ہوتا ہے۔ شہر سے متصل دریا کے کنارے شاہانِ مشرقی کا ویران قلعہ ہے۔ کتنا اونچا، مستحکم اور شاندار۔ اُپل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے جس کی دیوار کے ایک رُخ پر دریا کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کرنے کے لیے نمبر لگا دیے گئے ہیں۔ اِس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف اِتنا کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لیے جمع ہوتے، شعر و ادب پہ باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر، قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کبھی دُور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لیے گُم ہو جاتے!

جن لوگوں نے جون پور کا قلعہ اور مسجدیں نہیں دیکھی ہیں وُہ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ یہ کتنی ٹھوس، کوہ پیکر اور پُر شکوہ عمارتیں ہیں۔ دہلی اور آگرے کی مغلیہ عہد کی عمارتوں میں حُسن، نفاست، نزاکت اور پُرکاری زیادہ ہے اور ان باتوں میں ان کا جواب دُور دُور نہیں، لیکن جو سطوت و جلال، جون پور کی مسجدوں اور آثارِ قدیمہ میں نظر آتا ہے وُہ بھی اپنی

جگہ پر مسلّم ہے یہ شان مجھے لاہور کی شاہی مسجد میں بھی نظر آئی ۔ ان مسجدوں کے اندرونی صدر دروازے کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی جیسے یہ ہم کو پیس ڈالیں گی یا نگل جائیں گی ۔ یہاں نماز پڑھنے میں خاص طرح کا انشراح و افتخار محسوس ہوتا ہے جیسے ہم واقعی خدائے برتر و توانا کے سامنے حاضر ہوں ۔

جون پور کی یہ پرانی شاہی عمارتیں اِس درجہ پاس پاس واقع ہیں کہ تقریباً ہر روز ان کے دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا تھا ۔ کبھی دن میں کئی بار جیسے اُن کا دیکھنا زندگی کے روزمرّہ کے معمولات میں داخل ہو گیا ہو۔ اس زمانے میں جون پور میں ایسے کھنڈر اور ایسے خاندان بھی کثرت سے موجود تھے جو اِس شہر کی گزشتہ عظمت اور فضیلت کی بے اختیار و بار بار یاد دلاتے رہتے تھے ۔

اَب سوچتا ہوں اُس زمانے کا جون پور علم و فضل اور شاعری و شرافت کی قدیم روایات کے اعتبار سے کتنا قابلِ قدر خطہ تھا ۔ بیشتر مسلمان گھرانے ایسے تھے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے ۔ رؤسا، علما اور فضلا کے علاوہ عوام کا طبقہ تھا جس کے افراد پہلوانی کرتے تھے ۔ پنجہ لڑاتے تھے ۔ نیچہ باندھتے تھے ، عَلَم اُٹھاتے تھے ، طبل بجاتے، سوزخوانی اور ماتم کرتے ، فیرینی کباب بیچتے تھے ۔ بٹیر لڑاتے اور کبوتر اُڑاتے تھے ۔ بہ ایں ہمہ سوسائٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ کرتے کچھ ہوں بیٹھتے سب برابر تھے نجابت اور شرافت کا اس زمانہ میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا ۔[۱]

ہر خاندان میں خواہ وُہ کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو ۔ کوئی نہ کوئی شاعر ، مرثیہ خواں، خوش نویس ، پتنگ باز ، داستان گو ہوتا ۔ بزرگوں کے زمانے کی ایک بیاض ہوتی جس پر خاندان ہی کے کسی اگلے پچھلے سربرآوردہ شاعر کا کلام محفوظ ہوتا ، جسے صاحبِ خانہ گھر پر مجلس منعقد کر کے بڑے فخر سے اور فن کے جملہ آداب ملحوظ رکھ کر سُناتا ۔ ہن کلام کو نسلاً بعد نسل گھر ہی کا کوئی کاتب بیاض پر خوش خط نقل کرتا۔ اس بیاض میں جہاں تہاں کچھ مجرب دوائیں اور دعائیں ، افرادِ خاندان کی شادی ، ولادت ، وفات وغیرہ کی تاریخیں ، مہاجن کے قرض اور

۱۔ آشفتہ بیانی میری ، ۲۳

سود سے متعلق یاد داشت بھی درج ہوتی!

میری طالب علمی کے زمانے میں سربرآوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر اُن ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر اُن کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ چھوٹوں سے شفقت اور عزت سے پیش آنے کا جو انداز مَیں نے اُس زمانے کے بزرگوں میں پایا اب وُہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعرا کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اِس خوبی سے سُناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ اُن کا اندازِ شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اِتنی مکمل اور دلنشیں ہوتی کہ آج اچھے اچھے فن کاروں اور مُعلّموں میں نہیں نظر آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔

طالبؔ علمی کے زمانے میں میرا دل پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جا سکتا تھا، اُس کتب خانہ میں جو دوسری منزل پر تھا کھڑکی سے متصل آرام کُرسی پر دراز ہو کر اُردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مُطالعہ تھا۔ کھڑکی سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ شکستہ[۲] تاریخی عمارات، آثارِ قدیمہ اور کھنڈر دیکھ کر میں بہت متأثر ہوتا ہوں، جیسے اُن کے آگے جُھکنے اور گلے لگانے کو دل چاہتا ہو۔ ذہن اُن کی گزشتہ شان و شوکت اور عروج و زوال کے طرح طرح کے نقشے بنانا اور بُننا شروع کرتا ہے پھر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وُہ اپنی ویران اور سنسان اوقات گزاری میں میری موجودگی اور غمخواری سے تسکین پاتے ہوں!

اُس عمر، زمانے اور ماحول و معاشرت میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لُطف آیا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا، جیسے اِن افسانوں اور ناولوں کا مَیں ہی مُصنف تھا، مَیں ہی ماحول اور مَیں ہی ہیرو! لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پُل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پُل کے اُوپر چلتی ہوئی مخلوق اور

۱: آشفتہ بیانی میری، ۴۶ ۲: آشفتہ بیانی میری

فضا کا نمناک رُست خیز رُک جائے گا! اِن کتابوں اور مُصنّفین کے نام گِنانے سے کچھ حاصل نہیں اور خطرے سے بھی خالی نہیں، اِس لیے کہ اندیشہ ہے کہیں ایسی کتابوں کے نام نہ لینے لگوں جو مَیں نے نہیں، دوسروں نے پڑھی ہوں!

مجھے ہر طرح کی چیز پڑھنے میں لُطف آتا تھا البتہ یہاں ایک بات کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وُہ اس لیے کہ اُس پر آج بھی مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا آج سے چالیس سینتالیس سال پہلے تھا۔ وُہ یہ کہ اُس زمانے میں بھی جب مجھے اُردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی مَیں زبان و اَدب کے اعتبار سے انگریزی کو اُردو سے اُونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ اَیسا محسوس کرتا جیسے مُصنّف جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے اور میرا بھی خواہ ہے اُردو کتابوں کی عبارت کا اثر یہ ہوتا تھا جیسے مُصنّف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہو کوئی مجھے فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈمڈ ہو کر ذہن میں آتیں ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی رہا ہو کہ ذہنوں پر انگریز، انگریزی حکومت اور انگریزی زبان کی گرفت عام تھی۔ غرض یہ تعبیر صحیح رہی ہو یا غلط مجھے انگریزی کے مُطالعے سے فائدہ پہنچا۔ انگریزوں سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا لیکن انگریزی زبان واَدب سے اَب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔ علوم و فنون کے بے پایاں ذخائر سے قطع نظر جو انگریزی میں ملتے ہیں اور اُردو میں برائے نام سے بھی کم ہیں، ابھی اُردو کو انگریزی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لُطف کا گذرا۔ اچھے ساتھی اُن سے اَچھے اُستاد اور سب سے اَچھے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، پھر دوستوں کے ماں باپ بھائی بہن! سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے اِن سب کی محبّت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی! اور دوسروں کی عزت اور خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں اَدنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ البتہ ریاضی اور اس کی ذرّیات "الجبرا، اقلیدس اور مساحت" ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہو سکی۔ اِن سبھوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا

لے آشفتہ بیانی میری، ۱۹

رُسوا کیا کہ ع

انگلیاں دُور سے اٹھتی تھیں کہ وُہ آتے ہیں!

ہم تین چار دوست ایک ہی بنچ پر ہر درجے میں سالہا سال بیٹھتے آئے ــــ ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیے جاتے جب بھی پاس مارکس تک رسائی نہ ہوتی! امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا! اس لیے ترقی دے دی جاتی۔ ہم کو اس کی سخت کوفت تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صدی تک ہماری باتیں کتابی باتوں کے مقابلے میں مان لی جاتی تھیں۔ ریاضیات میں آخر کیا سُرخاب کا پر لگا تھا کہ ایک شوشہ، ایک صفر تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا!

جنگ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں پندرھویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جُلوس گزرتا۔ ستھرا، شریفانہ اور پُر وقار جلوس .... معلوم نہیں ترانہ کون پڑھتا، ساتھ سبھی دیتے۔ پڑھنے کا انداز اتنا مؤثر اور پُر وقار ہوتا کہ رگ و پے میں بجلیاں کوندتی معلوم ہوتیں۔ ہندو مسلمان، مرد عورت، بوڑھے بچے سب غور و احترام سے سُنتے۔ تھوڑی دیر کے لیے کاروبار کا ہمہمہ تھم جاتا۔ اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ گو یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم ع

خُدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا

ایک صاحب نے بڑے پُر اثر لہجے و انداز سے سُنائی تھی۔ محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ بھی ہو گئے تھے اور "رہے نام اللہ کا" کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی سے برہم ہو گئی۔

جس عہد کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس میں معمولی درجے کا بھی کوئی مسلمان گھرانا ایسا نہ تھا جہاں سو پچاس کتابیں یا رسائل، قصّے کہانیاں، شعر و شاعری، مسئلے مسائل مذہب و تصوّف، اَوراد و وظائف کی موجود نہ ہوں اور گھر کے چھوٹے بڑے کی نظروں سے نہ

لہ آشفتہ بیانی میری، ۳۰

گزرتی ہوں - میری ایک یہ عادت ہے کہ اُردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو، مَیں اُسے اُٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا - اِس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے اِس لیے کہ مَیں اُردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جُملہ جُملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں، اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو بلکہ تصویر دیکھی جا رہی ہو!

اِن متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی، دل چسپ یا کوئی بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے - جس طرح کَس مُپرس، فاقہ کش اور فلاکت زدہ بچے عورتیں اور بوڑھے کوڑے کرکٹ کی ڈھیریاں چھانتے پھرتے ہیں اور اپنے کام کی کوئی نہ کوئی چیز اس میں سے نکال لیتے ہیں فرق صرف اِتنا ہے کہ وُہ ضروریات کی بنا پر ایسا کرتے ہیں مَیں عادتاً یا تفریحاً - اُردو میں لکھنے کے اتنے انداز، اتنے فقرے، ترکیبیں، لب و لہجے اور پَینترے ہیں کہ کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں محظوظ یا مُنغّض ہونا لازمی ہے - مَوضوع سیاست، قومیت، انقلاب اَمراض، ادویات، عورت یا عقبیٰ جو کچھ ہو - کوئی نہ کوئی فقرہ گفتنی یا ناگفتنی ضرور مل جائے گا! اِس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اُردو میں ہر طرح کی شاعری کا کاروبار مدّت الایّام سے بڑی کثرت سے رہا ہے - وُہ بھی گرم ملک کی شاعری کا، اِس لیے اُردو لکھتے وقت اعصاب کا تناؤ یا خون کا دباؤ اکثر اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے اور لکھنے والا بھلا چنگا بہکنے لگتا ہے -

اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا ایسی نثر جو اُس زمانے کے معمولی اَخبارات اور رسائل میں جگہ پا جاتی تھی - یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں - اُن کی شخصیت، قابلیت اور اُسلوبِ تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے - تعجب ہے شاہ صاحب کا نام اُردو کے ممتاز لکھنے والوں میں کیوں نہیں لیا جاتا - شاہ صاحب بڑے شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ---------
خوبرو، خوش گفتار، نیچی نگاہ رکھتے گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں مسحور کُن انداز سے کُھلنے بند ہونے لگتیں، جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو - بڑی سُتھری اور شائستہ زبان میں

ترشے ہوئے فقرے، جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب و لہجہ کی تھوڑی سی سنجیدگی سو مل کر ادا ہونے لگتے، جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل و ترنم میں فرق آجاتا ہو!

مدّتوں بعد جب میں اسکول چھوڑ کر کالج آگیا تھا نظم و نثر کے حسن و قبح کو پہچاننے کی شُدبُد ہو گئی تھی، شاہ صاحب کی نثر کو میں اتنی ہی دل آویز، پُر مغز اور فکر انگیز پاتا جتنا کسی دوسرے سر برآوردہ نثر نگار کی نثر کو۔۔۔۔ میں نے کبھی رفتار، گفتار، کردار میں اُن کو بے جھجک نہ پایا۔ اکثر سوچ میں رہتے لیکن مخاطب کیجئے تو فی الفور متبسّم ہو کر متوجّہ ہو جاتے اور پھر کوئی نہ کہہ سکتا کہ اس سے پہلے استغراق میں تھے۔ آج ان سطور کو لکھتے وقت مرحوم بے اختیار یاد آگئے۔ جیسے وُہ پاس آکر گفتگو کرنے لگے ہوں۔ وہی انداز وہی باتیں اور وہی ماحول!

۵

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اَور رہنے کو کچّی بارک (گل منزل) میں جگہ ملی ..... ادب، زندگی اَور تنقید اور آرٹ کے کیسے کیسے فرعون اَور مُوسیٰ اُس وقت یہاں موجود تھے. اُن کا فرسٹ ایر کے ایک شکستہ حال طالب علم کی ہمت اَفزائی کرنا کتنا عجیب واقعہ تھا!

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالت دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اُس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھار ڈبل روٹی بھی کھالیتا لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔ (اکبر کا مشہور مصرع ہے ع کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر خوشی سے پھول جا!) جب کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں تو کلرکی پر چلا جاتا تھا اور چھٹیاں ختم ہوتیں تو کالج چلا جاتا۔ اِس طور پر پانچ سال گزرے۔ مجھے دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کر کے بہت سے مقامات اور عجیب و غریب انسانی کاروبار کے عجیب و غریب تجربات حاصل ہوئے جو بجائے خود ایک مستقل داستان ہے۔ ایک بار دو مہینے کے اندر اندر ایک طرف سرمیکڈانالڈ کریڈک گورنر برما سے گورنمنٹ ہاؤس میں علی گڑھ کے حالات و حوادث بالخصوص علی برادران کی حمایت میں تیز و تند گفتگو کی، دوسری طرف بنارس کی عدالتِ دیوانی میں فرش پر بیٹھ کر شام تک مسلسل (مسل) نقل کی ہے اور ہیڈ کلرک اور منصرم کی جھڑکیاں اور چپراسیوں کی بے اعتنائیاں اُٹھائی ہیں۔ تیسری طرف علی گڑھ میں اکڑ ٹینس کے معرکتہ الآرا میچ اور معرکتہ الآرا ترین یونین کے الیکشن جیتے ہیں۔ کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا۔ کیا دیکھا، کیا گذری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا، بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی لیکن اسے چھیڑے کون! اس لیے کہ پھر اس کا سمیٹنا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔ تمام زندگی میں یہی ایک موقع

۱؎ آشفتہ بیانی میری، ۶۷ ۲؎ سہیل کی سرگزشت، ۱۲ ۳؎ آشفتہ بیانی میری، ۶۷

ایسا آیا تھا جب مَیں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے اُدھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا گو مجھے اِس کا اعتراف ہے کہ میری عقل بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ محوِ تماشائے لبِ بام ہونے میں بھی اُس کو کافی خطرہ نظر آتا تھا۔ بہر حال پھر میں نے تمام عُمر نہ کبھی عشق کو مُنہ لگایا نہ آتشِ نمرود کے مُنہ لگا!

مَیں بڑے تردّد اور ناکسی کے عالم میں بریلی لائن سے دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا تھا۔ کالج کے ہم سفر طلبا نے حال پوچھے بغیر صرف میری ہیئت وحالت دیکھ کر میری دل داری نہ کی ہوتی اور اپنے ساتھ لاکر اپنا ناشتہ کھلا کر اپنے کمرے میں اپنی چارپائی اور بستر پر جگہ دے کر خود کہیں اور جاکر ساتھیوں کے جمگھٹے میں تمام رات ہو، حق میں بسر نہ کر دی ہوتی تو میں شہر جاکر معلوم نہیں کہاں قیام کرتا اور میرا کیا انجام ہوتا۔ ایک درماندہ اجنبی طالب علم کے ساتھ علی گڑھ کے ہم سفر طالب علموں کی یہ بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج (۶۰ سال بعد) بھی میرے دل کو اِس طرح شاداب اور شادمان کرتی ہے جیسے کل کا واقعہ ہو!

۱۹۱۵ء[1] میں (علی گڑھ) کالج آیا۔ قدم قدم پر انورِ بے اور سُلطان محمّد خامس اور بات بات پر سلام علیکم۔ پکی بارک کے ایک کمرے میں ٹول صاحب داخلہ کرتے تھے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ باہر دروازے پر ماگھ میلا۔ آٹھ بجے دن سے کھڑے کھڑے دن کے دو بج گئے شکل سے یوں ہی اُردو مڈل فیل معلوم ہوتا تھا۔ ٹول صاحب کی گول گول آنکھ اور نصف بُریدہ اُنگلی دیکھ کر کلکڑ صاحب یاد آگئے۔ فرمایا "کہاں سے آرہے ہو۔" بولا۔ کچّی بارک سے! ٹول صاحب مُسکرائے۔ وُہ مُسکراہٹ جس سے آج تک کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ آفت آنے والی تھی یا رحمت۔ ایک ہی فارم داخلہ تھا۔ اُس پر سب کچھ لکھ دیا گیا۔ وہاں سے بابو رفیع اللہ خاں صاحب کے پاس پہنچا۔ اُن کو دیکھ کر خیال آیا کہ کوئی مُحدّث دہلوی ہیں یا پنشنر تحصیل دار۔ آنکھ اور عینک کے درمیان تقریباً چھ انگل کا فاصلہ۔۔۔۔ اُوپر سے نیچے، نیچے سے اُوپر کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ اِس کے بعد پان کی پیک کو

---

[1] مضامین رشید، ۹۴

منھ میں نو لتے ہوئے گرج کر بولے، لہجے سے معلوم ہوتا تھا عراق، عرب میں افواجِ برطانیہ کے ساتھ عرصے تک رہ چکے ہیں: تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔ کہاں کے رہنے والے ہو، امرتیاں لائے ہو — اب مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور گورنمنٹ کے ملازم رہ چکے ہیں۔ غرض گلو خلاصی ہوئی۔ کچّی بارک آیا۔ نورٌ علیٰ نور سے

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے

زمین جس کی چہارم آسماں ہے

کچّی بارک (گل منزل) پہنچ کر متشابہہ لگنے لگتا ہے کیوں کہ یہ وُہ مقام ہے جس سے متعلق مضامین اور کتابیں نہیں، کُتب خانے مُرتّب کیے جا سکتے ہیں لیکن یہاں (میں) صرف "پاسبانوں" کا تذکرہ کرنا (چاہتا ہوں) اُس زمانے میں کھانے پینے، اُٹھنے، پہلنے اور رہنے۔ نماز روزہ، کھیل کود، ہنسی مذاق سبھی پر پاسبان تھے۔ کہنے کو تو آج بھی کہہ سکتے ہیں کہ نہ آستانوں کی کمی ہے اور نہ پاسبانوں کی لیکن فرق صرف یہ ہے کہ اُس عہد میں احساسِ پاس بانی خود اپنے آپ میں تھا اور اب یہ چیز مناصب اور ماہی مراتب سے وابستہ ہے۔ لیکن دیکھیے میں بھٹکنے لگا ہوں اور یہ میرا قصور نہیں ہے "گل منزل" کا ہے۔ گل منزل کو وہی حیثیت نصیب ہے جو دُنیا کی بعض انتہائی بلندیوں مثلاً ایورسٹ یا کیلاش کی چوٹیوں کو حاصل ہے۔ اِن بلندیوں کی ایک عجیب خاصیت ہے یعنی وہاں اوّل تو مشکل سے کوئی شخص سوچ سکتا ہے اور اگر سوچ لیتا ہے تو عمل پیرا اُس کے برعکس ہوتا ہے۔ اِرادہ بلندی کی طرف جانے کا کیجیے تو قدم پستی کی طرف اُٹھتے ہیں ۔۔۔۔ اس لیے گل منزل کا خیال آتے ہی ذہن یا قلم سے کچھ بہکی بہکی باتیں برآمد ہونے لگیں تو ۔۔۔۔ معذور دارید ما!

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچّی بارک (گل منزل) میں جگہ ملی۔ اُس زمانے میں جون میں داخلہ ہو جاتا ۔۔۔۔ موسم کے اعتبار سے جون، جولائی کا مہینہ علی گڑھ میں جس آزمائش کا ہوتا تھا اُس سے کچھ اُسی عہد کے طلبا واقف ہیں، بالخصوص کچّی بارک

لہ آشفتہ بیانی میری، ۶۸

کے طلبا - یہ فطرت اور اربابِ کالج کی ستم ظریفی یا سازش تھی کہ داخلے اُسی زمانے میں ہوتے تھے اور ہر نیا لڑکا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لیے موسم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہو جاتا - ابتدا کے دو تین ہفتے بڑی تکلیف و تذبذب میں گزرے کیسی کیسی مصیبتیں اُس زمانے میں جھیلیں! خیال آتا ہے تو اپنے آپ پر ترس بھی آتا ہے، ہنسی بھی آتی ہے اور فخر بھی ہونا ہے! اگر اس سے پہلے کا ایک سال اس سے بھی زیادہ کوفت و کلفت کا نہ گزرا ہوتا تو شاید علی گڑھ سے جوں کا توں ناکام و نامُراد واپس چلا جاتا!

لکھنے کے میرے جو اسالیب ہیں (طنز و ظرافت وغیرہ) اُن میں علی گڑھ کس طرح اور کس حد تک دخیل ہے یہ سوال جتنا دلچسپ ہے اُتنا ہی اہم اور مشکل بھی ہے -

علی گڑھ ہو یا کوئی اور خطہ محض اپنے نام اور جغرافیہ کی بنا پر قابلِ اعتنا حد تک کسی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ہر ادارے کے قیام کے اسباب اُس کی روایات، اُس کی سرگرمیاں اُس کی فتح و شکست، اس کے چھوٹے بڑے اشخاص، سبھی بحیثیتِ مجموعی اثر انداز ہوتے ہیں -

طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال سے شروع ہوتی - یہی کچی بارک اور ڈائننگ ہال علی گڑھ سے باہر کہیں نصیب ہوئے ہوتے تو کچھ تعجب نہیں طبیعت، یا طنز و ظرافت کی طرف مائل ہی نہ ہوتی اور یا پھر ان کا وہ انداز میسّر نہ آتا جو یہاں آیا - اِس لیے کہ ان کے محرکات ہی سے جن کا بہت کچھ دار و مدار ماحول اور مطالعے پر ہوتا ہے ان کا درجہ متعیّن ہوتا ہے - علی گڑھ اور متعلقہ ادارے جن میں ڈائننگ ہال بھی ہے ایک زندہ قوم کی اُمیدوں اور عزیمتوں کے آئینہ دار ہیں - اِن اداروں میں اگر کوئی خلل راہ پائے گا تو وہ نوجوانوں میں بیزاری یا بد اطواری پیدا کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان کی طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اصلاح کرانے میں مُعین ہوگا - جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے اُسی حد تک اُس کی بڑائی کا درجہ متعیّن ہوتا ہے -

---

لے آشفتہ بیانی میری، ۴۴

لے آشفتہ بیانی میری، ۴۹

طنز[۱] وظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پُرپیچ اور خطرناک آلے ہیں ہنسی دل لگی یا طعن تشنیع کسے نہیں آتی لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیے، کس پر ہنسنا چاہیے، کتنا ہنسنا چاہیے اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح ہنستے ہیں ممکن ہے اِسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو ......

جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے۔ دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمّہ داریوں کا خیال نہیں کرتے جو اِن کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں، اور اِس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اس کا شکار ہیں، صرف محسوس نہیں کرتے۔

طنز کی محرّک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے، ظرافت کی تفریح و تفنّن اِن کا رشتہ نفسِ واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردِّ عمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے اور دوسرے کو دوسری طرح۔ ایک اس سے برہمی یا بیزاری کا اظہار کرے گا دوسرا اِس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو اُبھارے گا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فن کار کا جیسا ردِّعمل ہوا ہے اُس کا اظہار اُس نے کس طرح کیا ہے یعنی فن کار کی شخصیت کس پایہ کی ہے اور فن پر اُس کی گرفت کیسی ہے نادانستہ طور پر یہ بحث اُس منزل پر آگئی جہاں شخصیت اور فن کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فن کو شخصیت سے توانائی اور توثیق ملتی ہے اور فن کی غلامی شخصیت کی ناپختگی کی دلیل ہے فن ٹکنیکل ہوتا ہے اور شخصیت عطیۂ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے!

آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے، وہ شخصیت ہے۔

---

[۱] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۳۴

سبب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں جن پر طنز و ظرافت کا عمل کوشش کیے بغیر کارگر ہو سکتا ہے ۔[1] یہ سستا اور فضول کاروبار ہے ۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے ۔ یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو ۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فن کار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں اور اچھے ادب اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں ۔

مقررہ[2] یونیفارم میں، مقررہ اوقات میں، مقررہ آداب کے ساتھ ڈائننگ ہال جا کر ہر طرح کے ساتھیوں کے ہمراہ سالہا سال کھانا پینا ۔ ہر موضوع پر آزادی کے ساتھ گفتگو کرنا ۔ طبیعت کتنی ہی بدحظ یا افسردہ کیوں نہ ہو، کھانے کی میز پر اچھے لوگوں کے طور طریقے ملحوظ رکھنا، مانیٹروں، منشیوں نوکروں سے طرح طرح کے مواقع پر عہدہ برا ہونا، ایسی باتیں تھیں جو سیرت میں توازن اور شخصیت میں دل آویزی پیدا کرتی تھیں (اور) سیرت[3] کا حسن دنیا کے تمام دوسرے حسن سے افضل ہوتا ہے ۔ یہ بات جتنی سچی اور پکی ہے، افسوس ہے کہ اتنی ہی دیر میں اور کبھی کبھی وقت نکل جانے پر اس کا احساس اور یقین ہوتا ہے !

میں[4] نے کچی بارک پر "گل منزل" کے عنوان سے کئی نمبروں میں اس زمانے کے کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی) میں مضامین لکھے تھے ۔ طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی (کالج کے اس مشہور علمی رسالے کا نام "منتھلی" کے بجائے "میگزین" میری درخواست پر قرار پایا ۔ اردو ہی نہیں انگریزی حصے کی ادارت بھی طالب علمی کے زمانے میں میرے سپرد کی گئی تھی ورنہ اس سے پہلے دونوں سیکشنوں کے علیحدہ علیحدہ ایڈیٹر ممبران اسٹاف سے مقرر ہوتے تھے ۔ میرے بعد طلبہ کی جماعت سے انگریزی اور اردو کے علیحدہ علیحدہ ایڈیٹر اور اسٹاف سے نگران مقرر ہونے لگے

---

[1] ہم نفسان رفتہ، ۱۳۶ [2] آشفتہ بیانی میری، ۹۴!

[3] ہم نفسان رفتہ، ۲۲۲ [4] آشفتہ بیانی میری، ۷۲

یہ قاعدہ آج تک جاری ہے میں نے اردو کے انداز کے انگریزی مضامین بھی BOHEMIAN کے نام سے لکھے تھے۔۔۔۔ لکھنے کا حوصلہ لکھنے کی مشق اور بُرا بھلا لکھنے کی شہرت یہ سب مجھے "علی گڑھ میگزین" کے طفیل نصیب ہوئیں اتنا اور اس طرح کا نفع "میگزین" نے میرے علاوہ شاید ہی کسی اور کو پہنچایا ہو) اسی طرح کے چند مضامین کچھ عرصہ بعد "سیاحتِ برما" کے عنوان سے لکھے جو میگزین میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ اس سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈپوٹیشن کے سلسلے میں کلکتہ، چاٹگانگ، میمیو کے دورے میں پیش آئے۔ جو اصحاب اُس عہد کے علی گڑھ سے واقف نہیں ہیں وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ادب، زندگی اور تنقید اور آرٹ کے کیسے کیسے فرعون اور موسیٰ اس وقت یہاں موجود تھے اُن کا فرسٹ ایئر کے ایک شکستہ حال طالب علم کی ہمت افزائی کرنا کتنا عجیب واقعہ تھا۔ اِس کا مجھے اَب تک تعجب ہے کہ اُس زمانے میں مَیں نے تفریحی انداز کا مضمون کیوں لکھا۔ اِس لیے کہ یہ دَور مجھ پر بڑی سختی کا گزر رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا کیا ہونے والا تھا اور کیا کرنا ہوگا!

اَب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات نے مُجھ سے یہ مضمون لِکھوایا، جس نے مجھے زندگی اور اَدب کے اِس ڈھرّے پر ڈال دیا وہی میری تقدیر بھی جو کچّی بارک کی صورت و معنی میں مجھ پر مُنکشف ہوئی جو میری تحریر اور طور طریقوں میں جب، جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ نہ وُہ مجھ سے جدا ہوتی ہے، نہ میں اُسے جُدا کر سکتا ہوں دراصل میں تمام عمر کچّی بارک ہی رہا اور اَب بھی ہوں!

اُسؔ زمانے (۱۹۱۵ء) میں کالج کی شوکت و شہرت پورے عروج پر تھی کھیل میں، لکھنے پڑھنے میں، یونین کی سرگرمیوں میں، یوریپین وضع قطع، رئیسانہ طور طریقوں اور شریفانہ رکھ رکھاؤ میں، چھوٹے بڑوں کے آپس کے سلوک میں،

لہ آشفتہ بیانی میری، ۶۹

غرض اُس وقت کے معیار سے زندگی کا ہر پہلو بابرکت اور بارونق نظر آتا تھا اور ایک طرح کی آسودگی احترام اور آرزومندی کی فضا چپّے چپّے پر چھائی ہوئی تھی۔

جس کسی نے کچّی بارک (سیّد محمود کورٹ) دیکھا نہ ہو وہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ کچّی بارک کیا چیز تھی! کوئی عمارت تھی، عبادت تھی، علامت یا حادثہ یا یہ سب تھی، ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اُس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیوار و در۔ نہایت درجہ نیچا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور کھسک بھی رہی تھیں۔ جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم و زرّیں دھول اور دُھند میں جھول رہی ہو۔ کانپتی، کوستی، کراہتی، کھانستی!

شام کو موسم کی سختی کم ہوجاتی تو لڑکے غسل کرکے صاف سفید کپڑے پہن کر باہر نکلتے اور ایک دوسرے کو (چاہے وہ کتنے ہی فاصلے پر کیوں نہ ہوتا) پکار کر کوئی تفریحی جُملہ کہتے یا فقرہ کستے، جیسے مُبارک باد دے رہے ہوں کہ موسم کو زیر کرلیا ہے! .... رات گئے دیر تک طرح طرح کی چہل پہل اور دھوم دھام رہتی۔ ایک طرف اس زمانے کے علی گڑھ کا وہ طنطنہ دوسری طرف یہ کچّی بارک! ہر حیثیت اور ہر درجہ کے گھرانوں کے لڑکے ان میں آباد تھے لیکن باوجود طرح طرح کی تکلیف اُٹھانے کے، ایک متنفّس نے بھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچّی بارک میں رہنا صحت، عافیت، حیثیت، شان یا شرافت کے خلاف تھا۔ یہی نہیں بلکہ کتنے اس کی آرزو کرتے کہ کچّی بارک میں جگہ مل جائے!

اُس زمانے کی کچّی بارک کی صبح و شام اور زمین و آسمان کا خیال کرتا ہوں تو تصوّر میں ریگستان کا وہ منظر آجاتا ہے جہاں "خضرِ راہ" میں اقبال نے کہا ہے:

ریگ کے تودے پہ وُہ آہو کا بے پروا خرام

یا

وُہ خضر بے برگ و سامان، وُہ سفر بے سنگ و میل

پھر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مِلّتِ مُصطفوی کا اس جہان میں یہی نقشہ اور یہی نوید ہے! وہی بدویوں کا سا حال جو ریگستان کی ہر طرح کی سختی جھیلیں گے لیکن منزل پر اُتریں گے تو ہر چھوٹی بڑی نعمت کا حق اور ہر چھوٹے بڑے کا حق اُدا کیے بغیر نہ رہیں گے!

۶

"مولانا سہیل اور کچّی بارک دو چیزیں تھیں جن سے میں علی گڑھ میں سب سے پہلے دوچار ہوا — انھیں دونوں کا طفیل تھا کہ ذاکر صاحب سے سابقہ پڑا۔"

○

مولانا سہیلؔ اور کچی بارک دو چیزیں تھیں جن سے . . . میں علی گڑھ میں سب سے پہلے دو چار ہوا ۔ انھیں دونوں کا طفیل تھا کہ ذاکر صاحب سے سابقہ پڑا ۔ میرے لیے یہ بتانا کس قدر دلچسپ اور دشوار ہے کہ میری زندگی کے کتنے نشیب و فراز کتنی کامیابی اور کامرانی اُن سے وابستہ ہے ۔ مولانا سہیل ہی کے ایما، اصرار اور ہمت افزائی سے میں نے موجودہ رنگ میں مضمون لکھنا شروع کیا ۔ یاد ش بخیر کچی بارک (گلِ منزل) اس رنگ میں میرا سب سے پہلا مضمون تھا ۔[1]

مولانا سہیلؔ (اقبال احمد خاں ایم ۔ اے، ایل ایل ۔ بی علیگ) سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی ۔ اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے یونین کے "ایلیکشن لڑاتے" تھے اور معجون کھاتے تھے . . . . جس دن مولانا سے ملا ہوں، مولانا الیکشن میں مبتلا تھے ۔ کچی اور پکی بارکوں میں یوں ہی کیا کم چشمک رہا کرتی تھی، جب سے مولانا کچی بارک میں آگئے تھے فریقین میں مقابلہ و مسابقت کا جذبہ خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا ۔ الیکشن کا زمانہ قریب تھا . . . ہر شخص اسی آشوب میں مبتلا تھا ۔ ایک فریق کے ایجنٹ میرے کمرے میں بھی آگئے ۔ مولانا کو خبر ہوئی تو قاآنی کا ایک شعر گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے ۔ پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں پیک منہ میں

---

[1] مضامین رشید، ۲۷۳ [2] مضامین رشید،

اوڑ اس کے دبیتے شیروانی پر ۔ کمرے میں بیٹھنے کی چیز کہاں ۔ بکس پر فریق مخالف کے ایجنٹ بیٹھے ہوئے، اپنے امیدوار سے زیادہ میری قابلیت کا خطبہ پڑھ رہے تھے ۔ مولانا بھی داخل ہوئے ۔ بیٹھنے کو جگہ نہ ملی ۔

کچی بارک کے غسل خانے، معلوم نہیں آپ نے دیکھے بھی ہیں یا نہیں ۔۔۔ میرے غسل خانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی ۔ دوسرے کی جگہ خالی تھی اُس پر مولانا بلا تکلف اس طور پر بیٹھ گئے گویا موصوف آج تک صرف اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے مجھ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا ۔ یہ البتہ نہیں معلوم کہ اُس گھڑے پر اِس کا کیا اثر پڑا جس کے رفیق کی جگہ مولانا نے غصب کر لی تھی، اَب میں تو الگ رہا ۔ مولانا اور اُن کے حریف میں کلتجپ ہونے لگی ۔ حریف نے آخر اِس اعتراف پر بحث ختم کرنی چاہی کہ دونوں اُمیدوار احمق، مولانا نے برجستہ فرمایا تو جناب میرا احمق کیوں نہ ووٹ پائے !

یہاں "احمق" کے بجائے دونوں بزرگوں نے ایک اور لفظ استعمال کیا تھا جو احمق سے زیادہ لچکیلا، سُریلا اور جامع تھا، لیکن اُس کا اِعادہ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ پھر اسی قسم کے لوگ خاکسار کی عافیت میں خلل انداز ہوں گے ۔ اُردو میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے فقروں اور جُملوں پر نہیں بلکہ پوری پوری داستانوں پر بھاری ہوتے ہیں:۔ گفتگو میں وُہ بے تکلف استعمال بھی ہوتے ہیں لیکن چونکہ استادوں کا کلام ان سے خالی ہے،[۱] اس لیے ہمارے لیے بھی وُہ شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

باوجود اس کے کہ مَیں اس عہد میں استاد یا مجتہد بن جانا آسان بھی سمجھتا ہوں اور پُر منفعت بھی! وطن[۲]، خاندان، ماحول، معتقدات، تعلیم و تربیت، رہن سہن کے اعتبار سے مولانا قطعاً مشرقی اور مذہبی واقع ہوئے تھے ۔ بایں ہمہ علمی مسائل کو علمی نقطہ نظر سے دیکھنے پرکھنے یا شعر و ادب میں اصلاح و ترقی کے رجحانات کو پہچاننے اور اس کی تائید کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے ہر مسئلے پر اظہار خیال کرنے میں اس کا لحاظ رکھتے کہ نقطہ نظر

لہ آشفتہ بیانی میری، ۸۱

وہ ہو جس کا مسئلہ مطالبہ کرتا ہو، نہ یہ کہ ہم آپ کیا چاہتے ہیں!

ذاکر[1] صاحب اور مَیں، مولانا کے ساتھ کالج میں کم و بیش چار سال رہے — دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت، سیر سفر، رنج راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ گفتگو یا مباحثے میں فارسی اور اُردو کے سربرآوردہ شعرا کے چیدہ اشعار مولانا کی زبان پر اتنے برمحل آتے کہ اکثر شعر ہی سُن کر محفل کا رنگ بدل جاتا۔

نومبر ۱۹۵۹ء میں[2] مولانا جوارِ رحمت میں پہنچ گئے! کس قدر شفیق و شریف النفس — کیسا ذہین و ذی علم اور فارسی شعر و ادب کا کس پائے کا باکمال ہم سے رخصت ہو گیا۔ دوستوں کے لیے اُن کے دل میں کتنی وسعت، کتنی نرمی اور نوازش تھی کیسی کیسی خوشگوار یادیں، شوخ بھی شریفانہ بھی، نئی پُرانی ہمیشہ تازہ رہنے والی یادیں مرحوم سے وابستہ ہیں۔

اپنے نیازمندوں میں مولانا نے جن دو چار کو تا دمِ آخر تقریباً چالیس سال تک عزیز و محترم رکھا، اُن میں سے ایک راقم السطور بھی تھا مجھے تو جیسے وہ کسی حال میں متردّد یا مایوس نہ دیکھ سکتے ہوں اور ہر طریقے سے جو اُن کے بس میں ہوتا خوش کرنے یا تسکین و تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے مرحوم کے ارد گرد جتنے لوگ تھے خواہ اپنے ہوں یا پرائے اُن سے کوئی پوچھے کہ مرحوم کی مفارقت سے اُن پر کیا گزر گئی! مرحوم تو اُٹھ گئے، اُن کی یادوں کے حزیں اور رہ رہ کر اُمنڈنے والے انبوہ کو کہاں لے جاؤں، کیسے بھلاؤں، یا اُن کو کیا جواب دوں!

مَیں[3] علی گڑھ آیا تو میرا سابقہ جہاں اور بہت سی باتوں سے ہوا، وہاں (ایک) ایسے شخص (ذاکر صاحب) سے بھی ہوا جو علی گڑھ کا ساختہ پرداختہ تھا اور اپنی قابلیت، اپنی خدمات اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے بیسویں صدی کے نصف ثانی کے ہندوستانی مسلمانوں کا ویسا ہی نجات دہندہ ثابت ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا، جتنا اُنیسویں صدی کے نصف ثانوی کے سر سیّد ثابت ہوئے۔

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۶۰، ۶۷ [2] آشفتہ بیانی میری، ۸ [3] آشفتہ بیانی میری، ۶۵

مَیں فرسٹ ایئر میں داخل ہوا تو مولانا اقبال احمد خاں سہیل کے توسّل سے ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جب سے اَب تک زندگی کیسے کیسے نشیب و فراز سے گذری لیکن اخلاص، یگانگت اور بے تکلّفی کے تعلقات بڑھتے اور گہرے ہی ہوتے گئے۔ کبھی کبھی زندگی کے اَوراق کو جہاں تہاں سے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کا بیچ نہ ہوتا تو کیا اِن اَوراق کے نقوش ایسے ہی ہوتے، جیسے کہ ہیں![1]

میرا اُن کا جتنا قریب اور جتنا طویل ساتھ رہا ہے بہت کم لوگوں کا رہا ہوگا اور مجھ سے زیادہ اُن کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع بھی شاید ہی کسی اور کو ملا ہو۔ اس سے بحث نہیں کہ وُہ رائے صحیح ہے یا غلط! ذاکر صاحب کے بارے میں (وقتاً فوقتاً متفرق و منتشر طور پر) مَیں نے بہت سی ایسی باتیں اِس انداز سے لکھیں کہ بعض بُزرگوں نے میری چشم نمائی بھی فرمائی۔ مَیں متنبہ ہوا لیکن اس پر ہنسی بھی آئی کہ دُنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا گیا، یہ نہیں دیکھتے کہ کون کس کے بارے میں لکھ رہا ہے! تکلّف برطرف!! مُرشد[2] (ذاکر صاحب) اور سہیل عصرِ حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں میں منفرد ہیں۔ میں نے ان سے زیادہ کسی کو طباع، ذہن اور بے پناہ نہیں پایا۔[3]

حکومتِ[4] ہند کی طرف سے کچھ ماہرینِ تعلیم، ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانے والے تھے۔ ان میں ذاکر صاحب بھی تھے۔ میں[5] نے کہا: "ذاکر صاحب آپ لندن جا رہے ہیں ایک چیز میرے لیے لیتے آئیے گا"۔ بولے: "وُہ تو ضرور لاؤں گا"۔ مَیں نے کہا: کیا؟ فرمایا: "گلاب"۔ مَیں پھڑک گیا!! ذاکر[6] صاحب لندن سے واپس آئے اور گلاب بھی لائے۔ جس نے سُنا تعجب کیا لیکن طے کوئی نہ کر سکا کہ

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۵۸ [2] آشفتہ بیانی میری، ٦٦

[3] مضامینِ رشید، ۲۳۰ [4] ذاکر صاحب، ۳

[5] ذاکر صاحب، ۵ [6] ذاکر صاحب، ٦

اِس میں بے تکا کون تھا ۔ فرمائش کرنے والا یا فرمائش لانے والا !

گلاب کا لانا بظاہر ایک معمولی سی بات ہے لیکن اس کی تہہ میں ذاکر صاحب کی بے پناہ سیرت کا موتی تارے کی طرح دمکتا نظر آتا ہے ۔ ایک دوست کی معمولی سی فرمائش پوری کر دینے کے لیے بڑی سے بڑی دُشواریاں اُٹھانے کا ایک مخصوص سُرور ہوتا ہے جس سے آشنا ہونا ہر ایک کا مُقدّر نہیں ۔ مجھے گلاب پانے کی بڑی خوشی ہوئی اگر یہ فرمائش کسی اور نے پوری کی ہوتی تو بھی خوشی ہوتی لیکن ذاکر صاحب کا بیچ میں ہونا میری خوشی کا خاص طور پر مُوجب ہوا ۔ اِس کے وجوہ ہیں ۔ اَوّل تو یہ کہ مَیں زندگی کی اچھی اور بڑی قدروں کی تعبیر افسانے کے کرداروں سے نہیں اَپنے احباب ، بالخصوص ذاکر صاحب کے اَطوار سے کرتا ہوں اور جب اور جہاں کہیں اِس کی تصدیق ہوتی ہے تو مَیں اپنے آپ کو داد دیتا ہوں کہ میں بڑی بات اور بڑے آدمی کو پہچانتا ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں ۔ اِس لیے مجھے طُفیلیوں، چوروں یا غاصبوں کی طرح نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے سوسائٹی میں جگہ پانے کا حق حاصل ہے ۔ دوسرے یہ کہ میں اِس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ دُنیا میں کوئی بڑے سے بڑا واقعہ ایسا نہیں ہُوا جو ہماری روزمرّہ کی زندگی میں ہر شخص کے لیے رونما نہ ہوتا ہو یعنی ہر شخص ہر لمحہ تاریخی ہیروؤں کی آزمائش سے گزرتا ہے۔ شاید اِسی وجہ سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ اگر خُدا ویسا ہی ہے جیساکہ مَیں نے سمجھا ہے تو حشر کے دن ہم میں بہتوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوگی کہ ہم نے کس کو کہاں پایا اور بڑی سے بڑی منزلت والوں کی صف میں جن کے کارناموں سے دنیا کا چپّہ چپّہ گونج رہا ہے ، اَیسے لوگ بھی شامل ہیں جن سے شاید اُن کے محلّے والے بھی پورے طور پر واقف نہ تھے ۔

زندگی میں[۱] مجھ پر اکثر ایسا وقت آیا ہے جب دل میں یہ بات آئی کہ قابلیت اور قربانی کا نتیجہ کیا جب اِن کو نظر انداز کر کے دُنیوی منفعت سے بہرہ وافر مل سکتا ہے ۔ دنیا میں کیسے کیسے گھٹیا لوگ کیسے کیسے اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں ۔ کوئی ان کو بُرا

---

[۱] ذاکر صاحب ، ۵۶

کہہ کر ان کا کیا بگاڑ لیتا ہے ۔ محتاط اور ایماندار رہنا اچھا سہی لیکن آخر اُن لوگوں کا بھی تو خیال رکھنا ہے جو میری ذات سے وابستہ ہیں ۔ میرے بعد ان کا کیا حشر ہو گا ۔ تھوڑا سا گھٹیا پن کر لیتے ہیں کوئی حرج نہیں ۔ فراغت نصیب ہو گی تو اس کی تلافی تھوڑا بہت دے دلا کر کر دیں گے پھر بھی بہت کچھ بچ رہے گا ۔ اِس دنیا میں لوٹ کر آنا نہیں ہے پھر اس کی لذتوں سے محروم رہنا کون سی عقلمندی ہے ۔ وُہ بھی جب لذتیں کچھ دُور نہ ہوں آسانی سے ملتی ہوں اور رُسوائی کا کچھ ایسا اِمکان بھی نہ ہو ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں بُزدل ہوں' اِس لیے بُرائی سے ڈرتا بھاگتا ہوں!

اِس کیفیت کا ردِعمل ہوتا ہے اور میرے سامنے ذاکر صاحب آجاتے ہیں ۔ میں ان بڑی ہستیوں سے بہتوں سے زیادہ واقف ہوں جن کی خوبی، نیکی اور بہادری سے مذہب، تاریخ یا افسانوں کے اوراق لبریز ہیں اُن کی شہرت یا برگزیدگی کو میں مانتا ہوں ۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کا اصلی یا فرضی وجود کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے بلکہ اس کی جھلک مجھے اپنے دوستوں میں ملتی ہے ۔ ان دوستوں میں جن کی زندگی کے ہر پہلو سے میں پورے طور پر آشنا ہوں، جن کو میں دنیا کے ہر کار و بار میں اسی طرح منہمک پاتا ہوں جس طرح میں خود ہوں ۔ جن کے سامنے وہی کمزوریاں یا لذتیں آتی ہیں جو میرے سامنے آتی ہیں ۔ وُہ اُن کو مُسکرا کر (ڈر کر نہیں) نظر انداز کر دیتے ہیں ان کمزوریوں سے میرا سابقہ ہوتا ہے تو میں علانیہ یا چھُپ کر ان میں مُبتلا ہو جاتا ہوں اور طرح طرح کے جتن کرتا ہوں ۔ اور نظر انداز کر دیتا ہوں تو تمام عمر ان کو حسرت سے یاد کرتا رہتا ہوں لیکن وہ دنیا کو نہ دارالمحن سمجھتے ہیں نہ دار فانی ۔ اس کو صرف دنیا سمجھتے ہیں ۔ ایسی دنیا جس کو وُہ آخرت سے بھی اعلیٰ و ارفع بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔

مجھے اطمینان ہونے لگتا ہے کہ میں نے اپنے لیے جس زندگی کا انتخاب کیا ہے اس میں خسارہ نہیں ہے ۔ میرا جن لوگوں کا ساتھ ہے وُہ بُرے نہیں ہیں ۔ زندگی کا ماحصل یا انسانیت کا مقصد یہی ہے نہ کہ آدمی نے جو زندگی یا زمانہ پایا اس کو اپنے خیال یا حُسن

ئے ذاکر صاحب، ۲۶

عمل سے خواہ وُہ اتنا کم ہو کہ حساب میں نہ آئے بہتر و برتر بنائے ۔ دُنیا کو بہتر و برتر بنانے کے لیے لازم ہے کہ انسان خدمت لینے سے زیادہ خدمت کرے ۔ یہ وُہ عبادت ہے جو اس کو نفس کے تمام تار و اسطالبات سے باز رکھتی ہے اور مسرور و مطمئن بناتی ہے۔ ہر وُہ بات اور ہر وہ فعل جو انسان کو اس عبادت سے باز یا محروم رکھے ظلم یا گناہ ہے! انسان مال اور کھال ہی میں مست نہیں رہتا کردار میں بھی مست رہ سکتا ہے!

ذاکر صاحب سے میرے تعلّقات بڑے گہرے اور بڑے پُرانے ہیں لیکن قومی زندگی میں میرا اُن کا کبھی ساتھ نہ ہوا ۔ وہ قلندر، میں دُنیا دار ۔ اُنھوں نے زندگی کے جو مصائب اُٹھائے ہیں، مَیں اُن کا متحمل نہ ہو سکتا تھا ۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جُھکایا، اُن آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے پیہم سجدے کیے اور ٹھکرائے گئے۔ ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نہ کر سکوں ممکن ہے یہی سبب ہو کہ اُنھوں نے مجھ سے اس قسم کی فرمائش نہ کی میں نے اُن سے بڑی سے بڑی فرمائش کی اور انھوں نے ذرّہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا...... ذاکر[1] صاحب کی شرافت، وسعت قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! ذاکر[2] صاحب کو کوئی بُرا کہتا ہے تو مَیں بھونچکّا رہ جاتا ہوں اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وُہ یہ کہ یا تو یہ شخص شیطانِ محض ہے یا ناواقفِ محض!

۱۹۲۰ء[3] میں ہم سب، صاحب باغ میں ایم۔ اے پریویس اور قانون کے طالب علم تھے ۔ قانون کے امتحان میں مشکل سے پندرہ دن باقی تھے اور کورس سارے کا سارا کورا تھا ۔ کئی دن سے ہم لوگوں کی توجہ اِس مصیبت پر مرکوز تھی ۔ ذاکر صاحب کہتے تھے پڑھنا تو ہے ہی چاہے امتحان سے پہلے پڑھا جائے، چاہے بعد میں ۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناشتے اور کھانے کا مکمل پروگرام بنا لیا جائے ۔ نصیر[4] مرحوم نے ذرا چین

---

[1] ذاکر صاحب ، ۳۸ [2] ذاکر صاحب ، ۴۴

[3] ذاکر صاحب ، ۴۸ [4] ذاکر صاحب ، ۴۹

بجبیں ہو کہ کہا ؛ ذاکر تم پڑھائی میں کھنڈت ڈالتے آئے ہو اور اَب بھی اسی کے درپے ہو۔" بڑی رد و قدح کے بعد پروگرام بنا . . . . پڑھائی شروع ہوئی ۔ ہم تین چار آدمی ساتھ پڑھتے تھے ۔ ذاکر صاحب ، مَیں ، سیّد نصیر الدین علوی مرحوم اور خلیل الدین مرحوم بحث اس پر چھڑی کہ بآواز بلند کون پڑھے ۔ اس پر کوئی تیار نہیں ہوتا تھا ۔ نصیر مرحوم ہکلاتے تھے ۔ ان کو پڑھنے سے معاف کر دیا گیا تھا اور بحث کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ خلیل مرحوم پڑھنے سے شرماتے تھے اُن کا کالج کا نام بھی گلفام ہے ۔

مَیں نے کہا : میں پڑھنے کے لیے تیار ہوں لیکن پھر ذاکر صاحب نے قائم گنج سے جو گھی منگوایا ہے ۔ وُہ دوپہر اور شام کو دال میں ڈالنے کے لیے دو چمچے زاید لوں گا ۔"

نصیر صاحب طیش میں آکر بولے " . . . . . ہر . . . . . ہر . . . . ہر گز . . . نہیں . . . . میں . . . . پ پ پ . . . . پڑھوں گا ۔"

مَیں نے کہا تو پھر تین چمچے لوں گا ۔"

ذاکر صاحب بولے : وہ کیوں"

مَیں نے کہا نصیر صاحب پڑھیں گے تو مجھے ایک چمچہ سر میں بھی ڈالنا پڑے گا ۔"

ذاکر صاحب نے کہا : پڑھنے کے لیے تیار ہوں لیکن صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے تین منٹ پہلے کھانا شروع کر دوں گا ۔ اس کے بعد آپ لوگ شروع کریں گے ۔"

اس پر ہر شخص بیک وقت چیخ پڑا اور بولا " ہر گز نہیں ، ہر گز نہیں ۔ ہم پڑھنے کے لیے آئے ہیں بھوکوں مرنا نہیں چاہتے ۔"

غرض پڑھائی شروع ہوئی . . . . (وہ زمانہ) اب بھی یاد آتا ہے ——— ہمارے کمرے[1] صاحب باغ کی دوسری منزل پر مشرقی سمت واقع تھے ۔ سامنے برآمدہ تھا ۔ برآمدے سے اُتر کر لمبا پتلا صحن ۔ جہاں ہم سب بیٹھے پڑھنے میں

---

[1] ذاکر صاحب ، ۵۳

مصروف تھے ۔ رات زیادہ آچکی تھی ۔ ۔ ۔

ذاکر صاحب[1] کتاب پر جُھکے ہوئے تھے ۔ دونوں کہنیاں میز پر تھیں اور ہاتھوں کی دو دو انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے ۔ ۔ ۔ ۔ کھولے ہوئے تھے ۔ میں نے کہا ذاکر صاحب یہ کیا، کہنے لگے[2]! نہ نیند مانتی ہے، نہ آپ مانتے ہیں ـــ کروں کیا ۔ نیند آتی ہے پر نہیں جاتی!"

دوسرے ہی دن طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا ۔ معلوم ہوا کسی مسئلہ پر طلبا نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وُہ اس کی سربراہی کریں ۔ ذاکر صاحب فی الفور اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے ۔ تین چار دن تک اُن کا کوئی پتہ نہ چلا ۔ ایک دِن یونین کے دارالمطالعہ میں مل گئے ۔ میں نے پوچھا "کیسی رہی ؟"

بولے: بخیر گزشت"

مَیں نے کہا: اور جناب پڑھائی ؟"

فرمایا: اِس ہنگامے میں جو دل و جان سے مُنہمک رہا اُس کا کچھ تو اجر ملنا چاہیے تھا۔ اللہ نے آپ سے نجات دلائی ۔"

" اور کھانا پینا ـــ ـ ؟" میں نے پوچھا ۔

بولے: قوم کا کام کرنے والا بھوکا نہیں مرتا ۔"

مَیں نے کہا: ذرا احتیاط رکھیے گا قومی کام کرنے والے بھوک سے تو نہیں مرے لیکن ہیضے میں اکثر مرے پائے گئے ہیں ـــ"

میں بدحظ ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آ گئے ۔ کہنے لگے: اللہ میرا کہا مان لیجئے ـــ"

میں نے کہا: وُہ کیا ـــ"

فرمایا: چلیے دہلی چلیں ـــ"

مَیں اُکتا گیا اور بولا: ذاکر صاحب ہوش میں آیئے ۔ امتحان کے کے دن رہ

---

[1] ذاکر صاحب / ۵۴

گئے ہیں ؟ ــــــ "

اس بات کو اس طور سے ٹال گئے جیسے اس کی ذرہ برابر بھی اہمیت نہ تھی ۔ کہنے لگے : پڑھ کے کیا کیجئے گا ۔ کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے احمقوں کو مرعوب کرنے کے لیے بی ۔ اے کافی ہے ۔ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لیے ہنسنے بولنے کی عادت ڈالنی ہے اس کے لیے دہلی کا سفر ضروری ہے ۔"

میں[1] نہ مانا ۔ ذاکر صاحب بھی دلی[2] نہ گئے ۔ صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے پائے گئے ۔ امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کے اُفق پر پھر سے نمودار ہوئے ہم نے اُن کی پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور ہماری ہمدردی کے مستحق تھے ۔ اور وہ اس طور سے ملے جیسے اُنھوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو ۔ امتحان ہوا ۔ نتیجہ نکلا ، ہم سب فیل ، صرف ذاکر صاحب پاس !

اپنے[3] عہدِ تعلیم ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء[4] کے فوراً ہی بعد میں اسٹاف میں آگیا تھا ۔ یونیورسٹی[5] میں اچھے اور ذہین طلبا سے ملنے اور ان کے ساتھ طبع آزمائی کرنے میں جو لذت ہے وہ مجھے کسی اور چیز میں نہیں ملتی اس سے خود طالب علم کو کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہیں میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا زندگی کی بعض قباحتوں یا روز روز کی یکسانیت سے جب طبیعت مُنغّض یا پست ہونے لگتی یا یہ دیکھتا کہ کہنگی اور تھکن میری طرف رینگتی بڑھتی آرہی ہے تو مجھے یہ ضرورت محسوس ہوتی کہ کسی اچھے اور ذہین طالب علم سے گفتگو کی جائے ۔ اُس وقت صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ میں واقعی حق بخشوا چکا ہوں یا

اَب بھی گر پڑ کے ضعف سے نالے

ساتواں آسمان لیتے ہیں !

گفتگو کے دَوران ہی میں مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ " غریب نیستم ، بیمار ہستم !"ـــ

---

[1] ذاکر صاحب ، ۵۶ [2] آشفتہ بیانی میری ، ۱۴۵

[3] آشفتہ بیانی میری ، ۱۶۹ [4] ذاکر صاحب ، ۶۳

اچھی کتاب پڑھنے اور اچھے طالب علم سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ذہن میں بالیدہ ہونے، پرواز کرنے اور نئی نئی وادیوں سے گزرنے کی استعداد باقی ہے اور دل و دماغ پر تاریکی کے جو بادل چھا گئے ہیں وہ عارضی ہیں دائمی نہیں

اس کے ساتھ ساتھ مجھ میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ میں بالعموم ایسے طالب علم کی تلاش میں نہیں رہتا اور خود ایسے طالب علم کے ہاتھ نہیں آتا — اس لیے کہ اقبال کے زمانے تک تو نوجوانوں کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ میرے زمانے میں سواری یا کرایہ سستا پا کر ان پر تسمہ پا لیڈر بھی سوار ہو گئے۔ مجھ میں نہ اتنی سکت کہ میں اس تکڈم کو اپنے اوپر سوار کر لوں، دوسری طرف انسانیت گوارا نہیں کرتی کہ میں خود ان پر سوار ہو جاؤں!

میں اپنے اچھے اور صاحب توفیق طالب علم کو اکثر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ کبھی نہ کبھی ذاکر صاحب سے مل ضرور آئے اور یہ اس لیے کہ میں جس متاع کو اپنے لیے گراں مایہ سمجھتا ہوں۔ اس میں اپنے ان عزیز طلبا کو بھی شریک کر لینا چاہتا ہوں جن کو عزیز سمجھتا اور محترم گردانتا ہوں۔ بحیثیت ایک معلّم کے میرا عقیدہ ہے کہ نوجوانوں کو جتنی صحیح و صالح تربیّت بلند و برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اتنی کتابوں اور لیکچر سے نہیں ملتی۔ مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جو بے کار بھی ہو سکتی ہیں اور خطرناک بھی — اگر کوئی بڑی شخصیت ان معلومات کو اس طالب علم کے لیے مفید مطلب نہ بنا دے۔

معلومات کی مثال ریگ صحرا سے بھی دی جا سکتی ہے اور بھک سے اڑ جانے والے مادے سے بھی۔ یہ کام صرف اچھے معلّم اور رہبر کا ہے کہ وہ ذرہ سے الماس نکال لینے کی اور بارود سے تباہی کا امکان دور کر کے مفید طاقت حاصل کرنے کی سبیل بتائے۔ کچھ دنوں سے نوجوانوں میں جو بے راہ روی نظر آ رہی ہے اس کے اسباب بہت کچھ ہو سکتے ہیں لیکن ایک بات جو مجھے نہایت واضح طور پر نظر آئی وہ یہ ہے کہ طلبا کو زیادہ سے زیادہ اور انواع و اقسام کی معلومات فراہم کرنے کی خطرناک حد تک

سہولتیں میسّر ہیں لیکن ان معلومات کو اُن کے لیے مفید بنانے یا ان کی گزند سے بچانے والے اچھے معلّم یا رہبر نہیں ہیں۔ صاحبِ نظر کے ادنیٰ اشارے سے وُہ منزلیں چشمِ زدن میں طے ہوگئی ہیں جو نظروں سے پوشیدہ رہی ہیں یا جن تک پہنچنے میں صدہا دُشواریاں خطرے اور مایوسیاں تھیں ــــ طالب علم، ذاکر صاحب سے مل کر آتا ہے تو اُن کے بارے میں ایسے خیالات و تاثرات کا اظہار کرتا ہے جیسے زندگی میں اُسے کوئی اچھی اور غیر متوقع چیز مل گئی ہے!

اس لیے داستان کے لکھنے کے بعد مجھے اپنے ایک عزیز و محترم دوست کی تنبیہ یاد آئی۔ ذاکر صاحب پر مَیں نے وقتاً فوقتاً جو کچھ کہا اِس پر میرے ان دوست نے ایک بار مجھ سے کہا۔ "آپ ذاکر صاحب کے بارہ میں یہ کیا اناپ شناپ لکھ ڈالتے ہیں۔ اُن کے وقار کا تو لحاظ رکھا کیجیئے۔ لوگ ان کے بارے میں کیا خیال کریں گے۔ آپ کو تو تفریح کی سوجھتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی رسوائی ہوتی ہے!"

مَیں نے عرض کیا: آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے ذاکر صاحب کے وقار کا تو لحاظ رکھا اور میرے وقار کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ آپ کے بارہ میں تو مجھے معلوم نہیں کہ آپ ذاکر صاحب کے وقار کو کن باتوں پر مبنی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک تو اُن کا وقار اُنھی باتوں پر مبنی ہے جو میرے ذہن و دماغ میں میرے ارادے سے بے نیاز باہزاراں شیوۂ دل بری بے محابا و بے حجاب آتی ہیں اور نوکِ قلم سے ٹپک پڑتی ہیں۔"

یہ باتیں نہ میری ہیں نہ ذاکر صاحب کے لیے ہیں۔ معلوم نہیں کس کی ہیں اور کس لیے ہیں، لیکن ہیں سب کچھ!!

○

---

[1] ذاکر صاحب، ۶۹

[2] ذاکر صاحب، ۶۹

۷

"واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ مجھے کھیلنے کا شوق لایا — لیکن وہ زمانہ علی گڑھ اور علی گڑھ والوں کی ایسی تمکنت و جلال کا تھا کہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال میں میرا کوئی پرسان حال نہ ہوا ——"

○

پہلے پہل مجھے کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا جو طرح طرح کی اُردو، طرح طرح کے تلفظ اور لہجے سے بولتے تھے! اُس زمانے میں میرا کچھ ایسا خیال تھا کہ ہر جگہ اُسی قسم کی اُردو بولی جاتی ہو گی جیسی جون پور کے ثقات بولتے تھے۔ علی گڑھ میں ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے ساتھیوں کی اُردو سننے میں آئی تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے دیار کے اشخاص کے علاوہ دوسرے لوگ غیر متمدن سے تھے! ظاہر ہے یہ تاثرات کلیتہً احمقانہ تھے لیکن بہت دنوں بعد جب میں خاصا کم احمق رہ گیا تھا، سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل شرف نیاز حاصل کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اُردو لہجہ اور تلفظ سُن کر ایک لمحے کے لیے دم بخود ہو گیا۔ تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے![1]

۱۹۲۵ء میں مَیں (اقبال) مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں، اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابلِ فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ مَیں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو پُرفکر و پُرلطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دلآویزی تاثرات پر ہی نہیں، بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں مَیں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے۔ اُس کی اشعار بیتی سے

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۳۰۷

[2] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۴۱

نہیں بلکہ اُس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے ۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے ۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے ۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وُہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے ۔ وُہ اپنے ہی جذبات کی ترجمانی کرسکتا ہے یا دوسروں کی تشفی بھی ۔ غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے مَیں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا ...... سیاہ عقدہ (بو) باندھتے، کالر دُرست کرتے ہوئے برآمد ہوئے گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں، مَردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی ! ....

بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لیے رہے ۔ بھاری بھر کم لہجے میں بولے : " آپ ہیں جی صدیقی صاحب " مَیں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور اُن کا حلیہ دیکھ کر مُتحیّر اور مرحوم کے اندازِ تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر دل گرفتہ ہوا ۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا ۔ قلم کا تلفظ سن کر میں گھبرا اٹھا ۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن ذہن میں معلوم نہیں کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اِس طرح کی مَعذوریوں سے مُستثنیٰ ہوں گے ۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیے تھا وُہ نہ ہوا ——— مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اَب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود اُن کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور اُن کے ہاتھ ملانے میں وُہ شفقت اور ناقابلِ بیان مُروّت و مرحمت تھی کہ مَیں سب کچھ بھول گیا ——— ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا ۔ جیسے ایک نیا تجربہ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مُستحق ضرور تھا گو اس کا منتظر نہ تھا ۔ جیسے مجھے ایک نئی حِس تفویض ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا ۔[1]

میرے نزدیک کسی شخص کا دلی یا لکھنؤ کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا اُردو کا لب و لہجہ بھی معیاری ہوگا ۔ گفتگو میں صحتِ زبان ہی کافی نہیں ہے، لب و لہجہ کا شستہ

---

[1] ہم نفسان رفتہ ۸۷

ہونا بھی ضروری ہے ۔۔۔ بحیثیتِ مجموعی اُردو لب و لہجہ کے لوازم ایسے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا یوں بھی آسان نہیں ہے ۔ بُتوں کی مانند اُردو لب و لہجہ کے بھی ایسے کتنے شیوے ہیں جن کو اَب تک نام نہیں دیا جا سکا ہے! [1] زبان نہ اپنے حسب نسب کے اعتبار سے ترقی کرتی ہے، نہ زبان کے بلے وقوف دوستوں کے حسب نسب سے ۔ وہ ترقی کرتی ہے بولنے اور لکھنے والوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت سے!

(اور) ہم [2] میں سے کس کو اس بات کا علم نہ ہوگا کہ تقریباً پچھلے سَو سال سے اچھے اُردو نگار کی پہچان ہی یہ رکھی گئی ہے کہ وُہ ہر طرح کے خیالات و جذبات کو سلیس عام فہم اُردو میں اَدا سکتا ہو ۔ سب سے پہلے یہ صفت غالب میں، اس کے بعد سر سیّد میں پھر حالی میں، اُن کے بعد مولوی عبدالحق میں پائی اور سراہی گئی ۔ اس کے برخلاف خطیبانہ یا شاعرانہ اُسلوب بیان کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اور اتنی سی بات بتانے کے لیے غالباً کسی پیغمبر کی ضرورت نہ محسوس کی جائے گی کہ سہل و سلیس اُردو اگر کسی زبان سے سب سے زیادہ قریب ہے تو وُہ ہندی ہے اور جن زبانوں سے دُور ہے وُہ فارسی اور عربی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ہندی خود سلیس و سہل اُردو سے نہیں سہل سلیس ہندی سے بھی دُور بہت دُور چلی جا رہی ہو!

اُردو [3] کا ذکر یہاں یقیناً بے محل ہے لیکن اِس سے مقصود اپنی ایک نفسیاتی اُفتاد کا اظہار ہے ۔ صحیح یا غلط اور معلوم نہیں کیوں اور کب سے یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ زبان کے علاوہ اُردو بہت کچھ اور بھی ہے! جیسے ایک قیمتی ورثہ، ایک قابل قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کُن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا یا اِس طرح کی کتنی اور باتیں جو محسوس ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو پاتیں ۔ چنانچہ کسی کو غلط اُردو بولتے سنتا تو سمجھتا کہ بولنے والا قابلِ اعتنا نہ تھا یا کسی معذوری میں مُبتلا ہے تو ہماری ہمدردی کا مستحق ہے ۔ رفتہ رفتہ جب یہ دیکھنے میں آیا کہ اُردو پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں اور اس

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۲۴ [2] ہم نفسانِ رفتہ ۱۹۳ [3] آشفتہ بیانی میری، ۴۷

کو زک پہنچانے اور ختم کر دینے کے اہتمام ہو رہے ہیں تو معلوم نہیں کتنے حجابات آنکھوں کے سامنے سے دور ہو گئے اور اُردو کا جو اَب حال ہوا ہے اُس سے یقین آچلا ہے کہ اس کے بارے میں ابھی ابھی جس حُسنِ ظن کا اظہار کر چکا ہوں وُہ غلط نہ تھا!

(ابتدا کالج میں) دوسری بات جو عجیب معلوم ہوئی، یہ تھی کہ لوگ آپس میں مل بیٹھتے تو اکثر اس پر فخر، یا رشک کرتے کہ فلاں صاحب شاعر ہیں یا فلاں شخص بڑی اچھی اُردو بولتا ہے! مَیں نے جون پور میں اِس اکثرت سے شاعر دیکھے تھے کہ سمجھنے لگا تھا کہ ہر اُردو داں شاعر ہوتا ہے اور جو نہیں ہوتا وُہ میرا ہی جیسا گیا گزرا ہوتا ہے! شاعر ہونا ایسی کوئی بات نہیں — آخر اِس پر تعجب کیوں کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص اچھی اُردو بولتا ہے!

ایک دن مَولانا سہیل سے جو ابتدا سے میرے "نگہبان فرشتہ" کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے اَپنے یہ وسوسے بیان کیے . . . بولے اَرے بھائی، ٹکسالی اُردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی ہم سب تو کتابی اُردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جون پور ہی پر موقوف نہیں، ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے . . . لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اُردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اُردو بھی بول سکتا ہو!!
(مولانا سہیل) سجّاد انصاری[1] مرحوم کے ذوق، ذہانت اور اُسلوبِ نگارش کے بڑے معترف تھے — میں علی گڑھ آیا تو انصاری علی گڑھ سے جا چکے تھے۔ خط و کتابت اکثر رہی ملاقات کبھی نہ ہوئی۔

ایک[2] زمانہ میں راقم الحروف اور (یادش بخیر) ذاکر صاحب کالج میں ساتھ رہتے تھے اور حسنِ اتفاق سے جس روز ایسا کھانا مل جاتا جسے کالج ڈائننگ ہال کی ہَوا تک نہ لگی ہوتی، ہم دن کا دن اور رات کا بیشتر حصّہ ایک بہترین اُردو رسالہ نکالنے کی اسکیم مُرتّب کرنے میں صرف کر دیتے تھے لیکن یہ منصوبے محض اس چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جاتے کہ رسالے کا نام کیا ہوگا؟ ۲۲ - ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب نے ہندوستان کی زمین کو خیرباد

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۸۱ [2] سہیل کی سرگزشت، ۳۹

کہا اُس وقت تک صرف دو نام تجویز کیے جا سکتے تھے ایک "شمع" دوسرا "سہیل"۔۔۔ شمع تو ایک صاحب نے اُڑا لیا۔ اَب صرف "سہیل" باقی رہ گیا تھا۔ پچھلے دنوں سیّد سجّاد حیدر صاحب یلدرم (مرحوم) سے اس کا تذکرہ آیا تو فرمانے لگے "یہ نام عرصے سے میرے ذہن میں ہے ۔۔" میں نے خیال کیا کہیں اِس سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تو پھر ذاکر صاحب بھی نہیں ہیں .... اس ہفت خواں کو نئے سرے سے کون طے کرے گا جلد سے جلد اِسی نام کا اعلان کرنا پڑا۔ یہ ایک[۱] سہ ماہی ادبی رسالہ تھا جو میں نے انجمن اُردوئے مُعلّیٰ کی طرف سے ۱۹۲۶ء میں نکالا تھا (اور) ۱۹۲۷ء تک باقاعدہ شائع ہوا۔ علمی طبقے میں اسے بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ کئی[۲] دفعہ ارادہ کیا کہ اس سلسلے کو پھر شروع کروں اور جہاں تک اِرادے کا تعلق ہے اس میں اَب تک کوئی فرق نہیں آیا مگر کچھ نہ کر پایا۔۔

مرحوم (سجّاد انصاری) کی تحریریں مجھے[۳] بہت پسند تھیں اور اَب بھی ہیں۔ ان کے مضامین کی طباعت و اشاعت کا انصرام مَیں نے بہت شوق سے کیا تھا۔ مرحوم کا مشہور ڈرامہ "روزِ جزا" وفات کے مدّتوں بعد تمام و کمال "سہیل" میں اور بقیہ مضامین اس سے قبل "علی گڑھ میگزین" میں شائع کر چکا تھا۔ سجّاد انصاری مرحوم کے سارے مضامین بعض بُزرگوں کے نزدیک مذہبی نقطۂ نظر سے قابلِ گرفت تھے، اِس لیے مسلم یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کر دیے گئے۔ یہ کوئی ایسا غیر معمولی حادثہ نہ تھا، اکثر مصنّفین کو ہر دور میں اس طرح کے دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں، بلکہ اس سے بھی بُرے دن!

پھر علی گڑھ پر ایک وقت ایسا آیا جب سیاست نے مذہب سے یا مذہب نے سیاست سے رشتہ جوڑ کر یہاں کی فضا کو اس قابل نہ رکھا کہ علم و اَدب کی تحصیل و تحقیق اور سچائی کی جستجو کے ساتھ، نوجوانوں کو صالح و صحت مند اقدار کو اپنانے اور پھیلانے کی تلقین کی جا سکتی یا تربیت دی جا سکتی اور اِس اِدارے کی بیش بہا روایات کو زیر و زبر ہونے سے بچایا جا سکتا ۔۔۔ یہ حکایت بالکل لطیف نہیں ہے اس لیے

۱؎ آشفتہ بیانی میری ۸۲، ۲؎ آشفتہ بیانی میری طبع دوم، لکھنؤ ۴۴، ۳؎ آشفتہ بیانی میری ۸۱،

اِس کو پھیلا کر بیان کرنے کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ میرے جگر میں سارے جہاں کا درد کبھی نہیں رہا — میں[1] بذاتِ خود کچھ "مقامی" سا آدمی واقع ہوا ہوں۔ "آفاقی" یا ماورائی قسم کا ہونے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں نہ حوصلہ، نہ ہوس! میرے[2] حوصلہ یا ہوس کی دُنیا (تو) بہت محدود رہی — میں تو کھیل کود کر، ہنس بول کر، آس پاس کے اپنے پرائے کے دُکھ سکھ میں شریک ہو کر زندگی گزار دینا چاہتا تھا اور یقین سا آچکا تھا کہ اِس طرح کی زندگی علی گڑھ میں رہ کر یا علی گڑھ کے لیے بسر کر سکوں گا لیکن ایک ایسا وقت آیا جب نا عاقبت اندیشی اور بے راہ رَوی کے ایسے مظاہرے دیکھے کہ غم و غیرت سے بے قرار ہو گیا! اِس کا ذکر ضروری تھا اِس لیے کہ اِس حادثے نے میرے ذہن اور اسلوبِ تحریر کو بھی اِس طرح متاثر کیا ہے کہ میں اس پر فخر نہیں کر سکتا اقبال کا مشہور مصرعہ مجھے اکثر یاد آیا ہے ع

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سوچتا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جُدا رکھنے پر جس چنگیزی کا سامنا ہو گا وُہ قابلِ قبول ہے یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی کا سابقہ ہو گا وُہ قابلِ ترجیح ہے!

غالباً ۱۹۱۶ء[3] کا زمانہ تھا — ایک دوست کو خط لکھا تھا کہ علی گڑھ کی دو باتوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ ایک یہاں کا کرکٹ میچ، دوسرا جنازے کا قبرستان لے جانا۔ ایک کا ہمہمہ — دوسرے کا حُزن ..... ایم۔ اے۔ او کالج کی بہت سی رسم و روایات میں تبدیلی راہ پا چکی ہے لیکن میّت کو گورستان تک پہنچانے اور سپردِ خاک کرنے میں جو رکھ رکھاؤ پہلے دیکھنے میں آتا تھا آج بھی وُہ قائم ہے۔

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۲ [2] آشفتہ بیانی میری، ۸۳

[3] آشفتہ بیانی میری، ۸۶

میری[1] طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ ہوئے ۔۔۔۔۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کی فیلڈ پر علی گڑھ کی جیت ہوئی ۱۹۱۵ء سے پہلے کا کرکٹ کا ریکارڈ اس سے بھی زیادہ شاندار رہا تھا ۔۔۔۔۔ یہ آرزو بہت دنوں تک رہی اور اب بھی کچھ کم نہیں کہ علی گڑھ کرکٹ کی پوری داستان ۔۔۔۔۔ مرتب کر لی جاتی تو بڑا اچھا ہوتا ــــ کرکٹ[2] میچ کا اجتماع کتنا ستھرا اور شان دار ہوتا تھا۔ ہر طالب علم یونیفارم میں ملبوس ہوتا ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کلاس میں، کسی تقریب میں یا ہوسٹل سے باہر کسی طالب علم کا بغیر یونیفارم کے پایا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات علی گڑھ میں اس درجہ عام بھی اور اس سختی سے اس کی پابندی کی جاتی کہ اگر کسی موقع پر اپنے ہی کسی ساتھی کو کسی دوسرے لباس میں اچانک دیکھ لیتے تو جھجک جاتے تھے کہ وہی تھا یا کوئی اور! کالج[3] کے کرکٹ فیلڈ یا کرکٹ نیٹ پر جس طرح کے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے وہ صرف علی گڑھ کا حصّہ تھا ۔۔۔ اور یہ کچھ کھیل کے میدانوں ہی پر موقوف نہ تھا بلکہ یونین، ڈائننگ ہال، مشاعرے وغیرہ میں بھی کم و بیش اسی طرح کا نظم ملتا تھا۔

اس[4] سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا علی گڑھ کی ٹینس ٹیم میچ کھیلنے باہر گئی ۔ میچ ایک مشہور کالج کی ٹیم سے تھا ۔ اتفاق یہ کہ جن کھلاڑیوں کے ساتھ میچ ہونے والا تھا وہ ٹینس کے یونیفارم میں نہ تھے جو اُس زمانے میں سپید فلالین یا زین کا پتلون اور سپید ہی فلالین یا ٹوئل کی قمیص پر مشتمل تھا۔ علی گڑھ کی ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اس بنا پر کھیلنے سے انکار کر دیا کہ مقابل کے کھلاڑی مناسب یونیفارم میں نہ تھے ــــ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ ایسی کسی جگہ یا ٹیم کے ساتھ ٹینس کھیلے جہاں ٹینس کا احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا ہو ۔ بڑی مشکلوں سے اس نزاکت پر قابو پایا گیا۔

اسی طرح کا ایک اور لطیفہ ہے ۔ پکّی بارک کے ایک سینئر طالب علم میرے وطن

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۸۸ [2] آشفتہ بیانی میری، ۹۱

[3] آشفتہ بیانی میری، ۹۰ [4] آشفتہ بیانی میری ۹۲

سے آ گئے جہاں اُن کے والد گورنمنٹ کے ایک ذمّہ دار عہدے پر مامور تھے۔ گھر والوں نے میرے لیے یونیفارم کا کپڑا بھیجا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے کمرے پر تشریف لائے، گھر والوں کی خیریت تفصیل سے سنائی اور بتایا کہ یونیفارم کا کپڑا لائے ہیں۔ مَیں نے بے اختیار پوچھا: "کہاں ہے؟" مسکرائے اور بڑے اطمینان اور شفقت سے فرمایا: "کمرے پر ہے۔" معاً مجھے اس کا احساس ہوا کہ میری یہ حرکت ریلفریشر، نو وارد کی تھی۔ بولے: "چار بجے کمرے پر آؤ، میرے ساتھ چائے پیو، کپڑا بھی مل جائے گا!" یہ توقف مجھے بڑا شاق ہوا۔ اس زمانے میں کم سے کم میرا یہ حال تھا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی ساتھی یا شخص گھر والوں سے مل کر آیا ہے یا وہاں سے میرے لیے کچھ لایا ہے تو طبیعت بے قابو ہو جاتی اور جب تک وہ آدمی یا چیز نہ مل جائے چین نہ آتا تھا۔

بارے وُہ وقت آیا اور مَیں اُن کے کمرے پر پہنچا۔ دروازے پر آکر پذیرائی کی، دوسروں سے تعارف کرایا۔ کھیلنے اور پڑھنے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا مَیں نے کہا: "کپڑا مرحمت ہو مَیں جانا چاہتا ہوں"۔ بولے: ضرور، ضرور نوکر کو آواز دی، آیا تو بکس کی کنجی اس کے حوالے کی اور کپڑا نکلوایا۔ مَیں نے چاہا لے کر کمرے سے بھاگ کھڑا ہوں۔ بولے: ذرا ٹھہرو، نوکر چائے کے برتن ہٹا دے۔ وُہ کپڑے (صرف دو گز سرج!) لے کر تمہارے ساتھ جائے گا۔" مَیں چار دن خانے چِت تھا! لیکن شاید چِت ہونے میں ایک آدھ خانہ باقی تھا۔ اِس لیے کہ اپنے کمرے پر پہنچا تو ایک اَور سینیئر رونق افروز تھے۔ مَیں نے نوکر سے جھپٹ کر کپڑے لیے اور بکس کھول کر رکھنے لگا، نوکر واپس جانے لگا تو سینیئر صاحب نے مجھے مخاطب فرما کر باآواز بلند فرمایا: مولانا دو آنے نوکر کو دیے دیتا ہوں، روپلے بعد میں تڑاتے رہیے گا!— اب میں بے شمار خانوں چِت تھا!!

اس زمانے میں اس واقعے کو سُن کر کون نہ ہنسے گا مگر کروں کیا کہ اس طرح کی باتوں سے مَیں نے کچھ سیکھا بھی جیسے یہی کہ تمام عمر کیسا ہی کوئی موقع و محل کیوں نہ ہو خود

اعتماد سا رہا۔ اپنے سے بھی، دُوسروں سے بھی!

اسکول[۱] میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال کا کیپٹن رہا۔ لکھنے پڑھنے[۲] سے کہیں زیادہ میرا دل (ان) میں لگتا تھا۔ مَیں دراصل علی گڑھ میں اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آیا تھا جتنا علی گڑھ کے کھیل، نیز اس کی عام وقعت و وقار کا چرچا سُن کر لیکن[۳] میں آیا ایسی ناکسی اور بے بسی کے عالم میں تھا اور وہ زمانہ علی گڑھ اور علی گڑھ والوں کی ایسی تمکنت و جلال کا تھا کہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال میں میرا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوا۔ ناچار میں نے ٹینس سیکھنی شروع کی اور کچّی بارک میں چارپائی ٹینس کلب خود اُو ممبر ہوگیا۔ جال کے بجائے چارپائی کھڑی کر لی جاتی تھی اور کچّی بارک کے سامنے ریت سے اَٹے ہوئے میدان پر لوٹے سے پانی ڈال کر، کورٹ بنا لیا جاتا تھا۔ ممبر ہر وُہ شخص ہو سکتا تھا جس کے پاس چارپائی اور سیکنڈ ہینڈ گیند ہو۔ آنریری ممبر وُہ ہو سکتے تھے جو بیت الخلا جس کا نام اِس زمانے میں "بر سرِ آفس" بھی تھا، جاتے اور وہاں سے آتے وقت کورٹ کی مٹی اور روندی ہوئی لائن پر پانی ڈال کر اُسے پھر سے نمایاں کر دیں۔ یہ کھیل ہی[۴] کا تصرّف تھا کہ مجھ میں جو اچھی صلاحیتیں تھیں وہ برگ و بار لائیں اور جو کمزوریاں تھیں وہ ختم نہیں ہو گئیں تو اُبھرنے بھی نہیں پائیں!!

O

۱۔ سہیل کی سرگزشت، ۱۳ ۲۔ آشفتہ بیانی میری، ۳۴

۳۔ سہیل کی سرگزشت، ۱۳ ۴۔ آشفتہ بیانی میری، ۳۴

۸

"پروفیسر انعام اللہ خان صاحب اپنے عہد کے بڑے ممتاز اور مقبول معلموں میں سے تھے۔ انگریزی اور منطق پڑھاتے، پرانے انداز کی مرصع و مقفّٰی انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے، منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے ـــ ایک دفعہ مجھ سے منطق کے کلاس میں برہم ہو گئے۔"

کھیل[1] کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا۔۔۔۔ جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اُس میں انگریزی کے سب سے اچھے مُقرّر ذاکر صاحب اور اُردو کے مولانا سہیل تھے اور دونوں زبانوں میں ذاکر صاحب ۔۔۔۔ تقریر کے کیسے کیسے معرکے اِن دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سَر کیے، جب اچھی تقریر کرنا قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اُتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔

کالج[2] اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی یونین کو جو حیثیت آج کل حاصل ہے وہ پہلے نہ تھی نیز طلبا نے جو مسائل اَب اپنا لیے ہیں اور کون سے ایسے مسائل ہیں جو اپنانے سے رہ گئے ہیں، اُن کی طرف پہلے کبھی وہ اِس درجہ مائل نہ تھے۔ اس پر نہ ماتم کرنے کی ضرورت ہے نہ فخر، اور جس بات پر نہ ماتم کرنا لازم آتا ہو نہ فخر، اُس پر غور کرنا بھی کچھ اتنا ضروری نہیں رہ جاتا۔ یہ زمانے کے نشیب و فراز ہیں جن سے:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے

سبھی ساز و ستیز کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے ـــ کہنا یہ تھا کہ اس زمانے کی یونین سے کس طرح کے کردار نمو پاتے تھے اور زندگی اور شعر و ادب میں اُن کا کیا مقام

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۹۸ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۰۲

ہوتا تھا اور اب کس طرح کے کردار اُبھرتے ہیں اور زندگی میں کیا مرتبہ حاصل کرتے ہیں!

پہلے زمانے میں طلبا سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے ہاتھ میں اتنے نہ تھے جتنے اب ہیں گو اس بارے میں خود لیڈر کچھ اس طرح فریاد کرتے پائے گئے ہیں کہ ع

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا!

اور اکثر دیکھنے میں بھی یہ آیا ہے کہ جس بار نے لیڈر پر بھی گرانی کی اُس کو یہ "ناتواں" (طالب علم) اُٹھا لیتے ہیں!

جیساکہ (غالباً) عرض کیا[1] جا چکا ہے اس عہد میں تقریر کے فن کو بڑا ممتاز درجہ دیا جاتا تھا — کالج[2] میں طلبا کے علاوہ اسٹاف میں دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے کی شہرت حاصل تھی۔ ایک تاریخ کے پروفیسر اے۔ ایف رحمٰن اور دوسرے پروفیسر انعام اللہ خاں کو جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے . . . . . اولڈ بوائے کی حیثیت سے عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ علی گڑھ سے شیفتگی پیدا کرنے میں صدیقی صاحب کا مجھ پر بڑا احسان ہے . . . . انگریزی میں لاجواب تقریر کرتے تھے۔ انعام[3] اللہ خاں صاحب بہار کے رہنے والے تھے، بڑے شریف النفس، سادہ مزاج لیکن اتنے ہی جذباتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس بات پر کس سے کب بے حد خفا، یا خوش ہو جائیں گے مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ کھانا کھانے یا یوں کہیے کہ انڈے کا خاگینہ کھلانے کا بڑا شوق تھا جو تلا ہوا کم اور جھلسا ہوا زیادہ ہوتا تھا۔ دسترخوان کا کام statesman کے اوراق سے لیتے جن کو بچھاتے وقت بڑی سنجیدگی سے کہہ کرتے تھے کہ صحیح انگریزی لکھنے کی آرزو ہے تو اسٹیٹسمین ضرور پڑھا کرو۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کہہ دینے سے معذرت کا حق کس طرف سے ادا ہو جاتا تھا۔ میزبان، دسترخوان یا اسٹیٹسمین کی طرف سے!

(انعام اللہ خاں صاحب) اپنے عہد[4] کے بڑے ممتاز اور مقبول معلموں میں سے تھے۔ انگریزی[5] اور منطق پڑھاتے تھے۔ پرانے انداز کی مرصع مقفیٰ انگریزی بڑی روانی

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۰۸ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۰۹

[3] آشفتہ بیانی میری، ۱۱۰ [4] آشفتہ بیانی میری، ۱۱۱ [5] آشفتہ بیانی میری، ۱۱۲

اور طنطنے سے بولتے ۔ منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سُنتے ـــــ ایک دفعہ مجھ سے منطق کے کلاس میں برہم ہو گئے بات یہ ہوئی کہ سبق سُنانے کی میری باری آئی ۔ منطق مجھے پسند نہیں اس لیے کہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جُدا ہوتی ہے رٹنے سے یوں گھبراتا ہوں کہ اس میں مجھے منتشابہ بہت لگتا ہے یعنی غزل پڑھتے پڑھتے اللہ رسول کا ذکر آجائے تو مناجات شروع کر دیتا ہوں ـــــ حال ہوا یہ کہ میں نے لکھائے ہوئے نوٹ میں اپنی طرف سے پیوند لگانے شروع کر دیے ، وہ بھی اس طرح کہ اکثر پیوند کا سائز اصل سے بڑھ جاتا اور پیوند بھی جگہ جگہ سے خستہ و خوار ۔ اس پر یک لخت کتاب بند کر دی اور بڑی سنگلاخ انگریزی اور خشمناک لہجے میں فرمایا "دیکھو جی ! یا تو انعام اللہ خاں سے اچھی انگریزی لکھو اور بولو یا پھر انعام اللہ خاں کی انگریزی رٹو ۔ بیچ کا کوئی راستہ نہیں ـــــ" یہ تنبیہہ اپنی کلاس کے طالب علموں کو وقتاً فوقتاً دیتے رہے ۔

پروفیسر صاحب کے لیے اُردو ترجمے کا کام مَیں نے جس قدر کیا اور موصوف سے جتنی تحسین حاصل کی وُہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی ۔ کہا کرتے تھے تمہاری اُردو میں مجھے اپنی انگریزی کا مزا آجاتا ہے میں دم بخود ہو جاتا تو انڈے کھلانے کی دعوت دیتے ۔ طالب علمی اور ڈائننگ ہال کے زمانے میں یہ سودا میرے لیے بڑی کشش کا تھا !

پروفیسر اے ۔ ایف ۔ رحمٰن بڑے شرمیلے ، شائستہ اور شریف انسان تھے ۔ متانت اور تہذیب جیسے اُن پر ختم ہو گئی ہو ۔ نظر نیچی رکھتے ۔ گفتگو کرتے اور کلاس میں لیکچر دیتے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے . . . . جس طرح اپنے کو لیے دیلے رہتے تھے ویسے ہی دوسروں کے مراتب ملحوظ رکھتے تھے ۔ بے تکلف اور بے محابا اپنے ہم چشموں سے بھی نہ ہوتے تھے ۔ انگریزی شیریں اور شائستہ لہجے میں بولتے تھے اور کبھی کوئی ایسا لفظ یا فقرہ منہ سے نہ نکالتے جس کے ثقہ یا معیاری ہونے میں شبہ ہوتا ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انگلستان میں انہوں نے میل جول صرف طبقۂ اشراف ہی سے رکھا تھا ۔ رہن سہن ، وضع قطع ، رکھ رکھاؤ کی جو سطح اپنے لیے پہلے دن مقرر کر لی تھی آخر دن تک قائم رکھی ۔ لڑکوں کے اصرار پر یونین کے مباحثوں میں شریک ہونے کے لیے اکثر آجاتے ۔

مسٹر رنیل[1] انگریزی کے بڑے قابل پروفیسر تھے۔ دوسرے انگریز پروفیسر بھی اُن کی زباں دانی کے معترف تھے۔ اُس زمانے میں انگریزی میں ممتاز ہونے کا شوق اس درجہ عام تھا کہ جو طالب علم رنیل صاحب کے کلاس یا ٹیوٹوریل گروپ میں ہوتا اُس کے بارے میں یہ حُسنِ ظن عام ہوتا کہ اس کی انگریزی اچھی ہے ـــ قاعدے قانون کے خود بڑے پابند تھے اور دوسروں سے پابندی کرانے میں کسی طرح کی رو رعایت گوارا نہ کرتے۔ اس کے صلے یا پاداش میں دو ایک دفعہ کچھ ناخوشگواریاں بھی پیش آئیں لیکن بحیثیتِ مجموعی رنیل صاحب کا وقار طلبا میں جوں کا توں رہا۔

اِتفاق سے ایک دن کلاس دیر سے پہنچے۔ لڑکے جا چکے تھے دوسرے دن آئے تو کہا جب تک تم کو یہ نہ معلوم ہو جایا کرے کہ میں رخصت پر ہوں یا مرگیا اُس وقت تک میری کلاس نہ چھوڑا کرو اور یہ اُنھوں نے صحیح کہا۔ کلاس وُہ اسی پابندی سے لیا کرتے۔ یورپین اسٹاف نے متفق ہو کر استعفیٰ دے دیا تھا۔ رنیل صاحب شام کی گاڑی سے علی گڑھ چھوڑنے والے تھے۔ اُس دن بھی اُنھوں نے حسبِ معمول اپنی کلاس لی اور پوری توجہ سے آخری منٹ تک پڑھاتے رہے۔ گھنٹہ بجا اور کلاس سے جانے لگے تو کتاب بند کی اور بولے "حضرات خدا حافظ" اور یہ پہلا موقع تھا جب ہم سب نے محسوس کیا کہ رنیل صاحب کی آواز کسی قدر گلوگیر تھی ـــ

بعض[2] دوسرے اساتذہ کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔۔۔۔۔ مولانا عبدالحق حقی بغدادی عربی کا درس غالباً برکت علی خاں لیکچر روم میں دیا کرتے، وہی وقت اسٹریچی ہال میں ٹول صاحب کے اکنامکس کے لیکچر کا ہوتا۔ مولانا حقی کی کلاس میں چار پانچ ہی طلبا ہوتے جو بہت قریب بیٹھے ہوتے لیکن مولانا پڑھاتے اِس بلند آواز سے تھے کہ وکٹوریہ گیٹ تک آواز صاف سُنائی دیتی۔ ٹول صاحب پرنسپل تھے مگر اُنھوں نے کبھی کوئی تعرّض نہ کیا۔ کلاس میں ہم کو بسا اوقات گھبراتے دیکھ کر کبھی کبھی تھوڑی دیر لیکچر دینا بند کر دیتے پھر شروع کر دیتے بالآخر موصوف نے اُپنے ہی لیکچر کا وقت بدل دیا ـــ ایک دفعہ البتہ

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۱۴ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۱۵ [3] آشفتہ بیانی میری، ۱۱۷

فرمایا: "مَیں مولانا کے طاقتور پھیپھڑوں پر رشک کرتا ہوں" ایک طالب علم نے کہا: "جناب والا ہم بھی یہی کرتے ہیں لیکن اپنے اُن ساتھیوں کے کان کے پردوں پر بھی جو مولانا کے درس میں ہوتے ہیں!" ٹول صاحب نے زہر خند فرمایا۔ ہم سب دم بخود رہ گئے۔ اس لیے کہ ٹول صاحب کے سامنے لَب کُشائی ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی تاوقتیکہ وُہ کوئی مہا مسخرانہ ہوتا یا غیر معمولی کھلاڑی یا یونین کا مقرر![1]

مسٹر آکرٹونی (Mr. David Aurchterlonie) فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ہمارے گروپ نے شیکسپیئر کے ڈرامے بی۔ اے میں تین انگریز پروفیسروں سے پڑھے اور ان کی ٹیوٹوریل کلاس میں رہے یعنی پروفیسر رینل (Prof. D. Reynell) پروفیسر آکرٹونی اور پروفیسر پرویس (Prof. S. O Purvis) جن کی ہیئت، عمر اور ڈیل ڈول دیکھ کر سارا کالج پروفیسر پرویس کے بجائے پاپا پرویز کہتا تھا۔ پروفیسر آکرٹونی کے بارے میں کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُن کا موڈ انگلستان کے موسم کی مانند کب کیا ہو جائے گا۔ ہماری سائڈ کے ٹیوٹر تھے۔ ٹیوٹر کو اس زمانے میں کم و بیش وہی اختیارات حاصل تھے جو آج کل پرووسٹوں کو ہیں۔

آکرٹونی صاحب کی پنسل اکثر لاپتہ ہو جاتی! اس کے لیے ترکیب یہ نکالی تھی کہ پنسل کے ایک مختصر ٹکڑے کو بڑے لمبے دھاگے سے باندھ دیا تھا۔ اس پنسل کو لیے ہوئے ہر کمرے یا برآمدے میں آتے جاتے رہتے اور جو کچھ نوٹ کرنا ہوتا کر لیا کرتے اگر پنسل کہیں چھوٹ جاتی تو اس کی تلاش میں سَرگرداں نہ ہوتے بلکہ میز تک جس کے پائے سے دھاگے کا دوسرا حصّہ بندھا ہوتا، واپس آتے، دھاگے کو کھینچنا شروع کر دیتے اور پنسل آموجود ہوتی! یہ کبھی نہ کرتے کہ دھاگے کے سہارے پنسل تک پہنچ جاتے اور اُسے اُٹھا لیتے۔ کھینچنے میں پنسل کہیں اٹک جاتی تو اُسے چھڑا آتے اور واپس آکر پھر دھاگا کھینچنے لگتے۔ یہاں تک کہ پنسل میز تک واپس آجاتی اور اپنی جگہ پر رکھ دی جاتی۔ اپنے کتّے[2] سے جو بالکل معمولی دیسی قسم کا تھا بڑی محبت کرتے تھے۔ وُہ مر گیا

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۱۹

[2] آشفتہ بیانی میری، ۱۲۲

تو باغ کے ایک گوشے میں دفن کرا دیا ۔ قبر پختہ بنوائی اور یہ کتبہ اُردو میں لکھوا کر نصب کرا دیا :

"بھائی تجھ سا کبھو نہ ہوا"

غالباً انگریزی فقرے کا ترجمہ ہے :

"A brother like thee was never born"

باہر گھومتے پھرتے کبھی نظر نہ آئے ۔ اپنی ہی کوٹھی کے اندر رہتے یا کلاس لینے آجاتے ۔ بڑی محبت اور کھلے دل کے آدمی تھے ۔ داؤ پیچ جیسے جانتے ہی نہ ہوں لیکن جہاں ڈسپلن کا معاملہ آجائے آکرڑ لونی صاحب کو اُن کے راستے سے کوئی بھی اِدھر اُدھر نہیں کر سکتا تھا ۔ گھنٹہ بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے اور ختم ہوتے ہی کتاب بند کر دیتے ۔ کمی بیشی کی اُن کے ہاں گنجائش ہی نہ تھی ۔ پڑھانے کے سوا کلاس میں ایک لمحہ بھی اِدھر اُدھر کی بات نہ کرتے ، نہ کسی کو کرنے دیتے ۔ یہ وتیرہ اُس زمانے کے ہر انگریز پروفیسر کا تھا ۔ طالب علموں کی بڑی عزت و محبت کرتے تھے لیکن نہ اُن کو اپنا آلہ کار بناتے نہ اُن کے آلہ کار خود بنتے ـــــ یہ صفت اب تعلیم گاہوں میں عنقا ہے اور لُطف یہ ہے کہ اس کا کسی کو غم بھی نہیں !

پاپا پرویز سب سے نرالے تھے ۔ چوڑی چکلی ہڈی ۔ لمبا تڑنگا قد ۔ پاٹدار آواز ، تقریباً سن رسیدہ ـــــ ہمہ وقت شراب میں سرشار ـــــ کلاس میں بغدادی صاحب کے بعد سب سے زیادہ بلند آواز میں اس جوش و خروش سے پڑھاتے جیسے شراب کا نشہ زائل نہ ہوا ہو بلکہ بڑھتا جا رہا ہو لیکن آفرین ہے اِس شخص پر کہ معذوری کے باوجود شیکسپئیر کے نکات جس خوبی سے واضح کرتے کوئی دوسرا یا تو کر نہیں سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا ـــــ سب سے پہلے لفظی ترجمہ کرتے یہاں تک کہ If (اگر) اور But (مگر) تک کا ترجمہ کر ڈالتے ۔ پھر ہر فقرے کے محل اور موقع کی توضیح کرتے ۔ اِس شدّ و مد سے جیسے شراب ہی نہیں کسی آسیب کی زد میں ہوں ! نظر برابر کتاب پر جمی رہتی ، کلاس کی طرف کبھی نہ دیکھتے ۔ مسلسل بولتے چلے جاتے جیسے کبھی پھر بولنے

کا موقع نہ آئے گا۔ شراب اور اوقاتِ درس دونوں کے یکساں سختی سے پابند تھے۔ ساتھی یوروپین اور دوسرے اساتذہ سے ربط ضبط نہ تھا۔ معمولاً کسی بات چیت کرنے یا اِدھر اُدھر دیکھنے بہت کم پایا گیا۔ اپنے لیے شراب ہی کی قربان گاہ کا انتخاب کیا اور بالآخر اُسی کی نذر ہو گئے۔

انٹرمیجیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مُرادآبادی تھے موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اُردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگراں بھی رہے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آگیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظریف، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے۔ نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ اساتذہ اور طلبا میں یکساں مقبول و محبوب تھے۔ قاضی صاحب کے بغیر ہر تقریب سونی معلوم ہوتی۔ خوب سوجھتی تھی۔ تفریحی اور ہجویہ نظموں میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ . . . . دعوتوں کے موقع پر بہت جلد اور بڑے مزے کی نظم لکھ ڈالتے۔ ان کی ظرافت و طنز کے ہدف، میزبان اور اشیائے خورونوش خاص طور پر ہوتیں!

جغرافیہ پڑھاتے میں ملکوں، شہروں، دریاؤں، پہاڑوں، جھیلوں کے ٹیڑھے میڑھے طویل الذیل ناموں کو ایسے دلچسپ فقروں مصرعوں اور مکالموں میں کھپا دیتے کہ ان ناموں کو بھول جانا ناممکن تھا۔ تمام دنیا کے نقشوں کو بھی اسی طرح قابو میں لائے تھے۔ مقررہ کشش اور شوشوں کو گھٹا بڑھا کر اس طرح لکھتے کہ مخصوص نام یا فقرے سے مخصوص نقشہ تیار ہو جاتا۔ مثلاً بابر شیر یہ لڑکا ہے۔ اِس کو اس طرح لکھتے یا اس کا طغرا بناتے کہ وہ ہندوستان کا خاکہ بن جاتا۔ نقشہ کھینچنے میں ایسا باکمال مشکل ہی سے کہیں نظر آئے گا۔ آنکھ پر پٹی کیوں نہ باندھ دی جائے، جس ملک، دریا جھیل یا پہاڑ کا نام لے دیجیے اس کا نہایت صحیح خاکہ بے تکلف اور بہت جلد کاغذ یا تختۂ سیاہ پر کھینچ دیتے! اُس زمانے میں ہندوستانی لکچرر کو بڑی معمولی تنخواہ ملا کرتی

تھی - ایک موقع پر کسی ناواقف نے وطن میں سوال کر دیا، قاضی صاحب، آپ کو علی گڑھ میں تنخواہ کیا ملتی ہے؟ بڑے استغنا لیکن تھوڑی سی تمہید کے بعد جواب دیا "بھئی اللہ کا شکر ہے ڈاکٹر ضیاء الدین اور میری تنخواہ مل کر ایک ہزار روپے ماہوار ہو جاتے ہیں ـــ" البتہ ڈاکٹر ضیاء الدین کا نام آہستہ سے بہت ہی رواداری میں لیا اور اللہ کا شکر اور ہزار روپے بلند آواز سے کہے تھے!

اِس طرح کی طبّاعی نے اُن کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا - الفاظ کی اُلٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے اُن کے ہاتھ چومے اور بقیہ نے اپنے سر پکڑ لیے! اِس مہم میں راقم السطور اُن کا دستِ راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لیے اُصول وضع کرنے یا معنی پہنانے کی ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجیہہ و تلبیس کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا عطائی بھی امراض یا مذہب کی نہیں کر سکتا تھا - میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لیے ایک نیا کھاتا کھول دیا گیا تھا جس کا نام "گھپلا کھاتہ" تھا ـــ میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کے نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت ہی کا نام گھپلا کوش یا گڈھب کوش رکھ دیا جائے گا - ہندی میں شاید فرہنگ یا لُغت کو کوش ہی کہتے ہیں ـــ فارسی میں بھی آیا ہے، در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش! چنانچہ اِس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دیے جاتے جن کی تعبیر و توجیہہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشائش کی اُمید باقی رہ جاتی! ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے امتدادِ زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں......

(قاضی صاحب) کی ڈکشنری سے مثالیں پیش کرنا طوالت کا باعث ہو گا - یوں بھی اس کے بہت سے الفاظ زبان زد ہیں ـــ آپ کے تحمّل و درگزر کے بے پایاں ذخیرے پر بھروسہ کرتے ہوئے دو ایک مثالیں لسانیاتی عبرت کے لیے

پیش کرتا ہوں مثلاً ٹریژرر (Treasurer) خازن کی تاویل اس طرح کی تھی کہ یہ عموماً تنخواہوں اور بلوں میں کانٹ چھانٹ کیا کرتے ہیں اس لیے ٹریژرر کا یہ عہدہ "ترے ضرر" کے لیے! پراکٹر (Proctor) چوں کہ ڈسپلن کے معاملے میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتا اس لیے یہ ماخوذ ہے "بڑا اکڑ" سے ڈپٹی (Deputy) وہ جو ڈپٹتا ہے .... اُن کے زمانے میں زبانی امتحان وائوا ووسی (Viva voce) کا مسلم یونیورسٹی ممتحن کو معاوضہ نہیں دیتی تھی۔ اِس لیے اس کی تاویل یوں کی گئی تھی "واہ واہ ویسے ہی" — ڈیکوریشن (Decoration) نکلا تھا "دیکھو رے شان" سے — وغیرہ!

اِس تفنن کا المیہ یہ ہوا کہ جب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن واپس تشریف لے گئے تو اِسی لغت کو شائع کرنے کے لیے اپنا ایک پریس کھولا اور جلالی ڈکشنری کے نام سے اِسے چھاپنا شروع کیا۔ ہم سب نے اپنے آپ پر نفرین کرنے کے بعد موصوف سے درخواست کی کہ یہ سب بے فکری اور تفریح و تفنن کا ایک مشغلہ تھا اس کو چھاپنے اور شائع کرنے سے محنت و زیرباری کے علاوہ جگ ہنسائی کا بھی سامنا ہوگا۔ لیکن موصوف نہ مانے، کچھ اجزا چھاپ بھی ڈالے۔ بالآخر قضا و قدر کو بیچ میں پڑنا پڑا یعنی قاضی صاحب کو ہم سب سے اور اُن کے ورثا نے پریس کو اَپنے سے جُدا کر دیا ورنہ .... زمینِ چمن گُل کھاتی ہے کیا کیا — کے کیسے کیسے نمونے ہمارے سامنے آتے!

لیکن[۱] یہ تو قطعاً غیر متعلق گفتگو ہوئی — ہاں تو کہنے یہ جا رہا تھا کہ کھیل[۲] کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا — یونین کے وائس پریسیڈنٹ (اَب پریسیڈنٹ) کا درجہ کرکٹ کیپٹن اور .... اُچھے مُقرّر کی حیثیت فرسٹ الیون کے اچھے کھلاڑیوں کے برابر ہوتی —

ایک[۳] واقعہ کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ

---

[۱] مضامین رشید، ۲۵۲ [۲] آشفتہ بیانی میری، ۹۸ [۳] آشفتہ بیانی میری، ۱۰۱

کے طلبا کی سیرت و شخصیت کا اثر یونین اور یونین کا طلبا پہ کتنا گہرا تھا۔ یونین کے الیکشن میں اس شخص کا ناکام رہنا یقینی تھا جو اپنی ذاتی قابلیت یا اچھی سیرت کے سوا کسی اور سہارے کا متلاشی ہوتا۔ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ کوئی شخص محض اس بنا پر منتخب ہو جائے کہ وہ ہندو، مسلمان، شیعہ، سُنّی، پنجابی یا کسی ذی اقتدار طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ (میں) کالج میں داخل ہوا تو ایک الیکشن کا بڑا چرچا تھا جو کسی رئیس کے روپے اثر و اقتدار سے جیتا گیا تھا اس کا ردِّ عمل ایسا ہوا کہ پھر اُمراء کے طبقے سے کوئی اُمیدوار کابینہ تک کے لیے منتخب نہ ہو سکا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس طبقے کا کوئی فرد یونین کے عہدے کے لیے کھڑا ہوتا تو سب سے پہلے اُسے "ترکِ نسب" کا اعلان کرنا پڑتا!

اِن باتوں کے اظہار سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ اس زمانے میں یونین کا الیکشن بے عنوانیوں سے پاک ہوتا تھا۔ زندگی کی کوئی خوبی یا خرابی ایسی نہیں ہے جو تمدنی زندگی کے پہلے دن سے آج تک کسی شکل میں کسی نہ کسی حد تک چھپی یا کھلی ہر جگہ موجود نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اُس زمانے میں اِن بے عنوانیوں کی نوعیت ایسے فتنے اور فضیحتے سے پاک ہوتی جن سے ادارہ یا قوم کی نیک نامی پر حرف آتا ہو۔ بحیثیتِ مجموعی مَیں اِس درس گاہ کی صحت مند یا غیر صحت مند فضا کی نشانی اس میں تلاش کرتا ہوں کہ یونین کے الیکشن میں اُمیدوار کس چیز کا سہارا پکڑتے اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اپنی ذہنی اور اخلاقی برتری اور ادارے کی علمی اور اخلاقی منزلت کا یا مذہب و مسلک کے اختلافات اور ذاتی یا بیرونی اغراض و مقاصد کی حمایت کا۔ ظاہر ہے اِن دونوں میں بہتر صورت کون سی ہے!

یونیورسٹی کے بر دئے کار آنے کے .... ساتھ ہی اثر و اقتدار کے لیے اعیان و اکابر میں کچھ اس طرح کی آویزش شروع ہوئی کہ کسی کو یونیورسٹی کی بہتری و نیک نامی کا دھیان تک نہ رہا طرح طرح کی خرابیاں پھیلیں ... اس سے یونین بھی متأثر ہوئی .... اعلیٰ علمی مُباحثوں کی جگہ سیاسی اور وقتی مسائل و مناقشے پر ریزولیوشن پاس کرنا اس کا کام

رہ گیا ـــــ یونین کے اراکین اچھے مُباحثے ترتیب دینے اور یونین کے صحت مند تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے سیاسی لیڈروں کو تشریف آوری کی دعوت دینے، اُن کو لائیف ممبر بنانے اور اُن کی "آنکھ کا تارا" بننے کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے سُبقت لے جانے کی کوشش میں سرگرداں رہنے لگے۔

ضمناً یہاں ایک تبدیلی کا ذکر کردوں گا۔ کالج کے زمانے میں اور اس کے کچھ دنوں بعد تک یونین میں کسی مہمان کا خیر مقدم کیا جاتا تو تلطّف و تکریم کے اچھے سے اچھے اور زیادہ سے زیادہ کلمات مہمان کے لیے کہے جاتے ۔ اُن باتوں کا ذکر لُطف و احترام سے کیا جاتا جن سے مہمان کا تعلق خاص ہوتا۔ مہمان کی پذیرائی کا مفہوم یہ ہوتا کہ اُس کی عزت اپنی عزت، اُسکی خوشی اپنی اور اُس کی خفت تھی ۔ اپنے بارے میں جو کچھ کہتے اُس میں انکسار اور وقار ہوتا اور تقریر بہت مُختصر ہوتی ۔

شریف گھرانوں میں کوئی مہمان آتا ہے تو ہم سب جانتے ہیں کہ مہمان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے ۔ لیکن رفتہ رفتہ یونین کا یہ رنگ نظر آنے لگا کہ مہمان کوئی ہو، موقع کچھ ہو، مہمان کا خیر مقدم "در مدح خود می گوید" کے رزمیہ اور رجزیہ سے کیا جانے لگا۔ وہ بھی اِس عزّۃ اور عزیو سے جیسے زمانۂ قدیم کے میدانِ جنگ میں ایک طرف کا پہلوان، دوسری طرف کے پہلوان کو دعوتِ ضرب دے رہا ہو۔ دوسرا پہلوان، غریب مہمان ہوتا۔ چنانچہ یونین میں مہمان کی پذیرائی، خُودستائی اور خودنمائی کا حیلہ بن گئی ـــ

اکثر یہاں تک دیکھنے میں آیا کہ سامعین، مہمان سے زیادہ میزبان یا میزبانوں کی گرمیٔ گُفتار سے مستفید ہوتے رہے ۔ ظاہر ہے خُودستائی اور خُودنمائی، اُس شخص یا جماعت کا شیوہ ہوتا ہے جسے اِس عیب کے سوا کسی دوسرے ہُنر کا سہارا نصیب نہیں ہوتا ۔ تقسیمِ مُلک کے بعد شکر ہے کہ یونین کی کالونی کا یہ دور جلد ہی ختم ہوگیا اور وُہ اپنی دیرینہ قابلِ قدر روایات کی پیروی پر مائل ہوگئی ہے ۔

یونین کے بارے میں (ابھی) جو باتیں بیان کی گئی میں ان پر کڑھنا بے سود ہے ۔

گڑھنا یوں بھی اچھا نہیں - زندگی اور زمانے کے طور طریقے ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔
البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض اُمور اور ادارے ایسے ہوتے ہیں جن میں تبدیلی آتی تو ہے
لیکن بہت دیر میں اور آہستہ آہستہ - ان کی خوبی اور قدر و قیمت کا راز ہی یہ ہے کہ وُہ
دیر میں تبدیلی قبول کرتے ہیں۔ اِسی ذیل میں یونیورسٹی اور یونین آتے ہیں جہاں ان
روایات اور اقدار کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے جو ہماری قومی سیرت کا سنگِ بُنیاد ہوتے ہیں
یہ روایات اور اقدار بہت دنوں میں ظہور پاتی ہیں اس لیے بہت دیر تک قائم رہتی ہیں
اور قائم رکھی جاتی ہیں - دوسری طرف سیاست کا کاروبار ہے جہاں ہر طرح کی تبدیلی
ہر آن رونما ہوتی ہے - اِس طور پر یونیورسٹی اور سیاست کا اتحاد بے جوڑ اور ناواجب
مانا گیا ہے لیکن آج کل کوئی ایسی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی جس کا دور یا نزدیک کا رشتہ
سیاست سے نہ ہو بالخصوص اُدنیٰ سیاست سے !

آج سے پہلے یونین کا اُصلی مقصد تعلیمی، تفریحی اور تہذیبی تھا اور وہ ایک طور پر
یونیورسٹی یا کالج میں تعلیم پانے والوں کی تربیت گاہ بھی تھی اور تفریح گاہ بھی - ملک کی
سیاسی فضا کے ساتھ یونین کی فضا بھی بدلی اور جلد ہی یونیورسٹی اور یونین دونوں سیاسی
تہلکوں میں جا پڑے - یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آیا جب یہ بتانا دُشوار ہو گیا کہ تعلیم گاہوں
اور بازاروں میں کون کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں - یونین میں
طلبا یہ سیکھتے ہیں کہ اپنی بات کس صفائی اور صداقت سے کہی جائے اور دوسرے کی
بات کس تحمل اور کشادہ جبینی سے سُنی جائے - نیز تقریر کے فنّی آداب کیا ہیں اور کس طرح
برتے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اچھی تقریر میں فن بھی سمجھتا ہوں اور فضیلت بھی - فن کو فضائل سے
مستحکم اور مزیّن رکھنا تعلیم گاہوں کے اعلیٰ مقاصد میں ہونا چاہیے ---

○

ل مثلاً یونین کے تعارف میں اکثر یہ توصیفی کلمے استعمال کیے جاتے This mighty Union
(یہ توانا اور قادرِ مطلق یونین) ضمناً یہاں یہ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ طالب علم تو پھر طالب علم
ہیں، ہم آپ جیسے "حق بخشوائے" لوگ بھی معمولی سی یہ بات نہیں جانتے کہ : مستند تعریف وُہ ہے جو دوسرے
ہماری کریں نہ یہ کہ ہم خود اس بارے میں زحمت گوارا فرمایا کریں" لیکن کون ہے جو اس عیب یا "عیاشی" میں
مبتلا نہیں !

۹

میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنے آپ کو اِس سَند کا
اہل ثابت کریں گے —"
وائس چانسلر کا یہ فقرہ تمام عُمر پیچھا کرتا رہا!

○

بہت دنوں کی بات ہے جس کو بوڑھے "کل کی بات" کہتے ہیں، کہتے ہی نہیں محسوس بھی کرتے ہیں اس لیے اور زیادہ بوڑھے اور نکمے ہوتے رہتے ہیں، میں ایک دیہاتی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس زمانے میں تباہ حال دُور افتادہ گاؤں کے اسکول، مدرس اور متعلّم کیسے ہوتے تھے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، یوں اور کہ آج بھی ان کی حالت کچھ زیادہ نہیں بدلی ہے۔ دیسی اور دیہاتی اسکول کی تعلیم کا سب سے پہلے یہیں سابقہ ہوا۔

اِسکول میں ایک لڑکا تھا، بس اس عمر کا جیسے لڑکپن کا زمانہ ختم ہونے کو آرہا ہو اور جوانی جلد ہی قریب کے موڑ سے نمودار ہونے والی ہو۔ اِتنا شریر و سرکش لڑکا پھر کہیں دیکھنے میں نہ آیا۔ بات بات پر جھگڑتا، گالی بکنے اور اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں سے بھی ہاتھا پائی کرنے پر ہمہ وقت آمادہ، راہ چلتی عورتوں پر بے تکلف فحش فقرے کستا۔ اس کا موازنہ آج کے مُہذّب طالب علم اور مہذب تر اساتذہ سے کرتا ہوں تو ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ موجودہ نسل کے طلبا اور اُساتذہ شاید ایک دوسرے کو اتنا قابلِ لحاظ یا احترام نہیں سمجھتے جتنا اُس عہد میں جاہل اُجڈ گنوار طالب علم

لہ فکر و نظر علی گڑھ اکتوبر ۱۹۶۳، صفحہ ۵۱

آپ اپنے اُستادوں کو سمجھتے تھے۔

ممکن ہے یہ اُس زمانے کی جہالت اور توہم پرستی کا اثر ہو کہ شاگرد، اُستاد کو ایک طرح کا چلتا پھرتا، جیتا جاگتا، محنت اور محبت کرنے والا دیوتا سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ جس لڑکے کا ذکر کر رہا ہوں وہ اتنا خیرہ سَر اور غیر ذمّہ دار ہونے کے باوجود پنڈت جی کے سامنے بھیگی بلّی سے بھی زیادہ مسکین نظر آتا ــــ تصنّع یا خوف کی بنا پر نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے گرُو (اُستاد) کو وہ اپنے گاؤں کی کسی دیوی یا دیوتا سے کم واجبُ التعظیم نہ سمجھتا ہو!

طلبا کی تقریباً تین نسلوں کو دیکھتا چلا آرہا ہوں کہ کہاں سے کہاں چلے جا رہے ہیں، تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن تعجّب نہیں ہوتا! اس لیے کہ آج کل کافی تعداد ایسے اساتذہ کی دیکھنے میں آتی ہے جو بالعموم غیر ذمّہ داری اور قابلِ اعتراض غیر منصبی سَرگرمیوں کو ذمّہ داری اور منصبی فرائض پر ترجیح دیتی ہے! اس پر ستم یہ کہ یہ اپنے آپ کو ہر جواب دہی سے بری بھی سمجھتے ہیں! اس لیے کہ اخلاقی تقاضوں کو پہلے سے نظر انداز کر چکے ہوتے ہیں ــــ

آج کل[1] کے اکثر مُعلّم دھوبی سے کم نہیں ہوتے! وہ شاگرد کو اس طرح دھوتے پچھاڑتے، اینٹھتے اور اس پہ استری کرتے ہیں جیسے دھوبی کرتا ہے۔ آپ نے بعض دھوبیوں کو دیکھا ہوگا اچھی طرح دھونے کی مشقت سے بچنے کے لیے اور مالک کو دھوکا دینے کے لیے اکثر سفید کپڑے میں نیل کا ہلکا سا رنگ دے دیتے ہیں۔ دھوبی کو اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ سر پر سے گھُما گھُما کر کپڑے کو پتھر پر پٹکتا یا موگری سے اس کی خبر لیتا اور خوب اینٹھ اینٹھ کر نچوڑتا اور اس کا لحاظ نہ کرتا کہ کپڑا نازک ہے یا مضبوط، رنگ گہرا ہے یا ہلکا، پائدار ہے یا ناپائدار۔ اس کا کیا حشر ہوگا، بٹن کہاں جائیں گے ــــ "دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں، فرق باقی رہے گا یا نہیں، لباس کی وضع قطع کیا ہو جائے گی؟ استری ٹھیک گرم ہے یا نہیں، ٹھنڈی

---

[1] نقوش۔ لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۴

استری کرنا چاہیے یا گرم ۔ بالکل اِسی طرح معلّم کو اس کی پروا نہیں کہ طالب علم کس قماش کا ہے اس پر کیا رنگ چڑھا ہوا ہے، اس کے دل و دماغ کا کیا عالم ہے ۔ کس فضا میں اُس نے آنکھ کھولی ہے ـــــ معلّم تو اُسے دے دے مارتا ہے اور بھُرکس نکال دیتا ہے ۔ وُہ طالب علم کی استعداد، اُس کے میلانات، ولولوں اور اس کی الجھنوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ وُہ ان سے اپنی نااہلی کا انتقام لیتا ہے اپنے تراشیدہ بتوں کا پجاری بنا نا یا اپنے ناکام خُداؤں کی بندگی کرانا چاہتا ہے چنانچہ یہ سارے مرحلے طے کر کے طالب علم دنیا کے بازار یا گاہک کے ہاتھ میں آتا ہے تو اس کے ذہن و دماغ سب جواب دے چکے ہوتے ہیں ۔ اس پر جو رنگ چڑھا دیا گیا ہوتا ہے اور کلف دے کر اس پر جو بے تکی اور بے ٹکان استری کی ہوتی ہے۔ وُہ حوادث کے ایک ہی چھینٹے یا روزگار کی پہلی ہی گردش میں کچھ کا کچھ ہو جاتی ہے!

علم[1] کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں، جاننے پہچاننے کی ذمّہ داری بھی ہے ۔ جب تک کوئی معلّم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو اُس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیے ۔ آج کل دُنیا میں جو ہل چل، افراتفری یا بے دلی اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے اُس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں لیکن اچھے مُعلّم تقریباً ناپید ہیں جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے ۔ دُنیا میں ہر مرض کی تیر بہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی جائیں اگر اچھے اطبّا میسّر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرے کا موجب بن سکتی ہیں یہی حال علوم کا ہے!

(ایک طرف یہ حال ہے) دوسری طرف طلبہ[2] میں جو اساتذہ کی "روشن خیالی" "وسیع النظری" یا کردار کی خامی سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں "آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھُلا" کے انداز سے امتحان کے کمرے میں پرچہ کرنے بیٹھتے ہیں اور ہر مواخذے سے بے خطر، کتابوں یا پُرزے پرچیوں سے جوابات نقل کر کے، آس پاس والوں کی مدد یا دوسرے طرح طرح کے ناجائز ذرائع و وسائل سے اوّل درجے میں پاس

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۲۲

[2] فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۳ء، ۵۲

ہوتے ہیں اور وہ تمام فوائد حاصل کرتے ہیں جن کا مدار اوّل درجے میں کامیابی حاصل کرنے پر ہوتا ہے۔ اِس ناگفتہ صورتِ حال سے کون نہیں واقف ہے، شاید اسی سبب سے اس کا تدارک ضروری نہیں سمجھا جاتا!

گزشتہ زمانے میں نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجے کا انتظار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس سے اُن میں بے صبری، بے اعتمادی یا غیر ذمہ داری کے جذبات پیدا نہیں ہونے پاتے تھے۔ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچنے کا سب سے آسان اور زود اثر نسخہ یہ ہے کہ اُن کو جارحانہ بلکہ مجرمانہ اقدام کی دعوت دی جائے گزشتہ بیس پچیس سال سے اُن کو یہی راستہ دکھایا گیا ہے۔ اس میں — اشتراکیت، مذہبیت، قومیت سب نے حسبِ توفیق حصّہ لیا ہے۔ ظاہر ہے جہاں انقلاب کو دعوت دینے اور بغاوت کرنے کا اذنِ عام ہو وہاں ریاضت اور انتظار کو کون قابلِ التفات سمجھے گا جہاں محاسبہ ختم ہوا مجادلہ شروع ہو جائے گا![1]

(دراصل) انسان کی صالح و صحت مند زندگی کا مدار اِس پر ہے کہ اُس کے ہاں اقدار کی اہمیت کیا ہے اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ اُن میں استقلال ہو اور وُہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیر و زبر نہ ہوں۔ اقدار نتیجہ ہوتے ہیں مدتوں کے تجربے اور ریاضت کا — زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدار وہی کام کرتے ہیں جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں آج سے پہلے زندگی میں وُہ "مرکز گریز" سُرعت اور شدت نہیں تھی جو اب ہے اور یہ آئی ہے عقل چکرا دینے والی اس صدی کی اُن ایجادات سے جنہوں نے زندگی کی آنے والی صدیوں کو مہینوں اور ہفتوں میں سمیٹنا شروع کر دیا ہے مستقبل کو حال میں کھینچ لانے کی مدت جتنی مختصر کرتے جائیں گے اُتنی ہی جلد حال، ماضی میں منتقل ہوتا رہے گا اور ماضی کی قدر و قیمت کم ہوتی جائے گی۔ کسی ماضی کی اہمیت کا مدار محض اس کے ماضی ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ کس حد تک وُہ حال اور مستقبل کی صحیح اور صحت مند رہبری

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۰۴

[2] ہم نفسان رفتہ، ۷۹

کر سکتا ہے ۔ حال و مستقبل کی اہمیت اِس بنا پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اِس لیے اُصولاً یا کُلیتہً ماضی سے رُو گردانی نہیں کر سکتے ۔ جہاں اور جب یہ صورت حال ہوگی وہاں زندگی میں اختلال راہ پائے گا اور عیر یقینی بڑھے گی آج کل ہم اِسی دَور سے گزُر رہے ہیں ۔۔۔

اُس زمانے میں تفریحی تقریبیں کم تھیں ۔ تفریح و تفنن کے تقاضے بندھے ٹکے چند تیج تیوہار یا شادی اور ولادت وغیرہ منا کر پورے کر لیا کرتے تھے ۔ پورب کے اضلاع میں برسات کے موسم میں ایک تیوھار منایا جاتا تھا جس کو پچیاں (ناگ پنچی) کہتے تھے ۔ ناگ پنچی تو آج بھی منائی جاتی ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس تقریب کی شکل میں بھی منائی جاتی ہے یا نہیں ، جس کا ذکر کرنے جا رہا ہوں

برسات کا زمانہ ہوتا ۔ کسانوں کے اس دیس میں بارش شباب پر ہوتی تو کس پر شباب نہ ہوتا ! کسان کھیتی باڑی کے کاموں سے فارغ ہوتے ...... گاؤں کے نِنا ور پُرانے درختوں پر جو معلوم نہیں کب سے دیہات کے سیدھے سادے باشندوں کے اعتقاد و اعتبار کی علامت (symbol) ہوتے جھولے پڑے ہوئے [1] کام کاج سے فارغ ہو کر رات کو عورتیں ان پر جھولتی اور گانے گاتیں ۔ یہ گانے تال و سُر کے اعتبار سے شاید اِتنے مکمل نہ ہوتے جتنا ان میں گانے والیوں کی فطری معصوم اُمنگیں اور موسم و مقام کی روح " اہتزاز " کرتی ہوتی ۔۔۔ ہر نشیب الماس سے لبریز اور ہر فراز زمرد سے آراستہ ۔ اناج سستا تھا ، عاشقی چنگی پڑتی تھی !

گاؤں اور آس پاس کے نوخیز لڑکے اور نوجوان کشتی لڑنے کے لیے جمع ہوتے ۔ جیسے زور آزمائی کا سالانہ ٹورنمنٹ ہوتا ہو ۔۔۔ اس کے لیے مُدت الاَیام سے وُہ جگہ مُعین ہوتی جو کسی نہ کسی اعتبار سے مُتبرک سمجھی جاتی ۔۔ مُقابلہ کرنے والوں کا سجل اور پیڈ ڈول جسم [2] بُشرے سے طاقت اور شرافت دونوں کا اظہار ۔۔۔

---

[1] آشفتہ بیانی میری ، ۱۰۵
[2] فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۳ ، ۵۳

ایسا معلوم ہوتا جیسے مرد ہونا دنیا کی سب سے بڑی نعمت اور سب سے بڑا حسن ہو۔ ایک مختصر سی دھوتی کمر سے لپیٹے ہوئے۔ سب جمع ہو جاتے تو اکھاڑے کی مینڈ پر بیٹھے ہوئے گبڑے اُستاد یا خلیفہ سے اجازت طلب کرتے کہ اکھاڑا کھودنا شروع کر دیا جائے ــــ وہ کہتے "ہاں بیٹا بسم اللہ کرو" سب کے سب کمر سے دھوتیاں الگ پھینک دیتے۔ رنگ رنگ کے لنگوٹ بندھے ہوتے، جسم میں پوست کی طرح پیوست! (افسوس ہے اُس زمانے میں ایسے موقعوں پر دل بڑھانے گھٹانے کے لیے جواں سال "آراستہ پیراستہ" بے تکلف خواتین موجود نہ ہوتیں ورنہ ان کے بارے میں جھوٹ سچ اس طرح کی کچھ باتیں ضرور لکھتا جس سے ناظرین اپنے سے بھی خوش ہوتے، مجھ سے بھی اور فن و فسانے میں بھی جان پڑ جاتی ــــ)

جیساکہ بیان کر آیا ہوں ــــ اُس زمانے میں تقریبیں بہت کم ہُوا کرتی تھیں۔ کبھی ایسا موقع آجاتا تو اُس کو مُنانے میں اُمیر غریب چھوٹے بڑے سبھی شوق سے شریک ہوتے ــــ پچھیاں کی کشتی دیکھنے سب کے ساتھ میں بھی پہنچا۔ اسکول کا وہ شریر و سرکش لڑکا بھی موجود تھا۔ دیکھ کر کوفت سی ہوئی لیکن اس پر تعجب ہوا کہ اُس کے ماں باپ ساتھ تھے۔ دونوں بڑے زبوں حال، عورت کے ہاتھ میں ایک دونا تھا جس میں کچھ بتاشے تھے۔ اکھاڑا کھُد چکا تو ماں باپ لڑکے کا ہاتھ تھامے ہوئے خلیفہ کے قریب جا کر مُؤدب کھڑے ہو گئے جو اکھاڑے کے حاشیے پر بیٹھے ہوئے تمام کارروائی اس غور سے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی ماہر فن مکموہن لائن کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہا ہو ــــ

ماں نے دونا خلیفہ کے سامنے رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر اپنی زبان میں بولی جس کا مفہوم یہ تھا خلیفہ جی یہ ہمارا اکلوتا لڑکا ہے بُرے راستے پر پڑ گیا ہے۔ نہ پڑھنے لکھنے میں جی لگتا ہے نہ کھیتی باڑی کا کام دیکھتا ہے۔ اِس سے تمام گاؤں پناہ مانگتا

ل فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۳ء، ۵۵

ہے ۔ بڑی توبہ تلاّ مچی رہتی ہے ۔ برادری میں مُنہ دکھانے کے لائق نہیں رہی ہم پر دیا کرو اور اس کے لنگوٹا باندھ دو ۔ پاس ہی باپ سر جُھکائے کھڑا رہا جیسے عورت کی فریاد کی تصدیق اور ہمنوائی کر رہا ہو ۔

خلیفہ سوچ میں پڑ گئے ۔ تھوڑی دیر میں چونکے ، باپ سے مخاطب ہو کر بولے : کیوں رے تیری کیا مرضی ہے ، باندھ دوں ؟ اُس نے کہا : ہاں ، خلیفہ بڑی کرپا ہوگی ۔ خلیفہ پر جیسے جلال طاری ہو گیا ہو ۔ لڑکے کو پاس بُلایا ، بولے : کیوں بے ، یہ تیرے ماں باپ ہیں ، اُس نے کہا ! ہاں ـــ پوچھا : ماں نے جو تیری شکایت کی ہے اُسے مانتا ہے ۔ لڑکے کی جیسے گھگی بندھ گئی ہو ۔ اُس نے پھر کہا ! ہاں ۔ اب خلیفہ تمام جوانوں کو مخاطب کر کے بولے ! کیوں سُن لیا قصہ ، تو پھر باندھ دوں اُس کے لنگوٹا ؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا : ہاں خلیفہ یہ کام تو ہو جانا چاہیے ۔

خلیفہ کمر پہ ہاتھ دے کر مشکل سے کھڑے ہوئے پھر جیسے اُن میں کوئی غیر معمولی توانائی آ گئی ہو ماں سے بولے : لا لنگوٹا ـــ اُس نے دے دیا ـــ خلیفہ ذرا دیر تک آنکھ بند کر کے بد بداتے رہے ۔ پھر لڑکے پر دم کیا اور لنگوٹ باندھ دیا ـــ اتنے دنوں بعد آج اُس سین کا تصوّر کرتا ہوں تو یقین سے کہہ سکتا ہوں خلیفہ نے نہ کوئی آیت پڑھی ہوگی نہ اشلوک ۔ وُہ دونوں سے قطعاً بیگانہ نظر آتے تھے ! مجمع میں جیسے اُمید و یقین کی لہر دوڑ گئی ہو ۔ خلیفہ اکھاڑے کے وسط میں آ گئے لڑکے کے بازو اور گردن پہ اکھاڑے کی مٹی لگائی اور خم ٹھونک کر لڑکے کو ہلکی سی ایک گردنیا دی اور بولے : دیکھ بے لنگوٹے کی لاج رکھنا ۔ پھر بتاشے کا چورا کر کے اُس کے منہ میں دیا ، بقیہ کو چٹکی سے اِدھر اُدھر بچوں میں تقسیم کر دیا ۔ سب نے ماں باپ کو مبارک باد دی ۔ خلیفہ نے لڑکے کی پیٹھ ٹھونک کر ماں باپ کے سپرد کر دیا اس کے بعد کشتی کا پروگرام شروع ہو گیا ۔ ہر جوڑ پہلے خلیفہ کے پاس آتی ۔ اجازت مانگتی اور اکھاڑے میں زور آزمائی شروع کر دیتی ۔

خلیفہ بھونس ہو چکے تھے لیکن کشتی لڑنے والوں کے داؤں پیچ کو اس عقابی

نظر سے دیکھتے رہتے جیسے المپکس کا کوئی ریفری فٹ بال یا ہاکی کے کھیل اور کھلاڑیوں پر نظر رکھتا ہو۔ جہاں کسی کو فن یا اخلاق کی صراطِ مستقیم سے ہٹتے دیکھا ریفری کی سیٹی کے بجائے اِس طور پر کڑکتے کہ زور آزما جہاں کے تہاں ٹھہر جاتے۔ غلطی کرنے والے کو للکارتے اور صحیح طریقہ بتا کر کچھ دشنامِ زیرلبی کے ساتھ جس کا شور د غلطی کرنے والا اور خود بھی ہوتے، خاموش ہو جاتے۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہونے اور اندھیرا پھیلنے لگتا۔ کشتی لڑنے والے خلیفہ کا پاؤں چھو چھو کر اُن کی دعاؤں کی روشنی میں اپنے اپنے گھروں کو سدھارتے اور مجمع منتشر ہو جاتا۔

دوسرے دن اسکول گیا تو لڑکے کو دیکھا جیسے کایا پلٹ گئی ہو۔ ہر ایک سے انکسار اور محبت سے ملتا۔ ہر خدمت اور مدد کے لیے آمادہ۔ بات چیت، چلنے پھرنے، کام کاج اور پڑھنے لکھنے میں معصوم اور باحیا نظر آیا۔ گزشتہ شام کی لنگوٹ بندی کا واقعہ یاد تھا لیکن اِس رسم کو اس شیطان کے طور طریقوں سے ربط دینے کی طرف ذہن نہ گیا۔ ایک موقع پر سینیئر طلبا کو آپس میں گفتگو کرتے سُنا کہ بچّا بہت بڑھ چلے تھے آخر لنگوٹ بندھوا دیا گیا نہ ــــ پھر بھی میں نہ سمجھ پایا کہ لنگوٹ بندھنے اور شیطنت سے باز رہنے کا ایک دوسرے سے تعلق کیا تھا۔ اِس لیے اُس کے یک لخت بدلے ہوئے طور طریقوں پر حیران ہی رہا۔

دن رات اور ماہ و سال بدلتے گزرتے رہے اور اپنی مُدت ہو گئی کہ یہ واقعہ ذہن سے بالکل اُتر گیا ــــ اتفاق سے ایک دن ایک غیر معروف سے ریلوے اسٹیشن پر ملاقات ہو گئی۔ سامنے آکر اُس نے سلام کیا۔ میں پہچان نہ سکا اور اپنی ندامت کا اظہار کیا ــــ مُسکرا کر بولا: اُسکول کے وہ دن بھول گئے اور پچیّاں کی وہ تقریب یاد نہ رہی جب میرے لنگوٹ باندھا گیا تھا۔ آپ تو تماشہ دیکھنے آئے تھے چشم زدن میں سارے واقعات یاد آ گئے۔ اُس میں ایک ایسی شریفانہ کشش تھی کہ بے اختیار اُس سے لپٹ گیا اور پوچھ بیٹھا: کیوں بھئی، وہ کیا بات تھی کہ تم رات بھر میں شیطان سے

لے نکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۳ء، ۵۷

شریف آدمی بن گئے؟

اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں اور گلا رُندھ گیا، بولا: وُہ دن پچیّاں کا تھا۔ میری شرارتوں سے ماں باپ ہی نہیں سارا گاؤں تنگ آگیا تھا — گاؤں کے مکھیا نے ماں باپ کو صلاح دی کہ پچیّاں کے دن خلیفہ سے اکھاڑے میں میرے لنگوٹ بندھوادیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا — مَیں نے کہا: اِس سے کیا ہوتا ہے۔ اُس نے کہا: آپ نہیں جانتے ہمارے گاؤں کا بڑا پرانا دستور تھا کہ پچیّاں کے دن خلیفہ جس کے لنگوٹ باندھ دیں اُس کی مجال نہیں کہ پھر وُہ کوئی بات بُری کرے ورنہ دوسرے جنم میں بڑا کشٹ اُٹھانا پڑتا ہے۔ اُس کے اِس کہنے پر مجھے تعجّب ضرور ہوا لیکن اِس سے زیادہ تعجب اِس پر رہا اور اَب بھی ہے کہ اُس نے پھر کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس کو شریفانہ اور مردانہ نہ کہا جا سکے۔

چند سال بعد میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ میں داخل ہوگیا — کالج یونیورسٹی بنا — اپنے زمانۂ طالب علمی تک کالج کا الحاق الٰہ آباد یونیورسٹی سے تھا — ڈگریاں لینے الٰہ آباد جانا پڑتا کنووکیشن کی تقریب کتنی شاندار و پُروقار ہوتی — وائس چانسلر ڈگری دیتے وقت یہ ذمّہ داری عائد کرتے کہ: "مَیں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنے آپ کو اِس سَند کا اہل ثابت کرتے رہیں گے"

یہ فقرہ اور ڈگری پانے والوں کی طرف سے اِس کا خاموش "اقرارِ صالح" یا احساسِ ذمّہ داری تمام عمر پیچھا کرتا رہا — اَب یہ تقریب یونیورسٹیوں ہی میں نہیں تقریباً تمام کالجوں میں ہونے لگی ہے — اِس درجہ عام اور رسمی ہو جانے کی وجہ سے اِس کے گرد تقدیس و تکریم کا جو مُنوّر ہالہ تھا، وُہ باقی نہیں رہا — نتیجہ یہ ہے کہ یہ بے وقعتی کالجوں سے یونیورسٹیوں میں پہنچ گئی ہے۔

میں نے[1] یونیورسٹی میں چوتھائی صدی کے لگ بھگ معلّمی کی ہے۔ اکابر کی تصانیف پڑھی ہیں اُن کی صحبتیں اُٹھائی ہیں۔ نوجوانوں کو سچ کی تلاش اور سچ کے اعلان

---

[1] خطبۂ صدارت (کل بہار ریاستی اُردو کانفرنس۔ پٹنہ)، مسلم یونیورسٹی میگزین ۱۹۵۲ء، صفحہ ۷۰

پر آمادہ کیا ہے — غالباً ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کا پہلا کنووکیشن مُنعقد ہوا۔ جب سے آج تک اِس قسم کی جتنی تقریبیں مُنعقد ہوئیں، اِسٹاف کا ایک رُکن ہونے کی حیثیت سے تقریباً سب میں شرکت کا اِتفاق ہوا — حسبِ معمول ڈگریاں دی اور پر پردہ اَخلاقی ضمانتیں لی جاتی رہیں کہ سند پانے والے سند کی حُرمت ملحوظ رکھیں گے۔ وقت کی بعید شخصیتیں اخلاقِ حسنہ اور مسائلِ مہمہ پر خطبات دیتی رہیں اور اُمید کی جاتی رہی کہ یونیورسٹی کے یہ نوجوان مُلک و قوم کی بہترین متاع ثابت ہوں گے۔ عربی فارسی یا دیگر علومِ شرقیہ کی دَرس گاہوں میں دستار بندی کے جلسوں میں شریک ہونے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، لیکن گمان یہی ہے کہ یہ تقریبیں وہاں بھی اسی نہج پر ہوتی ہوں گی — لیکن زیادہ تر دیکھنے میں یہ آیا کہ سَند یافتوں میں بحیثیتِ مجموعی سیرت کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ جیسے طالب علمی یا نوجوانی کسی زہریلے مادّے (وائرس) کا شکار ہو جس کے ازالے کی یا تو ضرورت نہ سمجھی جاتی ہو یا یہ وائرس ہی کچھ ایسا ہو جو میڈیکل سائنس کے قابو میں نہ آتا ہو۔

میں نہ حکیم نہ عطّائی نہ لیڈر — ممکن ہے اِن کا خُلاصہ ہوں اکثر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہر ۔ ۔ ۔ ۔ بستی کا صرف ایک سینما نوجوان لڑکے لڑکیوں کے اخلاق و عادات کو ایک دن میں جتنا بگاڑ دیتا ہے آس پاس کی تمام تعلیم گاہیں مل کر اُن کو ایک سال میں راہِ راست پر نہیں لاسکتیں۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کسی نہ کسی خوبصورت علمی یا تہذیبی نام سے سینما اور تھیئٹر کے مُثنّیٰ خود اِن درس گاہوں میں موجود ہوں، اس طرح کی سرگرمیوں کو سَراہا نہ جاتا ہو اور ان کو فروغ دینے میں ہمارے بڑے سے بڑے لیڈروں کا ہاتھ نہ ہو۔

اِنسان کے حیوانی خصائل کو قابو میں رکھنا۔ تعلیم و تربیت و تہذیب کا اوّلین مقصد ہے اور ان خصائل کو ڈھیل دینا بزدلی، حماقت اور شرارتِ نفس۔ اِس سارے فتنہ و فساد کا سبب جن میں ہم مُبتلا ہیں نہ اتنا سینما ہے نہ تعلیم گاہیں جتنا یہ کہ ہم پر

لہ فکر و نظر (علی گڑھ)، اکتوبر ۱۹۶۳، ۵۸

معاشرے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے یا ہم اس کے احتساب سے آزاد ہو گئے ہیں۔
کبھی کبھی تو اِس طرح کا خیال دل میں گزرتا ہے کہ جس طرح اگلے زمانے میں (جہاں تہاں آج بھی) ملک کے اندر بے اطمینانی یا بدامنی کے آثار پیدا ہونے لگتے تو لوگوں کا ذہن دوسری طرف منتقل کر دینے کے لیے حکومتیں کوئی نئی مہم تصنیف کر دیا کرتی تھیں، اُسی طرح آج کل تعلیم یافتہ بے روزگاروں یا نوجوان طلبہ و طالبات کو اپنے مستقبل پر غور کرنے اور صورتِ حال کو بدل دینے کے اِرادے سے باز رکھنے کے لیے طرح طرح کی تفریحی مسکرات اور تخریبی نعرے و نفیر فراہم کر دیا کرتی ہیں ....
بہر حال ہم ان دنوں ایک عام ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں جس نے ہماری صحیح قوتِ فیصلہ کو معطّل و متزلزل کر رکھا ہے اور اس کا مداوا نہ شراب ہے، نہ افیون، نہ کشت و خون!

یہ باتیں تو خوامخواہ بیچ میں آگئیں۔ ذہن ایک بار پھر اُس عہد کی طرف پلٹتا ہے جب ایک ناقابلِ التفات دیہات میں ایک کُبڑے ازکار رفتہ بڈھے نے ایک معمولی سی تقریب میں ایک شریر اور بدلگام لڑکے یا نوجوان کو چار پانچ بتاشے پر لنگوٹ باندھ دیا تھا اور ڈانٹ کر کہہ دیا کہ دیکھ اس لنگوٹ کی لاج رکھنا، جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ تمام عمر کے لیے اِنسان بن گیا ــــ اِس لنگوٹ کی لاج کی کیا نوعیت تھی اس کی تشریح و تجزیہ کی ایسی کچھ ضرورت نہیں، اِتنا البتہ معلوم ہے کہ وہ سر پھرا لڑکا صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹا اور اُس نے اپنی ہی نہیں دوسروں کی زندگی کی لاج بھی تمام عمر رکھی .....
اُس اکھاڑے کا کُبڑا کوئی پیر پیغمبر یا مجذوب تو تھا نہیں کہ اس کی "نظرِ کیمیا اثر" نے یہ سب کر دکھایا ہو۔ اِس لیے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ اُس زمانے کی بھلی یا بُری سوسائٹی کا شکنجہ تھا جس نے افراد کے جوڑ جوڑ کو کس رکھا تھا، جس کے بندھن کا ویسا ہی یا شاید اس سے بھی زیادہ احترام کیا جاتا تھا جتنا خدا اور رسول کے احکام کو اپنے اُوپر واجب جانتے تھے۔ یہ اچھا تھا یا بُرا اس کا فیصلہ آزادیٔ فکر و عمل کے اِس دور میں کون کرے!

پچیاش ہوتی ہو یا نہیں —— ہر سال کنووکیشن ہوتے رہتے ہیں۔ ہزاروں روپلے صرف کر کے خیمے، شامیانے، قناتیں نصب کی جاتی ہیں۔ قیمتی فرش، قالین، صوفے، کرسیوں اور تازہ خوش نُما پھول پتیوں سے پنڈال کی آرائش کی جاتی ہے۔ اساتذہ، چپڑاسی، بیرے، مزدور، دن رات انتظام میں مصروف رہتے ہیں مائکروفون لگایا جاتا ہے۔ مشین کی کارکردگی کی طرف سے مطمئن ہونے اور کسل دور کرنے، آس پاس کے لوگوں کے ذوق کی تسکین اور جلسے کی تشہیر کے لیے دو چار فرسودہ فلمی گانے بھی نشر کر دیے جاتے ہیں۔ علم و فن کے یگانۂ روزگار یا سیاست، تجارت، امارت کے کسی امامِ وقت کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ یونیورسٹی کے اساتذہ طالب علم، شہر اور مضافات کے معززین، سفارت خانے کے نمائندوں، خواتین اور دوسرے اکابر کو اپنے "کلام بلاغت نظام" سے سرفراز فرمائیں۔ ڈائس پر اِدارے کے "حکامِ عالی مقام" طرح طرح کے بھاری بیش قیمت منصبی عباؤں میں ملبوس متمکن نظر آتے ہیں۔ قرآن خوانی سے جلسے کی کاروائی شروع کی جاتی ہے اور قومی یا کسی طرح کے ترانے پر جلسہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ سب ہوتا ہے۔ ہر جگہ ہوتا ہے اور کیا کیا اور نہیں ہوتا لیکن جن کے لیے یہ کیا جاتا ہے وہ فضیلت کی سند یا خلعت لے کر باہر نکلتے ہیں اور اُن کے اطوار کو دیکھتا ہوں تو ذہن بغیر ارادے کے اُس پچیاں ، گبڑے خلیفہ اور شیطان لڑکے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے —— اور اب کیا کچھ نہیں کیا جاتا لیکن ہوتا وہ ہے جو کسی طرح قابلِ فخر نہیں ....

پھر یہ خیال آنے لگتا ہے کہ آج مُلک کے جتنے اور جیسے چھوٹے بڑے عہدیدار ہیں اُن سے کس اہتمام سے کیسی عظیم اور ذمہ دار شخصیتوں اور جماعتوں کی موجودگی میں عہدے کی ذمہ داریوں سے بطریقِ احسن عہدہ برا ہونے کا کُھلم کُھلا حلف لیا جاتا ہے اور اس رسم کی تکریم و تقدیس کا اشتہار کس شدّ و مد سے دیا جاتا ہے لیکن کون کس

ؔ فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۳ء ، ۶۱

حد تک اِس آزمائش میں پورا اُترتا ہے وہ بھی کوئی راز نہیں! کم سے کم اُن سے تو نہیں جن سے حلف لیا جاتا ہے ــــ

ایک کنووکیشن میں شریک ہوکر گھر واپس آرہا تھا - تھوڑی ہی دیر پہلے جلسہ ختم ہوا تھا - اِس لیے سڑک پر بڑا ہجوم تھا - چار چار طالب علم سائیکلوں پر سوار، دوش بدوش، شور مچاتے، خوش فعلیاں کرتے پوری سڑک پر قابض، اِس طرح رواں دواں تھے جیسے سڑک اور سائیکل دونوں اُنہیں کے لیے اور اِسی موقع کے لیے بنائی گئی تھیں اور کنووکیشن نہیں کسی سرکس یا نوٹنکی سے لُطف اندوز ہوکر اسی موڈ میں واپس جارہے تھے -

کچھ دیر تک ایک طرف کھڑا رہا کہ سائیکل سواروں اور قوم کے نونہالوں کا یہ سیلاب گُذر جائے تو دوسری سمت پہنچ کر گھر کا راستہ لوں - اِسی اثنا میں ایک اور اسکواڈ گزرا - پہلے سائیکل سوار نے صف کے آخری سوار کو بڑی بے تکلّفی سے باآواز بلند ایک بخس فقرے سے مُخاطب کیا اور اس طرح کی بات کہی جس کو دہرایا نہیں جا سکتا - مُخاطب نے اُپنے ساتھی سے بھی زیادہ بلند قہقہہ لگا کر ایک بخس تر کلمے سے جواب دیا - آس پاس کے سائیکل سواروں نے اِس خوش کلامی اور برجستہ گوئی پر اظہارِ تحسین کیا جیسے مشاعرہ میں کسی اچھے شعر یا شاعر کو داد دی جاتی ہو ــ

نوجوانوں کی یہ حرکت دیکھ کر شرمندگی اور غم سے بے قرار ہوگیا - یہ ایسے تھے کہ کسی تعلیم گاہ کی فضا درکنار کوئی صحت مند معاشرہ ان کو بازاروں اور گلی کوچوں میں بھی گھومنے پھرنے کی آزادی نہ دے گا - گزشتہ تقریباً پچاس سال میں شارع عام پر کہیں بھی طالب علموں کو اِس طرح بے باک اور بے جھجک ہوتے نہیں دیکھا تھا بالخصوص جب یہی نوجوان ذرا دیر پہلے علم و فضیلت کی سندیں لے کر اور اسی طرح کی باتیں سُن کر پنڈال سے باہر آئے تھے اور ان کے گرد و پیش، اُساتذہ، لڑکیوں، خواتین، سِن رسیدہ اشخاص اور کچھ تعجب نہیں خود ان نوجوانوں کے ماں باپ بھائی بہن سب کے سب ملے جُلے رہ نورد ہوں - تعلیم گاہوں میں ایسے ہی عناصر کے کرشمے، طرح

ے فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۳ء ۶۴

طرح کی شکلوں میں ہماری قومی زندگی کو زیر و زبر کرتے ہیں .....

ذہن ایک بار پھر پچاس سال پیچھے پھسل گیا - گاؤں میں پچیاں کی تقریب، لڑکے کا لایا جانا، جاہل بڈھے کبڑے خلیفہ کا چند کلمۂ زیرلبی کے ساتھ دہقانیوں کے ہجوم اور اُن کے مواجہہ میں لڑکے کو لنگوٹ باندھ دینا اور فہمائش کر دینا کہ لنگوٹ کی لاج رکھے اور دیکھتے دیکھتے ایک حیوان کا انسان بن جانا، یاد آگیا - پھر آج کے طلبہ نظر کے سامنے آئے ایسا محسوس ہوا جیسے دفعتاً ہم سب چھوٹے بڑے، امیر غریب، یکسر نالائق اور ننگے ہو گئے ہوں، لباس اور اخلاق دونوں اعتبار سے ..... اپنی جہالت، خود فریبی اور تنگ نظری کا بھی احساس ہوا کہ جس کو آزادیٔ افکار و اعمال کہتے ہیں، معیارِ زندگی کی ترقی اور بلندی جس کا نام ہے، جس کو فطرت سے قریب ہونا اور تربیت و تہذیب سے بہرہ مند ہونا بتایا جاتا ہے، اُن سب سے کس درجہ نابلد اور محروم ہوں - مگر کیا کروں، بدتمیزی و بداعمالی پر ایمان لانے کی مشق میں قبر سے قریب ہو گیا لیکن ترقی کے یہ تصوّرات حلق سے نیچے نہ اُترے!

لیکن[1] یہ واویلا بے محل و بے معنی ہے - زمانہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا - اُس کے ساتھ خوش و ناخوش ہمارا آپ کا بھی بدلتے رہنا لازمی ہے - ہر نسل کے طور طریق جداگانہ ہوتے ہیں - زندگی کو اِس مفروضے سے نہیں پرکھنا چاہیے کہ پہلے مسعود تھی، اَب نامسعود - زندگی اور زمانے کا جائزہ زندگی کے نت بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر لینا چاہیے - بہت سے اُمور میں آج کی زندگی پہلے کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اور بعض اعتبار سے نہیں بھی ہے - یہ دستور ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور ہمیشہ رہے گا -

(بے شک) ہم نے پہلے سے کہیں زیادہ فطرت کے بھیدوں اور اس کی دراز دستیوں پر قابو پالیا ہے اور "برعناصر حکمراں بودن خوش است" کا امتیاز حاصل کر چکے ہیں لیکن آبادی کی بے پناہ افراط، قطع مسافت کی روز افزوں سُرعت، ...

---

[1] فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۳ء، ۶۲

دُوری منزل کے تصوّر کو ناقابلِ التفات اور ایک دوسرے سے ملنے ان کے عادات اطوار ورسم و روایات سے متأثر ہونے کی خوبی وخرابی کے امکانات کو بہت بڑھا دیا ہے۔ حوصلے اور ہوس کا طوفانِ بے اماں، بجلنے اور جینے دینے کے پیچیدہ و صبر آزما مسائل کی گتھیاں، ایسے ایسے مراحل سامنے آرہے ہیں کہ ان سے عافیت و آبرو کے ساتھ گزر جانا محال ہوتا جا رہا ہے۔

"برعناصر حکمراں بودن خوش است" کا فارمولا اِن دُشواریوں کا حل نہیں پیش کرتا بلکہ اِن میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ عناصر پر قابو کے ساتھ ساتھ نفس و جبلت پر قابو پانا پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔ ان میں توازن پیدا کیے بغیر ہم عافیت و عزت کی زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ اس توازن کے قایم ہونے کا امکان قریب ہونے کے بجائے روز بروز دُور ہوتا جا رہا ہے۔ بایں ہمہ زندہ اور خوش رہنے کی فطری خواہش اور انسانیت کے تقاضے اِتنے قوی ہیں اور اجتماعی زندگی کو وسیع تر پیمانے پر بسر کرنے کی ضرورت اِتنی بڑھ گئی ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ انسان بالآخر فلاح کا راستہ دریافت کر کے رہے گا۔

○

۱۱

" اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما "

— فیضی

○

زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اکثر محسوس یہی ہوا کہ مُخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مُخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا۔ کوئی ہنستے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں تھوڑا بہت گنوار پَن بھی ہے کوئی بڑا عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت، تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی۔ اللہ والے ملے تو اُنھیں دُنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکرِ خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت اور عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن (مولانا سُلیمان اشرف) مرحوم کی شخصیت اِتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ اُن کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہُوا کہ فلاں جگہ کمی ہے جسے پورا کرنے کے لیے اور کو ڈھونڈنا چاہیے۔

میرا اُن کا بیس بائیس سال سے ساتھ تھا۔ پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں نووارد کمسن نیم رُس طالب علم تھا، جب اُن کا ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا دُوسروں کے نزدیک نہ سہی، اپنے نزدیک سہی۔ مَیں نے بھی اِس مدّت میں بہت کچھ دیکھا سُنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں

لہ گنج ہائے گراں مایہ ص ۲۷

لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے جو سلوک مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا۔ اُنھوں نے اپنی خداداد ذہانت و اخلاص سے ہمیشہ وُہ سطح قائم رکھی جس کو مَیں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مُطابق پایا۔ مولانا کی صحبت سے جب کبھی اُٹھتا تو معلوم ہوتا کہ مَیں نے کوئی نئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھوتا جذبہ پیدا ہوگیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو اُن کی صحبت سے ہشاش بشاش اُٹھا۔ رنج یا غصّہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہوگیا۔ خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اُٹھا جو شاید مُدتوں کے مُطالعے یا مشاہدے سے حاصل نہ ہو سکتے۔[1]

میرا پہلا مکان (اُن کی اقامت گاہ) "دو منزلہ" سے بہت قریب تھا.......
گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا اور طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی۔ کبھی کبھی دروازے سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے چبوترے پر لمبی کُشادہ آستینوں کا ململ کا سپید کُرتہ پہنے........
چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی۔ سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گنگنا رہے ہوں گے، اگر چلا جاؤں گا تو وہ اس طور سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو جائے گی، بس اتنا ہی احساس میری تسکینِ قلب کے لیے کافی ہوتا۔ مَیں مکان کے اندر آجاتا اور دُعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولانا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر اُن کی شفقت، مرحمت اور لطافت سے جی سیر کر دوں!

مرحوم[2] جو چیز رکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی اور بہت دل کش ہوتی، بڑی قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی....
ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی..... ایک دن میں پہنچا تو بولے خوب آئے۔ گھن وہ عبا تو لانا، یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۳۵
[2] گنج ہائے گراں مایہ، ۳۸

مالِ غنیمت ہیں۔ عبا لائی گئی، بڑے شوق سے پہنا، بولے کیا رائے ہے۔ میں بہت قریب پہنچ کر دیکھنے لگا۔ بولے خیریت تو ہے اِس قدر انہماک کا اظہار کیوں کیا جارہا ہے؟ میں نے عرض کیا، کیا کہوں اس طرح کی چیز اُس دن جلسہ میں نواب مزمل اللہ خاں کو پہنے دیکھا تھا۔ اُن کے قریب تو جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آج آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے، اِس تختِ طاؤس کو ذرا چھو چپا بھی لوں بڑے زور سے ہنسے کہنے لگے: باز نہ آؤ گے، اچھا ایک پان بناؤ اور یہ تو بتاؤ وہ تمہارا یار ذاکر کہاں ہے بڑا مَرد آدمی ہے، ذرا صحبت اچھی نہیں ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں اِن دنوں صحت اچھی نہیں ہے! بولے یہ کیا، میں کہتا ہوں اُس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے۔ تم کہتے ہو، صحت اچھی نہیں! پھر آواز دی جمّا ذرا ایک طشتری میں رشید کے لیے پنڈی تو لانا![1]

بہت دنوں کی بات ہے میں کلاس میں لوائح جامی اور گلشنِ راز پڑھایا کرتا اُن میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے کبھی کبھی اپنی دقتیں لے کر ...... (مولانا سلیمان اشرف) مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بہت خوش ہوتے۔ کہتے بیٹھو، میں کہتا مولانا کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات ہیں جہاں اٹکتا ہوں فرمایا یہی تو مصیبت ہے تفصیل سے باتیں نہیں سنتے تھوڑا سا پا لیا اور بھاگ نکلے، طالب علم یہ نہیں کرتے۔ یہ کام اُٹھائی گیروں کا ہے پگڑیاں ہوں یا ڈگریاں سب اُٹھائی گیرے۔ علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے۔ میں نے کہا گھنٹہ ہونے والا ہے، آخر اُٹھائی گیروں پر بھی تو بُرا وقت آتا ہے۔ کہتے اچھا اچھا، بولو، پڑھو۔ میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ ہی میں روک دیتے کہتے معلوم ہے۔ پھر اس کی وضاحت کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں، قرآن پڑھ ڈالو۔ لوائح جامی اور گلشن راز کلاس میں پڑھا دو گے لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھے لوگوں کے مجمع میں اِن مباحث کو مت چھیڑنا۔ آگے تم جانو تمہارا کام اور ہاں ایک پان کھاتے

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۴۳

جاؤ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ جائے گی کہتے ٹھہرو ٹھہرو، پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے پڑھنے والے انتظار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ!

مرحوم علیل ہوئے تو روز بروز حالت گرتی ہی گئی ——— اس دوران عرصہ تک میں حاضر نہ ہو سکا .... جس شخص کو تندرستی، زندہ دلی، استقلال و استقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ چکا تھا اسے بے بس و ناتواں دیکھنا میرے بس کا نہ تھا (ایک روز)[۱] دل کڑا کر کے میں بھی حاضر ہوا .... کچھ دیر تک میں کمرہ میں مرحوم کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہا۔ حالت[۲] دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی .... میری وہ حالت تھی جب آدمی دعا نہیں مانگتا، شاید مانگ بھی نہیں سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعا مانگنا عبث ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جائے۔ ناممکن، ممکن ہو جائے۔ یہ خواہش دعا مانگنے سے بھی عبث ہے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ بات جتنی ناممکن ہے اُتنی ہی فطری بھی معلوم ہوتی ہے! میں چلا آیا اور پھر نہ گیا۔ دو دن بعد مولانا سلیمان اشرف صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میرا[۳] ان کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا، صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا لیکن کس سے کہوں اور کون سمجھے گا کہ اس رشتے میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لیے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست!!

بڑی گرمی[۴] پڑ رہی تھی۔ دُور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے، بہت تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا معلوم ہوا، جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لیے تھی آسیائے گردش ایام ایک آن کے لیے رُک سی گئی

---

[۱] گنج ہائے گراں مایہ، ۷۰ [۲] گنج ہائے گراں، ۷۱ [۳] گنج ہائے گراں، ۷۲

[۴] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۴۳ [۵] گنج ہائے گراں، ۱

لیکن فوراً ہی رواں ہوگئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا، نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کا جی ہوا، جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ بند کرکے لیٹ رہا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کرکے پلٹنے شروع کر دیے۔ طفلی کا زمانہ یاد آیا جب اقبال کے اشعار چٹپٹے کی دوستی کی طرح مزیدار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصوّر تھا کہ وُہ جو اشعار کہتے ہیں اُنھی میں رہتے بستے ہیں۔ اقبال کی صورت وہی ہوگی جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔ بہت اچھی سی، بہت چاہی جانے والی، جلیبی جادوگروں جیسی، کچھ عجیب سی!

(ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں حاضری کا ذکر یہیں کہیں پہلے کرچکا) ۱۹۳۰ء[۱] میں مَیں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہی دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلے میں علی گڑھ میں تشریف لائے۔ اُس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی مشکل سے باہر آیا۔ مَیں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رُک رُک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش مَیں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اُٹھانی پڑتی — ہائے، اُن کا وُہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجے میں فرمانا: "نہیں جی صدیقی صاحب کوئی بات نہیں۔ اَللہ اپنا فضل کرے گا، اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا، مایوس کیوں ہوتے ہو، مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے، اچھے مسلمان کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے —"

اس کے بعد دیر تک اِس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں اُن کی موجودگی میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ مَیں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اِس جہان سے اُٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں مبتلا رہ کر عالمِ بقا کو سُدھارے

---

[۱] گنجہائے گراں مایہ، ۱۸۲

کاش کسی وقت میں حاضرِ خدمت ہو کر اُن کے لیے وُہ کر سکتا جو اُنھوں نے میرے لیے کیا تھا، پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے اُن کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین دے سکتا تھا - وُہ خاصانِ بارگاہ سے تھے - اُن کا خدا سے خاص تعلق تھا لیکن اس بات سے طبعیت مطمئن نہیں ہوتی - مَیں خوب سمجھتا ہوں کہ گو معجزہ کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبت و خلوص میں اَب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں - دوسروں کی وُہ کون سی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے زائل نہیں کر سکتے -[1]

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور گیا - دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا - شاہی مسجد کے پائیں، بائیں سمیت اس مَردِ قلندر کو آسودہ خاک پایا - مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اُس اقبال کی آرام گاہ ہے ع

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے

اور : آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پُر اسرار پُر وقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اس درجہ اور اس قدر مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا - چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیے تھا جہاں اقبال کے تصوّر میں مزاحم ہونے والی کوئی چیز نہ ہوتی -[2]

اقبال زندہ تھے تو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اُن سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ اُن سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہو گی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے ولولوں کو بڑھائے گی - ذہن کی کچھ اُلجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال اُنھیں سُلجھا دیں گے کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لیے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے - کسی دن ڈاکٹر اقبال

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۸۸

[2] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۹۰

سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔

جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اُٹھ جانے کے سبب سب درہم برہم ہو گئے۔ اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ اُمید کہ اقبال جیسا رفیق و رہبر ملے گا جو اُن کی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا۔ ۱؎

میں ذرا کند ذہن اور صلح پسند واقع ہوا ہوں۔ معقول پسندی سے بڑی ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے کون نپٹے ــــــ مذہبی نقطۂ نظر میں یہ آسانی ہے کہ جب جی میں آیا خود جامے سے باہر ہو گئے اور جب جی چاہا کسی بھلے مانس کی پگڑی اُچھال دی۔

مذہبی لوگوں کے بارے میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں: "میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں ــ" وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُن کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابلِ قدر آزمائش ہے، بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیشِ نظر ہیں، وہ اس درجہ بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیوں کر دھوکا دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے، یقین ہو یا نہ ہو۔ اُن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات اُن بندوں کو ہمیشہ کے لیے منتقل کر دیے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو پڑھے

۱؎ گنج ہائے گراں مایہ، ۹۱ ۲؎ نقوش، لاہور شخصیات نمبر، جلد اوّل، ۳۱۸

بغیر عدالتِ مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔ ان میں بعض معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی اُن فرشتوں ہی کو دھوکا دے کر کاربراری کر لیں جو ان کا اعمالنامہ مرتب کرنے کے لیے کاندھوں پر بٹھا دیے گیے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مُقدّمہ جیت لیں گے!

مذہب[1] کا بیوپار کرنے والوں سے مَیں ذرا کم ہی یاد اللہ رکھتا ہوں۔ ایسے لوگوں کو مَیں نے بالعموم احساسِ کمتری کا شکار پایا اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ شرافت و شجاعت، درگزر اور دردمندی اور اِس طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح ہیں اکثر ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں اور اُن اخلاقی خرابیوں میں اُن کو مبتلا پایا جن سے مذہب نے روکا ہے۔

ہر مذہبی[2] آدمی، اخلاقی آدمی نہیں ہوتا۔ خود غرض یا ناواقف، مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں مقیّد رکھتے ہیں۔ اِسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علیحدہ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا اِس لیے کہ حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اِس کا آوردہ و پروردہ ہے۔ اخلاق، مذہب کی عملی شکل ہے مذہب سے علیحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا اُن لوگوں کا شیوہ ہے جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔ مذہب، اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب عورت بغیر شوہر ہے!

خود غرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ وقت گرفت سے بچنے کے لیے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں جس کی سرحد پھاند کر تہذیب کی قلمرو میں آجاتے ہیں، وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دور نہیں رہ جاتیں۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذہب کے تقاضوں سے بچنے یا مذہب کی بلندی سے اُترنے کے لیے جو زینے ہیں اُن میں پہلا

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۴۶ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۲۲

اخلاق، پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست، قومیت اور تجارت ہیں۔ مؤخر الذکر تینوں کا نامسعود اتحاد آج عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا آشوب ہے![1]

اکثر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لیے جس احساسِ ذمّہ داری اور احترامِ انسانیت کی ضرورت ہے۔ وُہ ایسے لوگ کیسے پورا کر سکتے ہیں، جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی ذمّہ داریوں کو بھی سمجھنے اور نباہنے کی توفیق نہیں رکھتے۔ دُنیا و عقبیٰ زمان و مکان کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف ہوں لیکن یہ دونوں انسانی زندگی ہی کے دو رُخ ہیں اور انسان کے نتائج اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے، اِس لیے ایک مسلمان کے لیے دنیا کا مرحلہ عقبیٰ سے بھی زیادہ سخت ہے اور جو شخص دُنیاوی ذمّہ داریوں سے خوش اُسلوبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، وُہ عقبیٰ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اِس بحث کو پھیلانا نہیں چاہتا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ اُدھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقے میں جس نا اہل کو نفع یا نمود کی کہیں گنجائش نہیں نکلتی وُہ اِس مقصد کے لیے مذہب کو آلہ بنا کر ملک و ملت کا محسن بن جاتا ہے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے، لیکن کس طرح اِن باتوں سے دور تھے، اِس کا خیال کرتا ہوں تو اس کی یاد سے دل تر و تازہ اور روح بالیدہ ہوتی ہے۔

مذہبی ہونے کا علمی و کتابی تصور واضح کرنے کے لیے خاص طرح کی لیاقت درکار ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ اَپنے طور پر پابندی کر پاتا ہو یا نہیں کوئی ایسی بات سُننا اور دیکھنا گوارا نہ کر سکے جو خُدا اور اس کے خلاف کسی کے منہ سے نکلے یا جس سے شعائرِ اسلام کی سبکی ہوتی ہو۔[2]

مذہب کے معاملے میں سیّد (سُلیمان ندوی) صاحب کا رویّہ نہایت شریفانہ دانشمندانہ اور عالمانہ تھا۔ . . . . اُنھوں نے اِسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت و حُرمت میں اَپنی بہترین صلاحیتیں بے دریغ صَرف کیں اور جہاں تک بَن پڑا،[3]

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۶۸ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۲۳ [3] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۷۸

مذہب کو خود غرض لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے نہیں دیا .... (اور) اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گزاروں کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی!

(مجھے[1]) سید صاحب سے ملنے اور اُن کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے، علی گڑھ آنا ہوتا تو ہمیشہ میرے ہاں قیام کرتے، میرا میرے بچوں کا میرے عزیزوں دوستوں کا بڑا خیال کرتے تھے، اتنا خیال کہ کبھی کبھی میں اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگتا۔

سید[2] صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا، وہ اُن کا علمی تبحر ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت بھی تھی۔ وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لیے کام میں نہیں لاتے تھے .... وہ علم ہی سے واقف نہ تھے، علم کی برگزیدگی کا بھی احساس رکھتے تھے اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ سید[3] صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے اُن پر ان کی نظر پیشہ وارانہ، نہ تھی محرمانہ تھی .... (انھوں) نے ہمیشہ بات متانت اور دیانت سے کہی، نپی تُلی کہی اور اس طرح کہی کہ ان کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی، جس پر انھوں نے بڑی محنت، قابلیت اور وقت صرف کیا تھا اور چاہتے تھے کہ اسے اُن لوگوں تک پہنچائیں جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، علم کا معلّم سے یہی تقاضا ہے!

سید[4] صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی، "سیرتِ شبلی" لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے وہ سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی کے سبب سے اتنی نہیں ہے، جتنی اُس شغف کی بنا پر ہے جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم استاد سے ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۹ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۳۲ [3] ہم نفسانِ رفتہ، ۳۳

[4] ہم نفسانِ رفتہ، ۳۵

مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا، یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں، سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے۔ باوصف اِس عقیدت کے[۱] سید صاحب کی شخصیت اور اُن کا اسلوبِ تحریر۔۔۔۔ شبلی سے مختلف ہے۔ شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے تخیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے۔۔۔ سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اِس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ اُن کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے! وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے اور محنت کرتے تھے، اتنا ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے رہتے۔

سیدؔ صاحب خود علامہ شبلی سے طبعاً (بھی) مختلف تھے۔ مَیں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا لیکن اُن کی تصانیف پڑھی ہیں، جن لوگوں نے اُن کو قریب سے دیکھا تھا، اُن سے ملا ہوں، خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا اُن سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہوں۔ علامہ شبلی جتنے ذہن اور جذباتی تھے (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ اُن میں تھا ان کی شاعری، ان کی نثر، اُن کے خطوط سب میں حسنِ طبیعت اور "سوزِ دروں" کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں اور دنیوی معاملات میں جس سوجھ بوجھ سے وُہ کام لیتے یا لے سکتے تھے، سیدؔ صاحب اُن۔۔۔۔ سے عاری تھے ـــــ تصانیف[۲] میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی، دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے، بحیثیت طالب علم مَیں شبلی سے متاثر ہوا، اور بحیثیت معلّم سیدؔ صاحب سے!

مجھے[۳] تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں، لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سنتا ہوں اس لیے کہ اِس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اُٹھا سکوں گا، اِن میں سے سیدؔ صاحب ایک تھے! سیدؔ صاحب تقریر

---

[۱] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۳۱ [۲] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۳۶ [۳] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۴۲
[۴] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۴۰

کرنے میں چہرہ باندھنے یعنی تمہید اُٹھانے یا کسی نہ کسی معذرت کے بیان کرنے میں مطلق وقت نہ صرف کرتے جیسا کہ عام طور پر پیشہ ور مقرّروں کا دستور ہے، کچھ گلے اور سینے کی تکالیف کچھ سفر کی صعوبت، کچھ ملک و ملّت کی ابتری یا اپنی نااہلی کا تذکرہ کیا، اس کے بعد تقریر شروع کی، سیّد صاحب اِس طرح کی باتیں نہ کرتے ۔۔ آواز[1] میں اُتار چڑھاؤ نہ ہوتا، چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے ہاتھ پاؤں نہ پٹکتے، نہ پھینکتے، کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہہ کر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شورِ تحسین اُٹھے، جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں ـــــ باتیں بڑی واضح کہتے، الفاظ و عبارت کی دھوم دھام نہ ہوتی ..... تقریر کرتے میں کہیں اٹکتے نہ تھے ۔ اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے اُلجھتے ہیں ۔ سیّد صاحب کی تقریروں میں شائد کبھی ایسا موقع آیا ہو' ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جسے وہ اطمینان و اعتماد سے دہراتے جا رہے ہوں ..... تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا ۔ سیّد[2] صاحب یقیناً مقرّروں کے اُس زمرہ میں نہیں آتے تھے جن کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے ۔ وہ تقریر کے فن دفسوں سے بے نیاز تھے لیکن اُن کی باتوں میں اثر ہوتا تھا (بڑا خلوص، بڑا وزن اور بڑی سادگی ہوتی تھی) اور (یہ) ذہن کے کسی نہ کسی حصے میں اُتر جاتی تھیں ۔

رات[3] میں میرے ہاں جب کھانا ختم ہو لیتا اور سیّد صاحب کے معتقدین اپنے گھروں کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی، کوئی اور نہ ہوتا اِس لیے سیّد صاحب سے بات کرنے میں ذرا بے تکلفی اور بے باکی کو بھی دخل دے جاتا، سیّد صاحب بڑی توجہ سے تمام باتیں سُنتے، کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لُطف کا، اور کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے!

ایک رات زیادہ دیر تک اِسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی ۔ یہ رات[4]

---

۱ ہم نفسانِ رفتہ، ۴۱ ۲ ہم نفسانِ رفتہ، ۴۲ ۳ ہم نفسانِ رفتہ، ۵۷
۴ ہم نفسانِ رفتہ، ۵۸

مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے۔ وقت زیادہ گزر گیا تھا اور سید صاحب تہجد کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا تو فرمانے لگے:

"رشید صاحب! شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد! زندگی کا بھی عجیب ڈھنگ ہے، جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انھیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آجاتا ہے۔ جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا، سیکھا، پڑھا، اب وہ برگ و بار لانے والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا! اس برگ و بار کا کیا ہوگا۔ جب سے تمدن کا آغاز ہوا اور جب تک دنیا کا یہ کارخانہ قائم رہے گا اس طرح کے کتنے حسرت ناک سانحے پیش آتے رہے ہیں اور رہیں گے!" میں گھبرا سا گیا، سید صاحب کے اس موڈ (ذہنی کیفیت) سے میں خود بچنا چاہتا تھا اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا، میں نے کہا سید صاحب! آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کون ایسا شریف اور صاحب علم و فن ہے جس کے دل میں نہ آئی ہو، عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مجھے ان کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے مقرب بندوں میں ہیں، آپ اس کا غم کیوں کریں آپ جتنا دے سکتے تھے، وہ نہ دے سکے، غم اُسے ہو جس نے ایسا ہونے نہ دیا، جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا آپ نے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزو مند رہے، جب آپ کو یا مجھے کار آمد و کار آفرین رکھنے کے بجائے معطل و معذول کر دیا گیا (موت واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہوا، زندگی کی مہم میں فتح ہماری ہی رہی!

سید صاحب مسکرائے لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا جتنا شاید میرے اظہار قابلیت، طلاقتِ لسانی پر، لیکن میں بھی نہ جھجکا.......

میں نے کہا سید صاحب آپ نے جو بات کہی وہ مجھ سے اُٹھائے نہیں اُٹھتی لیکن مجھے تو اس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا۔ فتح کرتے کرتے خشکی کا حصّہ ختم ہو کر سمندر آ گیا تو اُس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا اور کہا بارِ خدایا خشکی ختم ہو گئی، میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے، سیّد صاحب اللہ کے ساتھ اُس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے، اس کے بعد نام اللہ کا!

سیّد صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا، اَب جا کر آرام کیجیے، آج بڑی دیر ہو گئی۔[۱]

شکل و صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سیّد صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابلِ احترام تھی، اُن کو دیکھ اور پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، رُسوا نہ کریں گے، اور جب تک رہیں گے زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہو گی جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمّہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، اپنی ہی نہیں، ہماری ذمّہ داریوں کا احساس بھی!

سیّد صاحب پاکستان گئے تو مدتوں خبر نہ آئی ایک دن اخبار میں پڑھا کہ اُردو کے مسئلے پر تقریر کرنے کے دوران میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سیّد صاحب کو تکلیف پہنچائی، بڑا قلق ہوا۔ سیّد صاحب کے لیے یوں کہ کس منزلت کا آدمی کہاں جا کر کس بنا پر رُسوا ہوا اور طلبہ کے لیے یوں کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہو گی، اُس نے یہ سلوک سیّد صاحب سے کیا جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اِس صدی میں اتنی زیادہ اور اتنی گراں مایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں پھر علما کی رُسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سُنی تھی، طلبہ کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی، اَب تک طالب علم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا!! اگر ایک عالم کی موت عالَم کی موت ہے تو ایک عالِم کی بے حرمتی کو کیا کہیں گے؟[۲]

۱؎ ہم نفسان رفتہ، ۵۲

۲؎ ہم نفسان رفتہ، ۶۱

بعض[1] دوستوں، عزیزوں کی وفات ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیتا رہنا بے غیرتی معلوم ہوتا ہے، افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی رحلت کی خبر سُن کر اسی طرح کی بے غیرتی کا احساس ہوا! اِس موقع پر جزع و فزع، صبر و شکر، ایمان و یقین کے کتنے فقرے بے ارادہ یاد آتے ہیں لیکن کسی ایک کو لکھنے کا جی نہیں چاہتا ــــ خاکم بدہن! حادثہ اِتنا بڑا مَیں اتنا چھوٹا۔ توازن کیسے قائم رہے، خوشی میں کبھی توازن نہیں کھوتا، غم میں قائم نہیں رکھ سکتا اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، وُہ تو جانتا ہے اِس طرح کا غم مجھ ناتواں کے لیے کیسی بے پناہ آزمائش ہے!!

سوچتا[2] ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں کم و بیش چھ ماہ قیام کر کے ہمارے دلوں میں جب آپ لیے اِتنے پاکیزہ اور قابلِ احترام خیالات و جذبات پیدا کر لیے جو اِتنی کم مدت میں علی گڑھ میں آج تک کوئی اور نہ پیدا کر سکا تو اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جن میں رہ کر اور جن کے لیے اُنھوں نے تمام عمر کام کیا تعلیمی اور عملی ہی نہیں، معلوم نہیں کتنے اور کام! یہ بات اور زیادہ احترام اور اَچنبھے کی اُس وقت معلوم ہونے لگتی ہے جب ہم جانتے ہوں کہ علی گڑھ کے لوگ کسی سے "راضی و خوشنود" ہونے میں ذرا دیر لگاتے ہیں، بہ نسبت مَدراس اور نواحِ مَدراس کے مسلمانوں کے جو زیادہ سیدھے سادے اور بہت جلد عقیدت اور احسان مندی کے جذبات سے متاثر ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے یوں دفعتاً وفات پا جانے سے اُن پر کیا عالم گزرا ہوگا!

وُہ[3] ہم میں، کسی سے علم میں کم نہ تھے، عمل میں سب سے ممتاز تھے۔ وُہ ان علوم کے عالم باعمل تھے جن سے ہم میں بہت کم لوگ آشنا ہیں اور جن پر عمل کرنے والا شاید کوئی نہیں، یعنی دین اور اَخلاق کا علم!

علم[4] اور دین کے مطالبات ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر جس پابندی اور خوبصورتی سے پورے کیے وُہ بات مجھے کہیں اور کم نظر آئی۔ میری تقدیر کو بنانے میں اسلام

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۸۳ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۸۳ [3] ہم نفسانِ رفتہ، ۸۵

[4] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۷

کو بڑا دخل ہے، اِسلام کا جو تصور پیش کیا گیا ہے یا جو میری سمجھ میں آسکا ہے، اُس سے بڑا تصور انسان کے ذہن و تخیل میں نہیں آسکتا، انسان اور اُپنے شایانِ شان اس پیمانے پر صرف خدا سوچ سکتا تھا۔ باایں ہمہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہ ملا جس کو میں اُس اِسلام کا نمونہ پاتا جو میرے ذہن میں تھا۔ اِسلام ہی نہیں، مَیں ہر مذہب کا بڑا احترام کرتا ہوں اور اُپنے اس عقیدے کو اپنی بڑی جیت سمجھتا ہوں لیکن مجھے اچھے مذہبی آدمی نہ ملے۔ بیشتر یہی محسوس ہوا جیسے مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علاحدہ اور ممتاز سمجھتا ہو، جیسے اُس میں "برہمنیت" راہ پاگئی ہو اور وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھتا ہو لیکن وُہ اِتنی معمولی سی بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اگر وُہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے تو اُس کا مامور ہونا اُس کی آزمائش پہلے ہے، فضیلت بعد میں! فضیلت برہمن کے حصّے میں آزمائش شودر کے نصیبے میں آئے یہ کہیں اور ہوتا ہو تو ہو اِسلام میں نہیں ہوتا، مامورمن اللہ ہونے کی ذمہ داری لینا یوں بھی کوئی دانش مندی نہیں ہے!

اس گفتگو کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کیسے انسان اور کیسے مُسلمان تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا مسلمان ہوتا۔ اور یہ مَیں نے اس لیے کہا کہ تمام عمر بے شمار مسلمانوں سے ملنے اور اُن کو دور اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، کوئی مسلمان ایسا نہ ملا جس کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ایسا مُسلمان مَیں بھی ہوتا! اس کے ساتھ میں اس حقیقت کا بھی یہاں اعتراف کرتا ہوں کہ بہت ممکن ہے میرا سابقہ ایسے مسلمان سے اَب تک نہ ہوا ہو، ورنہ اَیسے مُسلمان بے شمار ہوں۔ ممکن ہے اِس کا سبب یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر عبدالحق نے بحیثیت انسان اور مسلمان مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہو، دوسرے اِس حد تک متاثر نہ ہوئے ہوں یہ سب صحیح ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مَیں ذاتی پسند اور ناپسند کو بہت بڑی حقیقت سمجھتا ہوں ... انقلابی حقیقت! مجھے تو یہاں تک محسوس ہوا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں شاید وُہ بھی ڈاکٹر عبدُالحق

جیسا انسان بننا پسند کرتے ہوں! اَچھے مسلمان اور اَچھے اِنسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اِتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لیے اکثر اِن میں امتیاز کرنا دُشوار ہو گیا ہے!

ڈاکٹر صاحب نے دین کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہ اپنے آپ سے کیا تھا نہ کسی دوسرے سے جیسا کہ ہم آپ اکثر کر لیا کرتے ہیں، یعنی عقائد اور اعمال کی ذمّہ داریوں سے بقدر ستّر فیصدی اپنے آپ کو مُستثنیٰ قرار دیے جانے کا ریزولیشن باختیارِ خود پاس کر دیتے ہیں، ستّر فیصدی غالباً یوں کہ مسلمانوں کو ہر نیکی کا اَجر عموماً ستّر گنا ہی ملتا ہے!

وُہ اِسلام کے بتائے ہوئے عقائد پر کامل یقین رکھتے تھے اور ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ان پر عامل تھے، بایں ہمہ وُہ اِتنے خوش مزاج، زود آمیز مخلص، ہوشمند اور ہمدرد تھے جیسا ہمارا آپ کا کوئی عزیز بے تکلف دوست وُہ کسی حال میں محتسب نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ سر سے پاؤں تک محب و مشفق تھے! جیسے اُن سے دور یا علیحدہ رہنا بدنصیبی اَور اُن کا اعتبار حاصل نہ کرنا محرومی ہو!!

کہا کرتے تھے کہ مجھے نہ کام کھلتا ہے نہ صاحبِ غرض! کام کا نہ کھلنا تو سمجھ میں آتا ہے اِس لیے کہ صحت اَور سکون مُیسّر ہو تو کام کرنا اور کرتے رہنا زندگی کے نعائم میں سے ہے، لیکن یہ ثباتِ ہوش و حواس جس پر صاحبِ غرض نہ کھلتا ہو اس کو مَیں اولیا اللہ کے طبقے میں جگہ دیتا ہوں۔ صاحبِ غرض سے یہاں میری مراد خود غرض سے ہے اہلِ حاجت سے نہیں!

ایسے لوگ ہم میں آپ میں اکثر ملیں گے جو فریضۂ مذہبی ادا کرنے کے لیے اس طور پر تیار ہوتے ہیں گویا اُن کا عبادتِ الٰہی کے لیے آمادہ ہونا ہی دوسروں پر عذابِ الٰہی نازل ہونے کا موجب ہو گا۔ عبادتِ الٰہی یہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان

ل ہم نفسانِ رفتہ، ۱۷ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ل گنج ہائے گراں مایہ، ۱۰۸

کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ خدا اُن کی عبادت کو اپنی تمجید و تسبیح نہ سمجھے بلکہ غافلوں کے خلاف مقدس چغلی سمجھ لے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں کو سزا دے۔ یہ جنت میں "سرکاری گواہ" بن کر جانا زیادہ پسند کرتے ہیں ——— مولانا (ابوبکر محمد شیث) مرحوم ایسے نہ تھے۔ انھوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہ بنایا۔[1]

مرحومؒ (مولانا ابوبکر محمد شیث) کی سیرت و شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے اور نہ دوسرا متجاوز ہو سکتا تھا۔ مرحوم کو خدا نے ایسا متوازن دل و دماغ دیا تھا اور اُن کی شخصیت اتنی دلآویز تھی کہ اُن کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور نہ انھوں نے اپنے طور طریقوں سے کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظمِ دینیات یا عالمِ دین تھے!!

مرحومؒ کو عام طور پر گفتگو کرتے یا رہتے سہتے دیکھ کر کسی کو مشکل یہ گمان ہوتا کہ مرحوم کا علم کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر لکھنے پڑھنے ہی کا شغل رکھتے ہیں، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو علومِ جدیدہ سے پورے طور پر آشنا ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس اَمر کا پتہ تو لگا ہی سکتے ہیں کہ کس مبحث میں کس کا کون سا پہلو کمزور رہے۔

مَیں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ مولانا مذہبی نقطۂ نظر اس انداز سے پیش کر رہے ہیں گویا وہ خالص مذہبی نقطہ نظر نہ تھا بلکہ ان کے مدنظر ہمارا ہی اصولِ بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے مولانا ہمیں لوگوں میں سے ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں وُہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرتے جو موجودہ دور میں مثالِ مبہمہ نہیں بلکہ مسلّمہ فیصلے تھے جن پر تجرباتِ جدیدہ کی مہرِ استنادگی ہوئی تھی۔[2]

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۹۴ — [2] گنج ہائے گراں مایہ، ۹۷

مولانا ابوبکرؒ[1] میرے ہم وطن تھے۔ کیا بتاؤں کہ میں اُن کو کب سے جانتا ہوں۔ اُن کی شخصی خوبیوں کو بچشمِ خود دیکھا۔ اُن کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے بزرگوں سے سنی، کتابوں میں پڑھی اور دلوں میں پائی۔

ایک[2] دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو پوچھتے کہاں تھے؟ کیسے ہو؟؟ مسکرا کر محبت ور دوستی کے لہجے میں شفقت کے انداز سے دوستوں کے بارے میں لطف و مرحمت کا کوئی جملہ کہتے کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فرزانگی یا شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ و زندگی کی عارضی یا مسلسل مکروہات یا سیرت کے بعض داغ دھبے دھل جاتے یا مدھم پڑ جاتے اور محسوس ہونے لگتا کہ شرافت و اولوالعزمی خلق و مرحمت دنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑی آسودگیاں ہیں۔

مرحومؒ[3] کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوش دلی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا خاصہ یہ رہے کہ وہ اپنا یا دوسرے کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہیں گے۔ کبھی مصروفیت سے، کبھی ناسازیٔ طبع سے، کبھی اپنے نقصان سے، کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانے سے پھر کر چکیں گے تو احسان منوانے یا اپنی اہمیت و عظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو ادنیٰ سا کام کریں گے، جس کے کرنے کا اُن کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طور پر کریں گے گویا کوئی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں یا اُن پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مرحوم اس کے بالکل برعکس تھے معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا، وہ اس کو اس طور پر کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پر سانس لیتے ہیں بغیر کسی قسم کا اعلان کیے اور بغیر کسی معاوضہ کی توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۹۲ [2] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۰۱ [3] گنج ہائے گراں مایہ، ۹۴

گلے کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا وہی جس کا یقین تھا، ایسا یقین جو ٹالے نہ ٹلے، بہلانے کی حدود سے باہر ہو چکا تھا۔ سورج[1] ڈوبنے والا ہو اور موت کے پرندے دم بدم بڑھنے والی نوبہ نو اور تہہ بہ تہہ تاریکی میں چیخ چیخ اور جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہے ہوں، دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے مد وجزر اُبھرتے مٹتے رہتے ہوں گے لیکن لبوں پر شگفتگی، آواز میں اُمید و استقامت اور آنکھوں میں روشنی جھلکتی رہی ہراس ونا اُمیدی کا کوئی اثر نہیں، تیمارداروں کو تھپکتے، ملنے والوں کو تسکین دیتے نہ کراہے نہ بیزار ہوئے، نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا، نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا، پگھل گئے، لیکن ہلے نہیں۔

مَیں[2] عرصے سے دیکھنے نہیں گیا تھا یہ میری نامعقول کمزوری ہے میں ایسی حالت میں کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ آدمی بھیج کر بلوایا ۔ . . . اَب گفتگو کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی تھی۔ اس لیے خود مَیں نے کچھ نہ کہا۔ ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے پوچھا کہاں تھے؟ میں نے عرض کیا مولانا بس یوں ہی نہیں آنا ہوا خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا —— حالانکہ خیریت دریافت کرنے کی جراٴت بھی نہیں ہوتی تھی اِس لیے کہ کوئی اطمینان بخش خبر کبھی نہ ملی اور نہ اس کی توقع ہوتی۔ لوگ جو کچھ آپس میں تذکرہ کرتے اس پر اکتفا کر لیتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ یہ تذکرہ ختم ہو اور کوئی دُوسری بات شروع ہو جائے۔ مرحوم تھوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے پھر بڑی کوشش سے اٹک اٹک کر نا صاف لفظوں میں فرمایا: پریشان نہ ہو، اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جاؤں گا۔

اَب مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں نے بے اختیار کہنا شروع کیا، مولانا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا، سب کر دیکھا، اَب کچھ بَن نہیں پڑتی۔ اُپنے بس کی چیز تو روپیہ پیسہ، دوڑ دھوپ، محبت اور ماتم ہی ہے۔ یہ سب بیکار ثابت ہوئے[3] ما

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۱۰ [2] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۱۱ [3] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۱۷

اَب تو صرف دیکھتے رہنا رہ گیا ہے، اس کی بھی ہمت نہیں رہی - مولانا بڑے غور سے سُنتے رہے پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دیر تک پکڑے رہے دہنا ہاتھ خالی تھا، اُسے اُٹھایا اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا، معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلوگیر ہے، ہلکے سے کھانس کر گلہ صاف کیا اور بولے: وہ دیکھتا ہے !!

مَیں چلا آیا ــــ یہ آخری مُلاقات تھی، تعطیلوں میں مَیں پہاڑ پر چلا گیا جس رات کو روانہ ہونے والا تھا، طبعیت کا عجیب حال تھا جی چاہتا تھا کہ مولانا کو آخری بار دیکھ آؤں اِس لیے کہ سمجھتا تھا کہ اَب دائمی مفارقت کی ساعت دُور نہیں ہے - دوسری طرف اَپنے میں اُس کی سکت نہ پاتا تھا کہ یادداشت کے اُس آخری نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جا سکے گی - دیر تک اسی حیص بیص میں رہا - بالآخر اِس فیصلے پر پہنچا کہ سلام کر ہی آؤں، وہاں پہنچا تو در و دیوار اور وہ تمام چیزیں، اشخاص اور یادگاریں ایک غم ناک ہجوم میں بڑھتی پھیلتی دل و ذہن پر چھا گئیں جن سے سالہا سال سے سابقہ تھا - ہمت چھوٹ گئی اور سلام کیے بغیر لوٹ آیا - تعطیلوں کے بعد واپس ہوا تو مرحوم اَپنے وطن جا چکے تھے اور وَہیں سے مقررّہ وقت پر نہ ایک ساعت اِدھر نہ ایک ساعت اُدھر ماجوارِ رحمت میں پہنچ گئے[1] -

اصؔغر گونڈوی مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں . . . . مولانا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) کے توسل سے ہوئی جنھوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی - اُس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا - مولانا سہیل سے اَلبتہ پرانی یاد اللہ تھی - مولانا سہیل سے مَیں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا - مولانا بولے: لو ایک انسان لایا ہوں - مَیں نے کہا: شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۲۰   [2] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۲۱

کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے: ملو، ملو۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے اور مَیں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور رحمت کے لمس نے مجھے کششِ ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا۔ انھیں مَیں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ شاعر نہ ہوتے جب بھی اُن کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے۔ ایک[۱] دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ راستے میں میرے ہاں ٹھہرے گئے۔ سینی دکھائی، پوچھا کہیے کیسی ہے؟ مَیں نے کہا عشوہ ہے عشوہ۔ فتوحات میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کیا گزر۔ مَیں نہ مُلّا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے، مَیں نے پوچھا کیا قیمت دی، کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے سُنا نہیں ع

جو کچھ کہا ترا حسن ہو گیا محدود!

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آ جاتی ہے تو اسے منجواتا ہوں، اسی میں کھانا منگوا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں، نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ مَیں حافظے کا کچا ہوں لیکن تأثرات دیر تک قائم رہتے۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے زمانے کے سیمیائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خد و خال رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے حزیں و حسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں!

مجھے[۲] اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے۔ مرحوم اسے جانتے تھے جب کبھی الٰہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگائے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اس

---

[۱] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۲۹ [۲] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۲۲ [۳] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۳۷

سے رسم و راہ پیدا کرتے، مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے۔ ایک بار ایسی ہی ایک جگہ مجھے لے گئے۔ مالک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف آتے گلاب یوں ہی سے تھے۔ میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی۔ معاً اصغر صاحب نے اُسے حاصل کرنے کے لیے ڈورے ڈالنے شروع کیے میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہہ دیا:

"اصغر صاحب فکر نہ کیجئے، سب کے سب معمولی درجے کے ہیں"

مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہو گئے کہنے لگے، کیا کہوں اِن گلابوں کے نادر ہونے اور اِس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سنا تھا۔ گلابوں کے بارے میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھیے: کم بخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا .... صاحب (الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی) کی معرفت اِسے قابو کیا گیا۔ اِس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیوں کر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بد عادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ مرحوم کی آخری علالت کے زمانے میں میرا جانا الہ آباد ہوا۔ صبح پہنچا۔ شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقے سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے، کوئی ہرج نہ ہوگا صبح چلے جائیے گا۔ میں ایسا بدبخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ میرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر یخ پڑ گئی لیکن میں کیا بتاؤں کس

ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپ کی خوشی ۔ وُہ حال اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اُوپر لعنت بھیجتا ہوں ۔ مَیں اِس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو مَیں نے کس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا، اُس کی یاداشت میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں اور اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی اُمید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے ۔ دو ہی روز کے اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی ۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا ۔ ۔ ۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی ۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وُہ پیکرِ مجسّم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا ۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی ۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا ۔ ایسا خلا جس میں بیابانی، برفانی ہواؤں گورستانی سنّاٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا ۔

اَب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا ۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا اور کون اسے مسرّت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا ۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا، سب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا ۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا ۔ میرے اچھے یا بُرے خیالات کا بیشتر حصّہ مضمون لکھنے کے دوران میں بے شان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے ۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اُس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اِس کی داد دیں گے ۔ اور لکھو، بہتر لکھو اور جلد لکھو کی امنگ پیدا ہوتی ۔ اَب وُہ بات نہیں ۔ بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارے میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں ۔ اصغر صاحب ہمیشہ اِسے پا جاتے، داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اُسی پر گفتگو کرتے ۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحبِ فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لیے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے ۔ یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وُہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے ۔ میرا یہاں مطلب اُس شیفتگی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصورات سے مرحوم کو تھی اور جس کا خفیف سے خفیف ارتعاش بھی اُن کے ذہن و دماغ پر مُرتسم ہو جاتا۔[۱]

آپ سے رفقا اور طلبا سے مجھے اکثر اس مسئلے پر "بحثنے" کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شخص، مَعقول شاعر نہیں ہو سکتا ۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں ۔ مرحوم اَصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر (یلدرم) میرے پیشِ نظر ہیں اُن کی دل افروز شاعری اور انشا پردازی تمام تر اُن کی دلآویز شخصیت کی آئینہ دار ہے ۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشا پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن اُن کی شاعری اور انشا پردازی میں خامی بھی اُسی حد تک ملتی ہے جس حد تک بحیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں ۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں اور[۲] اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی اور کائنات کے بامُراد اور برگزیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہوں ۔ ایسا[۳] کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اُونچا یا اُس سے علیحدہ ہو!

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اُس زمانے کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی ۔ نہ اَب جب زندگی، سوا خوش باشی سَب کچھ ہے ۔ مَیں نے اُن کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ؏

برزم کو برھم ہوئے مدّت نہ گزری تھی بہت!

۱؎ گنجِ ہائے گراں مایہ، ۲۴۱ ۲؎ جدید غزل، نگار (کراچی)، سالنامہ ۱۹۶۵ء، ۱۰۲

۳؎ گنجِ ہائے گراں مایہ، ۲۴۲

جب سے اَب تک زمانے کے روّیے اور روانی میں بہت کچھ فرق آگیا ہے، کیسا کچھ فرق ۔جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے "اَب اُن پر" رونے والا کوئی نہیں لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جُداگانہ تھی ۔اُن میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ اُن کی سیرت وشخصیت کا بہت اہم اور مہتم بالشان پہلو ہے۔

سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے ۔جس کے ہاں حالات کی رعنائی ہو اُس کے ہاں جذبات کا ہیجان وطغیان یوں بھی کم ہوتا ہے ۔پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آگئے ہیں سجّاد صاحب نے ایک ہلکی جنبشِ قلم سے اِن کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پر مُعتدل کیا ہے کہ اظہارِ مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغ دار نہیں ہوا ۔میرے نزدیک اِنشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت وعفت کو جس طرح یلدرم نے متوازن رکھا ہے کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔[1]

سجادؔ حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے ان کو جوڑ توڑ بالکل نہ آتا تھا ۔ وُہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے ۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے ۔ ایک سچّے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وُہ اہلِ مناصب سے بھی مرعوب نہ ہوئے لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑی سخی تھے ....[2]

یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں ۔ وُہ تمام آداب اُن میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان وجوانہ ہیں ۔اِن آداب کو وُہ اس لُطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حُسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلّف کے ۔یلدرم میں رسمی تکلّف بالکل نہ تھا۔ وُہ اُسی حد تک تکلّف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلّف بھی اُسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسین معاشرت کا جزوِ اعظم سمجھی جاتی ہے ۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی سے اونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ ، ۲۴۷ [2] گنج ہائے گراں مایہ ، ۲۵۲

ہیں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے ...... اُن کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوّع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ حامل یا قدر دان تھے، وُہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشے میں ہوں یلدرم سے واقف اور ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔

سیّد سجاد حیدر اُن لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سوادی ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن ہو ــــــ وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جُدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فردوس میں اُن کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہونگی جن کی صرف جھلکیاں اُن کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں ــــ

جامعہ کے جن عزیزوں، دوستوں سے میرا پرانا اور گہرا تعلق رہا ہے ان میں شفیق الرحمان قدوائی صاحب بھی تھے۔ اُن سے مُلاقات کم ہی ہوتی تھی، بس یوں ہی سال دو سال میں ایک آدھ بار، وُہ بھی چلتے پھرتے۔ آخر میں جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور شفیق صاحب دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیمات ہوئے تو ملنے کے مواقع بڑھ گئے۔ پھر تو تعلقات کچھ ایسے ہو گئے کہ کوئی تردّد ہوتا یا خوشی میسّر آتی تو شفیق صاحب ضرور یاد آتے اور کچھ ایسا لگتا جیسے وُہ شریک ہو جاتے تو تردّد کم اور خوشی زیادہ ہو جاتی!

کبھی ملاقات ہو جاتی تو بڑی خوشی ہوتی اِس طرح کی خوشی جو خلوص اور ریاضت کا نتیجہ ہوتی ہے، اتفاقات کا نہیں۔ مَیں شفیق صاحب کو اُپنا کارنامہ سمجھتا۔ جس کی زندگی کے نقشے میں کارنامے کا خانہ خالی ہو اُس کے نزدیک معمولی سے معمولی کارنامے کا احساس بھی بڑے فخر و مسرّت کا باعث ہوتا ہے چہ جائیکہ وہ کارنامہ اِتنا بڑا ہو جتنا کہ شفیق صاحب! لکھنے کو تو مَیں یہ لکھ گیا لیکن یہ بات بھی فوراً ہی ذہن میں آئی کہ شفیق صاحب کس کا کارنامہ نہ تھے!

لہ ہم نفسانِ رفتہ، ۹

میں زندگی کی مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں کا خاصا دل دادہ رہا۔ اب بھی ان سے تائب نہیں ہوا ہوں۔ کبھی کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ زندگی کے مصائب و مکروہات جن کا ماتم اکثر کیا جاتا ہے، ان راحتوں اور لذتوں کے ہوتے ہوئے آسانی سے سہے جا سکتے ہیں۔ ذہنی آسودگی کا مدار اچھی خاصی حد تک مجھ دُنیا دار کے نزدیک مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں[1] پر ہے۔ لیکن میں خاصا شرمندہ ہوا ہوں، اپنے آپ سے جب سامنا ایسے لوگوں کا ہوا جنہوں نے اپنی زندگی پر ان مصائب و مکروہات کو حلال اور راحتوں اور لذتوں کو حرام کر رکھا تھا۔ اِن میں جان پہچان کے لوگوں میں بار بار ذاکر صاحب اور شفیق صاحب آئے ہیں انھوں نے معلوم نہیں کس دُھن میں شاید کبھی سوچا تک نہیں کہ جوانی، دولت اور شان و شوکت کے کیا مزے تھے۔ جس مزے میں وہ گم تھے، وہ میرے اور میرے جیسے راحت پسندوں کے لیے کس قدر کڑوا ہوگا، اُس کا اندازہ کچھ اس شرمندگی سے کیا جا سکتا ہے جو ان دونوں کے سامنے میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے اور تن آسانی کا میرا جیسا خوگر ایسا کون ہے جو نہ محسوس کرے گا!

شفیق صاحب نے بڑی سخت بیماری اٹھائی۔ کتنی دوڑ دھوپ کی گئی، کیسی کیسی دُعائیں مانگی گئیں، کیا کچھ زیر باری نہ ہوئی لیکن ہوا وہی جسے نہ ہونے دینے کے لیے یہ سارے جتن کیے گئے تھے۔ اِنسان کی سیرت و شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے کہیں اور نہیں کھلتا۔ مصیبت اور بیماری کی بھٹی میں کسی طرح کا ملمع[1] قائم نہیں رہ جاتا۔ جب سارے دوسرے سہارے ٹوٹ چکے ہوں اُس وقت بھی اپنا سہارا پکڑے رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔ شفیق صاحب نے اپنا سہارا مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ اُن کے اچھے اور بڑے ہونے کی یہ دلیل سب پر بھاری ہے۔ اپنی[2] مسرت و محبت کے اظہار سے وہ ہمیشہ تیمار دار کی ڈھارس بندھاتے۔ یہ کام آسان نہیں۔ تندرستی اور فراغت میں جو لوگ بڑے ہنس مکھ، یار باش اور دلیر پائے گئے اکثر بیماری اور تنگ دستی میں اُن کو چِڑچِڑا، بودا اور دوستوں، تیمار داروں کے لیے خاصا

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۵ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۶

تکلیف دہ پایا گیا ہے! شفیق صاحب نے محبت کی تازگی و توانائی مصیبت جھیلنے اور دوسروں کی خدمت کرتے رہنے میں ڈھونڈی اور پائی تھی۔ اس لیے مصیبت میں ان کی خوبیاں اور زیادہ جگمگانے لگتیں۔ بعض پھول ایسے ہوتے ہیں جو سائے سے زیادہ دھوپ میں اپنی پوری بہار دکھاتے ہیں!

شفیق صاحب کے جنازے پر جیسے دہلی کی ساری خلقت ٹوٹ پڑی تھی! مرحوم کیسی محبت اور عزت لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے تھے، اس کا اندازہ کرتا ہوں تو زمانہ اور زندگی کی ساری ناہمواریوں کی طرف سے منہ موڑ کر فرد کی عظمت اور انسانیت کے شرف پر بے اختیار ایمان لانا پڑتا ہے!

ہماری عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے تو بہت سے مل جاتے ہیں، گو میرا ساتھ ایسوں سے بھی پڑا ہے جو ہماری عزت کو اپنی توہین سمجھتے تھے، نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب ہماری ذلت کو بھی اپنی ذلت سمجھتے تھے! قبیلے کا سردار ہونے کی اُن میں بڑی نشانیاں ملتی تھیں۔

نواب محمد اسمٰعیل خان، نواب محمد اسحٰق خان کے بیٹے اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے پوتے تھے۔ نواب صاحب مدّتوں علی گڑھ سے وابستہ رہے اور بڑے ذمّہ دار عہدوں پر فائز۔ (وہ) سب سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے کسی کے پاس حاجت لے کر جائیے تو نفس کو بالعموم غیرت کا احساس ہوتا ہے لیکن نواب صاحب اس وقار سے ملتے تھے اور دل سوزی سے پرسشِ احوال کرتے اور مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے کہ تھے کہ ذلت کے بجائے آدمی اپنے آپ کو گرامی محسوس کرنے لگتا تھا۔ نواب صاحب اتنے اچھے تھے کہ کوئی بُرا شخص بھی اپنے آپ کو آسانی سے اس پر راضی نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کی بُرائی پر آمادہ ہو جائے!

۱؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۲۲ ۲؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۴ ۳؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۹

۴؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۸۰ ۵؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۹۷ ۶؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۹۸

نوابؒ صاحب بڑے سیر چشم تھے اُن کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ یہ وصف اُن کا خاندانی تھا اور جاگیرداری یا سرمایہ داری سے وابستہ نہ تھا جس نے وفا نہ کی مہمان نوازی اور وضع داری کے اَوصاف نے نواب صاحب کا ساتھ مرتے دم تک دیا ان اَوصاف کا نباہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ نواب صاحب شروع سے آخر تک مالی دشواریوں میں مبتلا رہے۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، یہ دشواریاں بڑھتی گئیں، آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کسی وقت بھی پانی سر سے اونچا ہو سکتا تھا لیکن حیرت اس پر ہے کہ نواب صاحب کی کسی بات سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ اُن پر کیا گزر رہی ہے۔ تنگ حال ہونا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اُتنا ہی مُشکل ہے، جتنا اقتدار کو پہنچنا اور آپے میں رہنا!

نواب صاحب بڑے اُونچے درجے کے ارسٹوکریٹ تھے، جس کی ایک پہنچان یہ بھی ہے کہ وُہ کیسی ہی تکلیف یا پریشانی میں کیوں نہ مُبتلا ہو اس کا اظہار اس کی کسی بات سے نہ ہو۔ ہمارے ہاں ادنیٰ درجے کی بھی ارسٹوکریسی ملتی ہے لیکن جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وُہ یونان کے عہد اوّلین کی ارسٹوکریسی (اشرافیت) ہے جو وہاں کے دیوتاؤں کا درجہ اختیار کر چکی تھی!

نوابؒ صاحب مجھ پر کتنا کرم کرتے تھے اور میرے بچوں اور عزیزوں سے کس محبت اور عزت سے پیش آتے تھے، جی چاہتا ہے اس کا تذکرہ تفصیل سے کروں، ——— وضع داری کی کیسی قابلِ قدر مثالیں سامنے آسکتی ہیں، لیکن کرتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس میں خودستائی اور خودنمائی کا بھی پہلو نکلتا ہے جو ممکن ہے کسی اور موقع پر گوارا کر لیتا، یہاں اس کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی اور نہ کروں تو غیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ وُہ حق نہیں ادا کر رہا ہوں جو نواب صاحب کا مجھ پر ہے!

۱؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۰ ۲؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۱

۳؎ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۲

نواب صاحب کو سب سے پہلے غالباً ۱۹۲۰ء میں اُن کے دولت کدہ مصطفٰے کاسل، میرٹھ میں دیکھا تھا۔ آج[1] کے مصطفٰے کاسل کو دیکھ کر چالیس برس یا اُس سے بھی پہلے کے مصطفٰے کاسل کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کتنی خوب صورت شاندار عمارت، وسیع باغ اور کتنے گھنیرے تناور درخت جو کبھی کبھی اِتنے درخت نہیں معلوم ہوتے تھے، جتنے پُرانے زمانے کے سورما اور ان کی داستانہائے رزم و بزم[2] ایسے دیو پیکر درخت، اتنی تعداد میں اس قرینے سے یک جا وسطِ شہر میں مَیں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے عمارت کے وسط میں ایک مختصر سا عجائب خانہ تھا جس میں طرح طرح کے نوادر قرینے سے سجائے گئے تھے۔ ایک چیز اَب تک یاد ہے۔ ہاتھی دانت میں ایک نسوانی پیکر تراشا گیا تھا جس کی اونچائی غالباً ۸، ۱۰ انچ ہوگی۔ اُس وقت اس کو دیکھ کر کچھ اِس طرح کا خیال گزرا تھا کہ عورت میں کشش کی جتنی باتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں یا ابتدا سے آج تک اچھے اور بڑے شُعرا نے دریافت کی تھیں، ان کے بعد بھی کچھ باقی رہ گیا تھا، جس کو مجسّمہ ساز نے پورا کر دیا تھا!

مُدّتوں بعد یاد نہیں آتا کسی سلسلے میں ایک دفعہ پھر مصطفٰے کاسل جانا ہوا، نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ عمارت، باغ، درخت سب کہنگی، ویرانی اور افسردگی کی زد میں تھے، سوا نواب صاحب کی شفقت اور شگفتگی کے جو زمانے کی لائی ہوئی کسی زبونی اور ابتری سے متاثر نہ تھی —— آج دفعتہً[3] سُننے میں آیا کہ نواب صاحب رحلت فرما گئے! مصطفٰے کاسل ڈھے گیا جس میں کتنی اور کیسی کیسی یادیں دفن ہوگئیں، محبت و مروّت کی یادیں، مہمان نوازی اور وضع داری کی یادیں، غیرت و حمیت کی یادیں، شرافت اور شفقت کی یادیں! ایک شخص کے زندہ رہنے سے کتنی اقدار اور روایات کو فروغ تھا، اس کے اُٹھ جانے سے کتنی شمعیں بے نور اور محفلیں سونی ہوگئیں:

کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی!

نواب[4] صاحب کی فردِ اعمال تو خدا کے علم میں ہے اور نجاتِ اُخروی کا سرِ رشتہ

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۱ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۹۵ [3] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۲

بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے لیکن نواب صاحب کی محبت و منزلت سے میرا دل جس قدر معمور ہے اُس سے اُمید کرتا ہوں کہ مرحوم کو خدا اپنی بے پایاں بخششوں سے ضرور نوازے گا، میرا کچھ اِس طرح کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی بخشش کی بشارت اُس محبت سے بھی دیتا ہے جو وُہ اپنے نیک بندوں کی طرف سے اپنے بعض گنہگار بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے!

پروفیسر[1] احمد شاہ بخاری (پطرس) دفعتہً ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ اُن کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے اِتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً اُن کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لیے جمع ہوں تو اُردو کی طرف سے ہم بہ اتفاقِ آرا کس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو، بخاری نے اِس قسم کے انتخاب کے معیار کو اِتنا اُونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگتا ہے۔ یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اُردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا!

بڑے[2] سے بڑے ذہنوں سے ٹکر لینے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وُہ محفل علم و دانش کے اکابر کی ہو، خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی شاطروں کی، بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو، بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے، نہ مایوس، نہ متفکر، توازن اور تفنن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے ...... مسئلہ زیرِ بحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے .... حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہو کر، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۳۳ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۴۱

سمجھے بھی ــــ بخاری کے ترکش میں جتنے اور جس جس طرح کے تیر تھے موقع آجانے پر اُن کا انتخاب جس تیزی اور تیقن سے کرتے اور جس مشاقی سے چلاتے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے ــــ

جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے اُن کا اور اُن کے رُفقاء کا اُردو شعر و ادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ ...... اُن میں اور اُن کے بیشتر ساتھیوں میں اُردو شعر و ادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے .... اپنی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار نوجوان طبقے کے سرخیل رہے۔ اعلیٰ پائے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع، بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آئی ہے کہ اگر بخاری اِن رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اُسی طرح پاؤں توڑ کے بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسیّد اور اُن کے رُفقاء علی گڑھ میں، تو اُردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا ـــ ......

سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اِس کثرت سے اکابر موجود ہوں، علمی، قومی، تہذیبی کارناموں کی روایات کی فراوانی ہو اور قوم و ملک کی نئی تشکیل و تنظیم کے لیے دعوتِ کار اور کارزار بھی کچھ کم نہ ہو، وہاں بے عملی و بے حوصلگی کیسی ــــ اِس اجتماع کے افراد نے اپنے اپنے طور پر جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو اس سے انکار نہیں لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفریں کارنامہ سامنے نہ آیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک المیہ نہیں تو مسئلہ فکر یہ ضرور ہے ......

بخاری مرکزِ گریزا اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکتے تھے، ایک حد تک اُنھوں نے رکھا بھی لیکن یہ شخصی تعلقات کی بنا پر تھا کسی عظیم مقصد یا منظّم مقصد یا

لہ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۴۴   لہ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۴۸

منظم[1] اسکیم کے ماتحت جیسی کہ مثلاً علی گڑھ تحریک تھی، نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیرپا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی۔ اب بھی اِس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کھچے احباب ہونہار نوجوانوں کو اپنے سایۂ شفقت میں لے کر اِس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک نئے صحت مند، علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

ہر سوسائٹی میں نوجوان بڑا عیر متیقن، بڑا خطرناک، لیکن اتنا ہی قیمتی عنصر ہوتا ہے۔ پاکستان کے نوجوانوں کو مناسب اور بر وقت رہبری نہ ملی تو یہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہ سکتا۔ کسی اور سے ناطہ جوڑے گا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ نوجوانوں کا فلاں یا فلاں مذہب ہے۔ دراصل وُہ اپنے شباب کی وارداتوں (حوصلہ اور ہوس) کا شکار ہوتا ہے۔ مذہب تو اس کو صحیح اور صالح راستے پر لگانے والے دیتے ہیں۔

بخاری بڑے بت شکن تھے۔ جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وُہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے، وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے! (وہ) خطوط[2] بڑے اچھے لکھتے تھے۔ اُن کے کتنے اور کیسے دل آویز خط و خال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے آپ پر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لیے یہ رشتہ اِتنا ضروری نہیں ہے۔ خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے۔ "سیفٹی فرسٹ یا سیلف فرسٹ کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے" آمیزشے کجا گہر او کجا کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط اُنھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اُردو کے رسالوں میں شائع ہوئے اُن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے،

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۵۵ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۵۲

تخیل کتنا نادرہ کار اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی تھی۔ وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دل کش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

کچھ عرصے سے اُن کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی "بادِ شمال" کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر دوستوں کو جمع کرتے سیر کو نکل جاتے۔ اُن کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو اُن کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا۔[1]

"پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ اُن کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے اِتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً اُن کو اپنی بیکراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہو گا۔"[2]

موت[3] سے کسی کو مفر نہیں لیکن جو لوگ اعلا مقاصد کی تائید و حصول میں تا دمِ آخر کام کرتے رہتے ہیں وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں اُن کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے پہلی صورت طبعی اور ارضی ہے۔ دوسری اخلاقی اور ماورائی۔ تقدیرِ الٰہی نے صرف نوعِ انسان کو موخر الذکر اقدار کے تحفظ و ترفع کے لیے انتخاب کیا ہے۔ (بابائے اردو) مولوی عبدالحق صاحب کی زندگی اور وفات دونوں میں اِس کی تعبیر ملے گی۔

عنفوانِ[4] شباب کی بے پایاں اور بسا اوقات تند صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب اور اُن کو صحیح راستے پر لانے اور رکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۵۶ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۵۷
[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۷۹ [4] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۸۰

مولوی صاحب یقیناً بڑے خوش قسمت تھے کہ اُن کو سر سیّد کا سایہ اور سہارا اور اُن کے نادرۂ روزگار رفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ (انہیں علی گڑھ[1] میں اتنی معقول و مؤثر نظری و عملی رہبری نہ میسّر آتی تو کیا معلوم وہ کدھر نکل جاتے ۔۔۔۔ یہ اس لیے کہنا پڑا کہ آج کل بیشتر ذی استعداد اور ہونہار نوجوانوں کو مناسب و معقول رہبری اور ماحول نہ ملنے سے بے راہ روی نے دُنیا کو جس انتشار، مایوسی اور بیزاری سے دوچار کر رکھا ہے وُہ ہمارے سامنے ہے جس کو دُور کرنے میں ہماری بہترین مساعی اَب تک ناکام رہی ہیں خُدا نہ کرے یہ سرکشی و گمراہی اپنا تاوان لیے بغیر نہ رہے جیسا کہ تاریخ بتاتی چلی آرہی ہے جس کے آثار روز بروز نمایاں ہو رہے ہیں۔۔

مُولوی[2] صاحب کو شروع سے آخر تک وقت کی (ایسی) گرانمایہ شخصیت کی صحبت و رفاقت نصیب رہی ۔۔۔ جنہوں نے ہمارے قدیم کی اعلیٰ روایات و اقدار کو جدید کے اہم تقاضوں سے روشناس کرانے اور سازگار بنانے ہیں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اِس سے ہماری علم دوستی، تہذیب و شائستگی، فرض شناسی محنت کوشی، ایمانداری اور دلیری کے کارنامے روشن ہیں اُنھوں نے ایک نازک اور پُر آشوب زمانے ہیں قدیم کا اعتبار و وقار جدید کی تاخت و تاراج میں محفوظ بھی رکھا اور روشن بھی۔ قدیم و جدید کو ایک دوسرے کی روش و روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا اور اُن کی خوبیوں کو قبول اور خرابیوں کو ترک کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، یہ صرف خاصانِ عصر کر سکتے ہیں۔۔

اِس بات کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہم یا تو پُرانے کو فی الفور اور یک قلم ترک کر کے نئے کو قبول کر لیتے ہیں یا نئے کو کسی بھی قیمت پر اپنانے کو تیار نہیں ہوتے اور ستم ظریفی یہ کہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ تقاضائے فطرت اور آئین زندگی دونوں کے منافی ہے۔ اِس سے انسانی ترقی

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ ۱۸۱ [2] ہم نفسان رفتہ ۱۸۳

وتہذیب میں نہ ربط باقی رہتا ہے نہ تسلسل اور انسانی معاشرے میں بڑا انتشار واختلال واقع ہوتا ہے۔

خیال[1] ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو کراچی میں اُردو یونیورسٹی قائم کر دیتے جس کے لیے وُہ کتنے مُضطرب اور کس درجہ کوشاں تھے۔ وقت کا تقاضا بھی تھا اور حالات بھی سازگار ہو چلے تھے لیکن انسان کی زندگی اُس کے مقاصدِ جلیلہ کی زندگی سے ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ وُہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائے بالآخر مَرے گا۔ بڑے مقاصد کی بھی زندگی ہوتی ہے لیکن ہوتی ہے ہمارے آپ کی زندگی سے علیحدہ جس پر کبھی موت بھی نہیں طاری ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ مقاصدِ عظیمہ وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کا کچھ حصّہ ہمارے آپ کے حوصلے اور استعداد کے مُطابق ہم کو ودیعت کرتے رہتے ہیں۔ اُسی کے بقدر ہم کام کرتے ہیں، پھر دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ مشیتِ الٰہی اِس لیے تقدیرِ انسانی یہی ہے ......

...... (یوں) ہر آدمی اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مادّے کی طرح عمل بھی لازوال ہے، ایک طبعی دُنیا میں، دوسرا روحانی واخلاقی زندگی میں، اس بڑے فرق کے ساتھ کہ خیر و شر کتنے ہی اضافی کیوں نہ قرار دیے جائیں خصوصیت و خاصیت کے اعتبار سے ایک بہرحال خیر اور دوسرا بہرحال شر ہے!

کوئی مُہم[2] آج تک فرزانوں سے سَر نہ ہوئی۔ اِس کے لیے دیوانوں ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اُردو کی "وادیٔ پُرخار" اپنے کانٹوں کی پیاس بجھانے کے لیے ہمیشہ کسی "آبلہ پا" کی منتظر رہے گی اور مولوی (عبدالحق) جیسا بے نیاز آبلہ پا اِس وادی سے اَب تک نہیں گزرا!

مولوی[3] صاحب میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں جو اس مزاج و ماحول کا خاصّہ ہیں جو مولوی صاحب کا تھا لیکن ان کو معرضِ بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھتا۔ انسانی ذہن اور آیندہ نسل میں انسان کی فضیلتوں ہی کی یاد باقی رہے تو

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۸۸   [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۰۰   [3] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۰۵

اچھا ہے! خوبیوں کو جتانا اور کمزوریوں کو نظر انداز کرنا کسی اور آئین کے مطابق ہو نہ ہو، آئینِ سیرت نگاری کے مانے ہوئے ضوابط کے خلاف یقیناً ہے جہاں ہر شخص کے کھرے کھوٹے کو علیحدہ کر کے دکھاتے ہیں۔ میں سیرت نگاری کے فرائض انجام دینے کے منصب پر فائز ہونے یا کیے جانے کا خواہش مند بھی نہیں ہوں کسی کی خوبیوں کو جتانے اور کمزوریوں کو چھپانے کے طریقے کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا لیکن عملاً اس کو غلط بھی نہیں قرار دیتا۔ اس لیے کہ دیکھا اکثر یہ جاتا ہے کہ بُرے اور بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے مُنہ موڑ کر اُن کی صرف ایک آدھ کمزوریوں کو اپنی بداعمالی دبلے راہ روی کے جواز میں چن لیتے ہیں۔

کسی کے عیب نکالنے سے بہتر مشغلہ چُپ رہنا ہے اور دونوں سے بہتر اُس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے۔ اس طریقِ کار سے فن کا حق ادا ہوتا ہو یا نہیں یہ فن کار اور اُن کے مربّی یا محتسب جانیں، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ انسان اور انسانیت کے تقاضے فن اور فن کار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں اس لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسانی زندگی کی تمام خامیوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کرنے ہی کی نہیں، اُن کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرنے کی وکالت کی جاتی ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے انکشافات اِن کمزوریوں کے حق میں ہیں لیکن اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ سائنس اور فلسفے کے علاوہ انسان ہی کے مدّون کیے ہوئے کچھ اور علوم و انکشافات بھی ہیں جو انسان کے حیوانی تقاضوں کو قابو میں رکھنے اور ان کو عملِ صالح میں ڈھالنے کے حق میں ہیں۔ نباتات کا ماہر کسی اچھے پھل پھول کے درخت کو اصل کی طرف لوٹ جانے (یعنی جنگلی ہو جانے) کے حق میں نہ ہوگا بلکہ طرح طرح کے تجربوں اور ترکیبوں سے اس کی کوشش کرے گا کہ اس پھل یا پھول کی جنگلی صلاحیتیں مزید خوبصورتی اور افادیت کی صلاحیتوں کا باعث بنتی جائیں اور وہ پھل یا پھول بہتر سے بہتر ہوتا جائے۔ جانوروں میں بھی اس کا

لہ ہم نفسانِ رفتہ، ۲۰۶

لحاظ رکھتے ہیں۔ صرف انسان ایسا ہے جس کو انسان دورِ وحشت کی طرف رُخ کرنے اور مائل رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے لیے سائنس اور مشین کی تمام برکتیں فراہم کرتا رہتا ہے۔

موجودہ دنیا کی بے یقینی و محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم فن اور فن کار، سائنس اور سائنس کار کو انسان و انسانیت پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا گمان ہونے لگتا ہے جیسے انسانیت کو فن اور سائنس کی غلامی میں دے دیا گیا ہو! حالانکہ اِن دونوں کو ہر حال میں انسانیت کا تابع رہنا چاہیے۔ جہاں خاک نشینی نہ آتی ہو وہاں عرش پرّ دازی زبردست خطرہ ہے۔ اس سے سائنس یا فن کی تنقیص یا توہین منظور نہیں ہے اس لیے کہ یہ دونوں بھی انسان کی بہترین صلاحیتوں کا ثمرہ ہیں مقصود دراصل دونوں کے لیے مناسب مقام (حفظِ مراتب) کا تعین ہے!

مدتیں[1] گزریں میری طفولیت اور "الہلال" کے شباب کا زمانہ تھا۔ "الہلال" کے جتنے پرچے آتے تھے، ہم لوگ اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔ عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہ سمجھتے وہاں یہ خیال کرتے کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لیے اس کا اور زیادہ احترام کرتے۔ پچھلی بار گھر گیا۔ بچپن کے زمانے کی الماری گردوغبار سے اَٹی پڑی تھی۔ ایک کاغذ پر اتفاقیہ نظر جا پڑی دیکھا تو اُس وفد کی تصویر تھی جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی سرکردگی میں جنگ بلقان میں زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے ہندوستان سے گیا۔ یہ تصویر اُس زمانے میں "الہلال" میں شائع ہوئی تھی، نیچے لکھا ہوا تھا:

"اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو
جب وہاں پہنچنا تو خدارا اُن کے زخموں پر سختی نہ کرنا
کیونکہ وہ زخم ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں۔"

---

[1] گنج ہائے گرانمایہ، ۱۷

وہ زمانہ یاد آگیا جب ابوالکلام، محمد علی، ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گزرے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم بھی ہندوستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے، زخمی ہوں گے، شہادت پائیں گے، فاتح کہلائیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں ہے۔ آج جب یہ سطور لکھ رہا ہوں، ماضی کا غبار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور تصور کی کرنیں طفولیت کے اُس افق پر پڑ رہی ہے جہاں ہم رہ رہ کر تلملا اٹھتے تھے کہ کیوں بچپن کا زمانہ نہیں ختم ہوتا اور ہم ترکوں کی مدد کے لیے اسلام کا نام روشن کرنے کے لیے زخمی ہونے کے لیے، سپاہیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے کیوں نہیں بلائے جاتے۔ لیکن اب کیا حال ہے؟

ہم بدل گئے، زمانہ بدل گیا، دنیا بدل گئی۔ رنج و راحت، عزت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جدوجہد وہی ہے لیکن جدوجہد کا لُطف باقی نہیں رہا۔ تصورات میں نہ رنگینی باقی رہی، نہ حرارت، عزائم میں نہ استواری ہے اور نہ برکت! مانا کہ موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات کچھ اور رہی ہیں، فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدارا کوئی یہ بتائے یہ کیسے مسائل ہیں، یہ کیسے فرائض ہیں، جن سے دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی، دلوں میں ولولے نہیں پیدا ہوتے، ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

میں[1] اسکول کا طالب علم تھا۔ کیسے اچھے وُہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی اپنے دیار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں نصیب تھی اور اس سے کم خوشی مجاہدوں کے دیار میں جان دینے کی اُس دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا ابوالکلام کی آتش نوائی میں ملتی تھی۔ عمر کا وُہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا۔ جب اچھے اور بڑے کاموں کے لیے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی تھی۔ گزرے

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۶

ہوئے دنوں کی یاد کس کو نہیں عزیز ہوتی، بالخصوص بوڑھوں کو جنہیں صرف ماضی کی جائے پناہ میسّر ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ وہ عہد کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا، واقعہ کے اعتبار سے ممکن ہے اتنا صحیح نہ ہو جتنا اپنی یاد کے اعتبار سے میرے لیے حسین و غمیں ہے! معاف کیجئے گا ماضی کی یاد نے ماضی سے بھی کہیں دور پھینک دیا۔[1]

ماضی کو مَیں اپنا کارنامہ نہیں قرار دیتا، یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ قرار دیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی ماضی کارنامہ سمجھنے لگتا ہوں! بہر حال وہ زمانہ کب کا ختم ہوا اور زمانہ بھی کیا کرے اس کی تقدیر ہی یہ ہے۔[2]

نئی زندگی[3] دنیا زمانہ مجموعۂ کرامات سہی لیکن مَیں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدّت الایّام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی، انسانوں اور انسانیت کے لیے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعثِ خیر و برکت ہے۔

ظاہر ہے[4] پرانے وقت کا بول، راگنی بے وقت ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے زندگی اور زندگی کے تار پود نئے اسلوب سے مرتّب ہو رہے ہیں۔ ہر چیز کی قدر و قیمت بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم متاعِ یوسفی سمجھتے تھے وہ متاعِ کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہ حاصلِ حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رُخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی برہنگی کو برگزیدہ حقائق کا انکشاف کیوں کر مانا جائے۔ سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے۔ آرٹ اور آزادی کی قربان گاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ افراد کی شادی اور غمی کیا ہو گی اُن کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی اُمید و اُمنگ کے نخلستان کیوں فنا کیے جا رہے ہیں، زمانہ کے بدلنے سے زندگی کی سیئات حسنات میں کیوں کر تبدیل ہو جاتے ہیں۔۔۔!

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۸۹ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۶

[3] گنج ہائے گراں مایہ، ۲۰۲ [4] گنج ہائے گراں مایہ، ۱۹

انسان[1] کی صالح اور صحت مند زندگی کا مدار اس پر ہے کہ اُس کے ہاں اقدار کی کیا اہمیت ہے اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور ہوا کے ہر جھونکے سے زیر و زبر نہ ہوں بالفاظِ دیگر اقدار نتیجہ ہوتے ہیں مدّتوں کے تجربے اور ریاضت کا۔ زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدار وہی کام کرتے ہیں جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں۔ آج سے پہلے زندگی میں وہ "مرکز گریز" سرعت اور شدّت نہ تھی جو اَب ہے اور یہ آئی ہے عقل چکرا دینے والی اس صدی کی اُن ایجادات سے جنہوں نے زندگی کی آنے والی صدّیوں کو مہینوں اور ہفتوں میں سمٹنا شروع کر دیا۔ مستقبل کو حال میں کھینچ لانے کی مدّت جتنی مختصر کرتے جائیں گے اُتنی ہی جلد جلد حال، ماضی میں منتقل ہوتا رہے گا اور ماضی کی قدر و قیمت کم ہوجاتی جائے گی۔ جہاں اور جب اور یہ صورت حال ہو گی، وہاں زندگی میں اختلال راہ پائے گا اور غیر یقینی بڑھے گی۔ آج کل ہم اِسی دَور سے گزر رہے ہیں۔کسی[2] ماضی کی اہمیت کا مدار محض اُس کے ماضی ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ کس حد تک وہ حال اور مستقبل کی صحیح اور صحت مند رہبری کر سکتا ہے۔ حال و مستقبل کی اہمیت اِس بنا پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں، اِس لیے اصولاً یا کلیتہً ماضی سے رُوگردانی نہیں کر سکتے۔

مولانا[3] ابوالکلام سے خط و کتابت عمر بھر میں دوبار ہوئی۔ ملاقات صرف ایک بار، وہ بھی اُن کے آفس میں چند منٹ کے لیے ڈیوٹی سوسائٹی سے متعلق غالباً ۱۹۴۸ء کے آخر میں!۔۔۔۔ بہت سے دوسرے اصحاب کے مانند مولانا سے میری غائبانہ اور بہت گہری عقیدت اُس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی، "الہلال" میں اُن کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

مولانا[4] اُن برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اَپنے عہد سے بڑی تھیں۔ وہ آفریدۂ

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۹۶
[2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۵
[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۷۹
[4] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۶

عہد تھے اِس لیے اُن کی کش مکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدۂ عہد ہوتے۔ وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے اس کا احساس آج ہو رہا ہے، جب وہ ہم میں نہیں رہے، کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے!

علم کی[1] معرفت اور مذہب کے شرف و سعادت نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب و مکروہات اور سیاست کے شور و فتن سے پراگندہ خاطر اور تلخ کام نہیں ہوتے تھے جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو، اُس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایسے لوگ دُنیا میں بہت کم ہوئے ہیں جو نارمل ہوں اور اپنا سہارا خود ہوں۔

مولانا[2] ابو الکلام آزاد عوام کے آدمی نہ تھے، کتنے خواص کو بھی اُن کے ہاں عوام کے درجے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا! شاید اُنھوں نے اقبال کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند و ویران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی۔ (وہ[3]) عزلت نشین، دیر آشنا اور کم آمیز تھے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کے "خاصانِ بارگاہ" سب سے کنارہ کش ہو کر زندگی کا وہ زمانہ جو ترغیباتِ نفس کے اعتبار سے غفلت اور غلبے اور ضمیر و دانش کے اعتبار سے نیم پختہ ہوتا ہے، عبادت و ریاضت میں گزارتے ہیں۔ اِس خلوت، عبادت اور ریاضت (اعتکاف) کا مقصد مطالعۂ ذات اور محاسبۂ نفس ہوتا ہے۔ اس سے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اُن کی زندگی کا کیا مشن ہے اور وہ خلقِ خدا کی کس خدمت پر مامور (من اللہ) ہونے والے ہیں۔ اِن مراحل سے گزرنے کے بعد وہ دعوتِ حق اور خدمتِ خلق کے لیے عامتہ الناس میں آتے ہیں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مولانا اپنی زندگی کے کسی خاص عہد میں اِس مرحلے و منزل سے گزرے ہیں یا نہیں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۱۲ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۱۹

[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۲۰

اِس مُطالعہ اور مُجاہدے میں کسی نہ کسی حد تک مولانا آخر دم تک منہمک رہے۔ اَپنے محاسبے کے لیے اپنی کمین گاہ میں بیٹھنا ایک بات ہے اور بہت بڑی بات ہے اور آپ اَپنی بنائی ہوئی جنت یا خانقاہ میں بیٹھنا قطعاً دوسری بات ہے اور بہت معمولی بات ہے۔ اوّل الذکر حالت وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کا اور مُؤخر الذکر بجائے خود ایک مقصد ہے لیکن اَدنیٰ مقصد ہے۔ ایک پناہ لیتا ہے، دوسرا پناہ بنتا ہے۔

گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام کی زندگیوں میں ایک بات کتنی المناک لیکن اتنی ہی عظیم الشان نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کی حمایت اور غم خواری میں اور اُس وقت جب کہ مُسلمانوں کے جان و مال و آبرو کی کوئی قیمت اور وقعت نہیں رہ گئی تھی، گاندھی جی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کی گولی کا نشانہ بنے۔ مجھے اپنی لاعلمی پہ ندامت ہوگی لیکن فرطِ افتخار سے سَر اُونچا ہو جائے گا۔ اگر کبھی یہ معلوم ہو سکا کہ گاندھی جی کی طرح کسی بڑے مسلمان کو غیر مسلموں کی حمایت میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا! ہندوستان کی دو اتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ اُن کے ہم مذہبوں نے کیا سلوک کیا اس پر کسی اور کو نہیں ہم ہندوستانی مُسلمانوں کو ضرور غور کرنا چاہیے۔

اُس[1] وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی سردار دُور دُور ایسا نظر نہیں آتا، جس کے سُپرد ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ کی جا سکے![2]

اَللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

موت[3] آگے پیچھے سبھی کو آئے گی۔ اِس سے زیادہ عام، یقینی اور غم ناک حادثہ کوئی دوسرا نہیں سب سے زیادہ دردناک موت تو ذاتی طور پہ ان کی محسوس ہوتی ہے جن سے خون کا رشتہ ہو۔ اُس کے بعد اُن کی جن سے خون کا نہیں احترام و

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۰۹ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۳۱

[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۴۳

عقیدت کا ہوتا ہے۔ جنہوں نے دوسروں کی خاطر اپنی بہترین صلاحیتیں اور اپنی قیمتی متاع وقف رکھی یا جن کے فیض سے انسانوں کی چھوٹی بڑی جماعتوں میں یگانگت آئی ایک دوسرے کے رنج و راحت اور نفع و نقصان میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جہالت، بھوک، بیماری، ذلت اور تنگ نظری سے چھٹکارا ہوا۔ ان کے بجائے فخر، فراغت اور مسرت سے ہم کنار ہوئے۔ علم اور سچائی کے پھیلانے، دوسروں کی خدمت کرنے اور ظلم و زیادتی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

پنڈت جی (جواہر لال نہرو) سے ہمارا یہی رشتہ تھا، کتنا پرانا اور کبھی نہ مٹنے والا رشتہ۔ ایک مدت تک اُن کو اور اُن کے کاموں کو دیکھنے، اُن کی باتیں سننے اور اُن اقدار و روایات کا لحاظ کرنے سے جو اُن کی ذات سے منسوب تھیں اگر ہم ان سے خون کا سا رشتہ بھی محسوس کرنے لگے ہوں تو کیا عجب! ان کی وفات پر درد و الم کا جو عالم دیکھا گیا اُس سے تو کچھ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ ہر شخص اُن کو فرداً فرداً بالکل اپنے طور پر عزیز رکھتا تھا۔ بڑے پیمانے پر یہ امتیاز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے!

اِس وقت ایک قطعہ یا رُباعی یا دونوں یاد آ رہی ہے جو معلوم نہیں کب کیسے کسی سے سُن کر یا کسی کتاب میں لکھا دیکھ کر ذہن میں محفوظ رہ گئی۔ بہت دنوں تک اِس کی طرف توجہ نہ ہوئی، کبھی خیال گیا بھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا "شعر ہی تو ہے جسے شاعر کہتے رہتے ہیں۔ ان کو اِس کے سوا اور کرنے ہی کو کیا رہتا ہے۔" پنڈت جی کی وفات پر خلق اللہ کی بے قراری و بے بسی دیکھی۔ اس کا جو حال سُنا اور پڑھا تو یہ اَشعار یاد آ گئے۔ پھر کچھ اس طرح کا احساس ہوا کہ شاعر بھی کیا چیز ہوتا ہے، بظاہر بیٹھا باتیں بناتا رہتا ہے لیکن جب کوئی معرکہ آن پڑتا ہے، حادثہ گزر جاتا ہے تو اُس کے شعر کا سہارا لیے بغیر کام نہیں بنتا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوا کہ وحی و الہام بھی شاید اِس درجے نہ مؤثر ہوتے اگر پیغمبروں نے اپنے عمل میں اور

لہ ہم نفسانِ رفتہ، ۲۵۶

شاعروں نے اپنے کلام میں اِن کی تعبیر نہ کی ہوتی ـــــ ، اشعار یہ ہیں:

یاد داری کہ وقت زادن تو
جملہ خنداں بدند و تو گریاں
تو چناں کہ وقتِ مردنِ تو
جملہ گریاں شوند و تو خنداں

پنڈت جی نے اِن اشعار کو سچ کر دکھایا۔

پنڈت[1] جی سے کبھی شرف نیاز نہیں حاصل ہوا۔ صرف دو بار مسلم یونیورسٹی میں اور ایک دفعہ دوسرے مقام پر دیکھنے اور تقریر سُننے کا اتفاق ہوا۔ پنڈت جی[2] خاندان، مزاج، تعلیم و تربیت، رہن سہن، پسند ناپسند ہر اعتبار سے اَرسٹوکریٹ (Aristocrate) تھے...... اَرسٹوکریٹ ہونے کی ایک سب سے بڑی خوبی جو اُن میں عمر کے آخر تک تازہ اور بیدار رہی، یہ تھی کہ وہ کسی حال میں دوسرے اور تیسرے درجے کے لوگوں سے مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔ سستی شہرت حاصل کرنے پر وہ کبھی آمادہ نہ ہوئے جس کی وجہ سے اُن کی شہرت اکثر معرضِ خطر میں رہی اور دوسرے نام نہاد لیڈروں کا نام و نمود اور نان نفقہ بڑھتا رہا۔

اُن[3] کی اَدبی و علمی تحریروں میں بڑے ذہن کی کیسی اور کتنی حسین و عظیم تخلیقی صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ قلم سے کیا کیا اور کیسے کیسے کام لیے جا سکتے ہیں فنونِ لطیفہ کے بھی اور فنونِ سپہ گری کے بھی! ان کی[4] تصانیف میں آرٹ، انسانیت اور اقدار اعلیٰ کی حمایت کا آہنگ ملتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے آپ کے خدا یا مذہب پر عقیدہ رکھتے ہوں یا نہیں اِس طرح کی کسی نہ کسی حقیقتِ بسیط سے غیر شعوری طور پر سہی، متأثر ضرور تھے۔ وہ خدا سے چاہے جتنے دُور ہوں، اُس کی مخلوق سے بہت قریب تھے۔ خدا سے

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۵۳   [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۴۸

[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۵۱   [4] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۷۸

انکار اور اُس کی مخلوق سے یہ شیفتگی ، ایک سوال کی شکل میں اگر خُدا کے سامنے پیش کی جا سکتی تو اقبال کی نظم "تنہائی" میں اللہ کی طرف سے جو اشارہ شاعر کو موصول ہوا یعنی:

تبسمے بہ لب اور رسید و ہیچ نگفت!

وہی اس موقع پر بھی ایک اور ہی جہانِ معنی لیے ہوئے ملے گا!

پارٹی[1] کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر لیڈر کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ملکوں میں جہاں آزادی نہ ملی ہو یا آزادی ملے زیادہ دن نہ گزرے ہوں۔ یہ بات جتنی قدرتی ہے اُتنی ہی آگے چل کر اندیشہ ناک بن جاتی ہے (میں اِس بات کا قایل ہوں) منصب[2] نہیں بلکہ شخصیت فیصلہ کُن ثابت ہوتی ہے۔ موصوف[3] کی شخصی حیثیت اُن کی منصبی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند و محترم تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ کسی لیڈر میں جب تک یہ وصف نہ ملے اُس کو قوم کا سردار نہ تسلیم کرنا چاہیے۔ حکمرانی وہ نہیں ہے جو پولیس، فوج، اسلحہ اور بین الاقوامی دھڑے بندی کے زور پر کی جائے۔ حکمرانی یہ ہے کہ فردِ واحد (مردِ قلندر) بے منتِ غیرے اپنی ذاتی خدمات اور خوبیوں کے طفیل بے شمار لوگوں کو جن میں اپنے اور پرائے دونوں شامل ہوں، کے دلوں پر قابض و متصرف ہو، جیسے پنڈت جی تھے۔

ایسی[4] شخصیتوں کو جیسی کہ پنڈت جی کی تھی طویل المیعاد اور بالآخر جان لیوا آزار میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ ایسوں کے مدتِ مدید تک مریض و معذور رہنے سے وہ سارا نظام ماؤف و ابتر ہو جاتا ہے جس کے وہ معمار و مختار رہ چکے تھے، اِس لیے کہ وہ منافق و مفتری جو اپنے نامبارک اغراض کی خاطر لیڈر کی چھتری سے نیچے پناہ گزین ہوتے ہیں، موقع ملنے پر سب سے پہلے اپنے محافظ و مربی سے منحرف ہو کر اس کے نام اور کام کو داغ دار کرنے اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے میں سرگرم عمل

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۶۵ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۹۲

[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۶۰ [4] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۷۷

ہو جاتے ہیں چنانچہ جو کام ملک اور اُس کے باشندوں کے نفع و ناموری کے لیے لیڈر انجام دے چکا ہوتا ہے، اُس کا رُخ تمام تر اپنے نفع و ناموری کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ سیاسی شخصیتوں اور اخلاقی شخصیتوں میں کتنا تفاوت ہوتا ہے! پہلا عوامل طبیعی کی زد میں جتنا درماندہ ہوتا رہتا ہے مؤخر الذکر اتنا ہی برگزیدہ!

اعلیٰ شخصیتوں[1] کی اعلیٰ خدمات کی ذہنوں پر ایسی گرفت ہوتی ہے کہ ہم اُن کے ہوتے ہوئے کبھی کبھی فطرت کے اٹل قوانین کو بھی بھولنے لگتے ہیں۔ اچھے آدمیوں کے بارے میں ہم غیر شعوری طور پر یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ شاید وہ ہمیشہ زندہ رہیں یا جلد نہیں مریں گے۔ اِس کے برعکس بُرے اشخاص کے بارے میں یہ خیال آتا رہتا ہے کہ اُن سے جلد نجات مل جائے گی۔ نیکی اور بدی کا تصرّف ذہنوں پر بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کرشمہ ہے ہماری اس خواہش کا کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو لیکن اِس رمز کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ایسی خواہش پیدا ہی کیوں ہوتی ہے۔ خواہش یا ارادہ نیک اور بلند ہے تو اس کا سرچشمہ کوئی حقیقتِ اعلیٰ ہوگی۔

پنڈت[2] جی کی وفات پر جس شدّت سے . . . . . اظہارِ رنج و غم کیا گیا... . . . . "وہ محشرستانِ بے قراری" اب کسی قدر ماند پڑ چکا ہے۔ حادثہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، نفس اپنے تقاضوں سے بے پروا رہنے کی کسی کو زیادہ مُہلت نہیں دیتا۔ زندگی[3] کا یہی دستور چلا آرہا ہے اور رہتی دنیا تک اس میں فرق نہ آئے گا۔ دنیا کا کاروبار اور آپس کا نفع نقصان اتنا پیچیدہ اور پھیلا ہوا ہے اور پیٹ پالنے، جان بچانے، عزت پانے، لذّت اُٹھانے، نام اُچھالنے اور روزمرّہ کے معمولات ادا کرنے کا جذبہ اتنا قوی اور عالمگیر ہے اور ان کی ہمہ وقت اتنی دیکھ بھال رکھنی

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۴۵ — [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۶۴

[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۴

پڑتی ہے یا وہ ہمہ وقت ہماری اتنی دیکھ بھال رکھتے ہیں کہ ہم کسی حادثے کو اپنے آپ پر زیادہ دیر تک مسلط نہیں رکھنا چاہتے اور رکھ بھی نہیں سکتے۔ دُنیا کا سب سے عجیب پہلو یہی ہے کہ وہ موت کو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ثابت نہیں ہونے دیتی بلکہ زندگی کو زندگی کا سب سے بڑا انعام بتاتی ہے۔ ایسا انعام جو ہر محرومی کی تلافی کرتا رہتا ہے، ایسا انعام جو بے بود اور غیر متیقن ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے عالم اور عامی کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے ہے۔ زندگی کی ہماہمی اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ کوئی شخص موت کے عمل و دخل پر زیادہ دیر تک غور کر سکے! قومی پیمانے[1] پر جو سوگ منایا جاتا ہے اُس کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے یعنی جس شخص یا سانحے کا ماتم کیا جائے اُس کی بازیافت یا تلافی کے لیے قوم ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی پوری اخلاقی و تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ورنہ "ماتم برائے ماتم" تو "ادب برائے ادب" سے بھی زیادہ فعلِ عبث ہے۔ اگر اس اظہارِ اندوہ و الم میں قوم اور ملک کی بھلائی اور برتری کے لیے ہم سب کی دلیری و دانشمندی اور دردمندی بھی شامل ہے تو پنڈت جی کی وفات ہمارے لیے اُن کے "ظہورِ نو" کی بشارت ہے!

جگر صاحب[2] وہاں پہنچ گئے جہاں ایک نہ ایک دن ہر اُس متنفس کو پہنچنا ہے جو زندگی مرض الموت میں گرفتار ہے۔ اِس دُنیا میں موت بھی کتنی سستی، یقینی، ہر جگہ ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی کی طرح یہ بھی ہر جاندار کے لیے کتنی ضروری ہے!

مرحوم[3] (جگر مُرادآبادی) کی رحلت سے آج بڑا پُرانا گہرا اور مخلصانہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ عمر کی جس منزل میں ہوں، وہاں اِس طرح کے رشتے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۶۴ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۱۳

[3] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۱۸

فطرت کا یہی تقاضا ہے لیکن کیا کروں فطرت کے اِس طرح کے تقاضوں کو محبت اور رفاقت کے تقاضے، تسلیم کرنے سے عاجز و قاصر رہتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ میرے اِس قصور میں کتنے اور بدنصیب شریک ہوں گے ؟

فطرت بہت سے معاملات میں کسی نہ کسی شرط پر انسان سے خوش و ناخوش مفاہمت کر لیتی ہے۔ صرف موت کے مسئلے پر آج تک کسی طرح کی مصالحت پر تیار نہیں ہوئی۔ انسان اور موت کے دیرینہ رشتے و روایات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بھی یقینی ہے کہ ارضی سطح پر آیندہ کبھی کوئی مفاہمت نہ ہو سکے گی۔ لیکن اگر انسان موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے تو موت کبھی انسان کے ان کارناموں کو نابود یا بے نورؔ نہیں کر سکی ہے جو موت سے زیادہ عجیب و عظیم مانے گئے ہیں۔ وہ اِنسان کو تسخیر بھی کس طرح کر سکتی ہے جب انسان سوا ازلی و ابدی ہونے کے ان صفات سے بھی کسی نہ کسی درجے میں متصف ہے جو خدا کے ہیں جن کے طفیل وہ اس زمین پر خدا کا نمائندہ اور نائب ہے اور کیا معلوم بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان خدا میں ازلی اور ابدی بھی ہے !

موت مامور و مجبور ہے۔ وہ کتنا ہی چاہے، اپنے کو بدل نہیں سکتی انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ توفیقِ الٰہی، اور استعدادِ انسانی کے مطابق اپنے کو بہتر و برتر بنا سکتا ہے، لا متناہی حد تک بہتر و برتر! موت کی یہ شکست مسلّم ہے۔ اگر ہم اس طرح سوچنے کا حوصلہ کر سکیں تو محسوس ہوگا کہ انسان موت کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہے۔ ہم میں ایسے اکابر گزرے ہیں، آج بھی موجود ہیں اور آیندہ بھی آتے رہیں گے جن کے ہاتھ میں موت کی حیثیت کھلونے کی رہی ہے اور رہے گی۔ بڑا انسان اپنی شکست میں زندہ رہتا ہے۔

اِس وقت مرحوم کی وفات سے (کسی عزیز کو پہلی بار مرحوم کہہ کر یاد کرنا کتنا

لہ ہم نفسانِ رفتہ، ۲۱۳

تکلیف دہ ہوتا ہے) اُن ساتھیوں اور صحبتوں کی کیسی کیسی یاد تازہ ہو رہی ہے جن سے کبھی اپنی، کبھی اُن کی، کبھی دوستوں کی زندگیاں خوشی سے معمور اور اُمنگوں سے لبریز رہا کرتی تھیں، کہیں گہری، کہیں، ہلکی یہ یادیں ماضی کے ۳۰، ۳۵ سال کی وسیع دھوپ چھاؤں پر محیط ہیں۔

مجھے[1] جگر صاحب کے خاندان کا حال نہیں معلوم، کتنی تعلیم تھی، کس بزرگ کے مُرید یا کس سلسلۂ طریقت یا مَسلک سیاست سے تعلق رکھتے تھے اس طرح کی باتوں میں سے کسی کا علم نہیں۔ جس سے جتنا قریب ہوتا ہوں اُتنا ہی اُس کے بارے میں ان باتوں کی کھوج لگانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ جگر صاحب[2] میرا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اصغر گونڈوی مغفور کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے لیے وُہ اتنا اخلاص و احترام ملحوظ رکھتے ہوں جتنا میرے لیے۔ یہ (بات[3]) میں اس لیے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے۔ میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقہ سے اس کی نمائش کرتا۔ (بہر حال) جگر صاحب سے مجھے یہی . . . . شکایت (رہی) کہ وہ میرے سامنے مُؤدب کیوں ہو جاتے (تھے) مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی اُلجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنر دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اُس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے!

جگر[4] صاحب کے اس خلوص و محبت کو میں نے نباہنے کی برابر کوشش کی لیکن مرحوم اُن غیر معمولی شریف اور فیاض انسانوں میں تھے جن کی مسلسل "نواز شہائے پیدا و پنہاں" کا ساتھ دینے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ روپے پیسے، مال و متاع سے کوئی سلوک کرے تو اس کا بدلہ کر دینا آسان ہے لیکن جو شخص (وہ بھی جگر صاحب جیسا شخص) محبت و احترام کی بیکراں نعمتوں سے کسی کو بہرہ مند کرے اور رکھے

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ ، ۲۱۷ [2] ہم نفسانِ رفتہ ، ۲۱۸

[3] نقوش شخصیات نمبر ، ۳۱۷ [4] ہم نفسانِ رفتہ ، ۲۱۹

اور کسی وقت غافل نہ رہے، اُس سے کون عہدہ برا ہو سکتا ہے! جگرؔ صاحب کے پاس جو دولت تھی اور جسے وہ مجھ پر بے دریغ صرف کرتے تھے اُس سے مبادلہ کے لیے میری ہر دولت ناقابلِ التفات تھی۔

جگرؔ صاحب کی محبت بھی عجیب محبت تھی۔ ہمیشہ اِس فکر میں رہتے کہ میں اُن کی مدارات میں کوئی حصّہ نہ لوں۔ اِس خیال سے کہ مجھے زحمت نہ ہو! اِس سبب سے ایک طور پر میں جگرؔ صاحب سے اِتنا اور اِس طرح قریب نہ ہو سکا کہ اُن کی ذہنی واردات اور رنج و راحت کے محرکات سے براہِ راست اور پورے طور پر واقف ہو سکتا۔ اِس سے شرمندہ ہوں۔ عقیدت و محبت کا پورے طور پر مستحق نہ ہونا لیکن اس کا مورد رہنا شریف آدمی کے لیے اُتنا ہی باعثِ خلش رہتا ہے، جتنا ایک گناہ گار کے لیے، جو اس اندیشے میں مُبتلا رہتا ہے کہ کہیں بے نقاب نہ ہو جائے۔

جگرؔ صاحب[1] بحیثیت مہمان تشریف لاتے تو بیک وقت کتنی خوشگوار باتوں کا احساس ہونے لگتا۔ کوئی بھولی ہوئی لطیف خوشبو آگئی ہو۔ زندگی کی نعمتیں اچھی اِس کے مصائب گوارا اور آلودگیاں قابلِ احتراز معلوم ہونے لگتیں جگرؔ صاحب کے چاہنے والے دو ایک دن پہلے سے گھر کا چکر لگانے لگتے تھے۔ وہ آجاتے تو دن رات اُن کو گھیرے رہتے۔ جگرؔ صاحب کے اِس "حلقے" یا "دربار" میں میں کبھی مُخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اِسے جانتے تھے اِس لیے جب ہجوم ختم ہو جاتا تو صرف یہ اطلاع بھجوا دیتے کہ "ملاقاتی رخصت ہو گئے"۔ میں پہنچتا تو جیسے سر سے پاؤں تک فرطِ تکریم و تشکر سے جگمگانے لگے ہوں، بے اختیار کھڑے ہو جاتے، اسی بے اختیاری سے فوراً بیٹھ جاتے، جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ پھر اُٹھ کھڑے ہوتے اور آس پاس کی چیزیں بے ضرورت اِدھر اُدھر رکھنے لگتے۔ بیٹھ جاتا تو وہ بھی بیٹھ جاتے اور مُسکرانے لگتے جیسے اَپنے اِس مُسکرانے کی شمیم و شبنم کے تخت پر مجھے بٹھا دینا چاہتے ہوں! ..... اُس وقت اُن کا مسکرانا اور کبھی رہ رہ کر ہنس

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۲۱

پڑنا اور جلد ہی کچھ کہنے لگتا تاکہ میں ان کے اس اضطراب وانبساط کو جان نہ سکوں ایسا دل نشین اور قابلِ فخر و احترام محسوس ہوتا کہ میں اِس وقت اُس کو کسی تشبیہہ و استعارے سے بھی واضح نہیں کر سکتا یہاں تک کہ اس کو کسی حسین دوشیزہ یا معصوم سے معصوم تندرست بچّے کے مُسکرانے اور ہنسنے سے بھی تشبیہہ دینا ناکافی سمجھتا ہوں!

جگر صاحب[1] پر بعض زمانہ بڑی سختی کا گزرا ہے ۔ مالی دُشواریوں کے سبب سے پریشان رہتے تھے ۔ اِس کا اظہار اُنھوں نے کسی اور سے کیا ہو یا نہیں، مجھ سے کبھی نہیں کیا یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے ۔ سیرت میں کہیں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو تنگ دستی میں بالضرور اور بڑی شدّت سے اُبھر آتی ہے معمولی اشخاص کا کیا ذکر وہ تو ذرا سے فشار سے بکھرنے لگتے ہیں، اَچھے اچھوں کو اِس منزل میں ڈگمگاتے دیکھا ہے ۔ اَیسے زمانے میں بھی جگر صاحب اچھا کھاتے تھے، اچھا پہنتے تھے، اچھی طرح خود رہتے تھے، اپنے مہمانوں کو رکھتے تھے ۔ کسی پر بُرا وقت آپڑتا تو اَپنے اُوپر سختی جھیل کر اُس کی مدد کرتے ۔

بعض[2] شعرا ایک ایسے مشاعرے یا مواقع کے لیے جہاں نوجوان لڑکیاں اور خواتین موجود ہوتی ہیں، ایسی ناپسندیدہ اور بے باک نظمیں لکھ لاتے ہیں جو نوجوانوں کے حیوانی و شہوانی جذبات کو برانگیختہ و بے قابو کرنے میں معاون ہوتی ہیں اِسے شُعرا اپنا بڑا کارنامہ اور انعام سمجھتے ہیں ۔ دیکھا تو یہاں تک گیا ہے کہ مشاعروں میں اُس نظم کو سنانے کی کوئی فرمائش نہیں کرتا تو یہ شعرا خود نہایت بے غیرتی کے ساتھ اور اتنے ہی بھونڈے پن سے اِشارتاً اس کی یاد دہانی کراتے ہیں! شاید غالبؔ کی پیروی میں جہاں اُنھوں نے ”غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد“ کہا ہے!

جگر صاحب میں بڑی حیا اور غیرت تھی ۔ کہیں کسی محفل میں بیٹھے ہوں ہمیشہ

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۲۴ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۳۹

نظر نیچی رکھتے جیسے اس محفل میں نوجوان خواتین اور لڑکیوں کو اپنی ذمّہ داری اور امانت سمجھتے ہوں۔ بے تکلّف احباب میں بھی بیٹھ کر وہ اِس طرح کے فقرے زبان پر نہیں لاتے تھے جن میں عورتوں سے بے راہ رَوی کے روابط کا اشارہ ملتا ہو، خواہ وہ فقرے کتنے ہی "دَرپردہ" کہے جا سکتے ہوں۔

اِن باتوں کا خیال کرتا ہوں تو جگر صاحب اور اُن کے پُرانے ساتھی شعراء آج کس حیرت وَالم سے یاد آتے ہیں جن کو دیکھ کر اُس وقت تو اتنا نہیں جلتا اَب محسوس کرتا ہوں کہ تہذیب و شرافت بھی دُنیا میں کتنی بڑی نعمت، اِس لیے ذمّہ داری ہے!

بھونپو بے وقت بجا، دل دھک سے ہو گیا۔ حسن عبداللہ رحلت کر گئے ۔۔۔۔ یونیورسٹی کے حال ہی میں "اسٹیوارڈ" مقرر ہوئے تھے۔ اس کام کے علاوہ یونیورسٹی میں رسد رسانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اکڑ[1] نے اور فروتنی دونوں میں یگانہ۔ نہ آہستہ بولتے تھے، نہ چپکے سے کام کرتے ۔۔۔ بڑے شریف گھرانے کے تنہا اُجالا تھے، اَخلاق و وضعداری میں کھرے!

میرے[2] وہ شاگرد تھے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی ہی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا تھا۔ پی ایچ۔ ڈی کی فکر میں لندن گئے۔ لڑائی چھڑی تو سلسلہ منقطع کر کے ہندوستان واپس آ گئے۔ گریجویٹ ہوتے ہی وکالت شروع کر دی تھی لیکن[3] ان کا دل اُردو لکھنے پڑھنے میں لگتا تھا۔ کچھ دنوں آگرہ میں اُردو فارسی کے لیکچرار رہے۔

میرے[4] سامنے وہ سگریٹ نہ پیتے۔ مَیں دفعتاً اُن کے آفس پہنچ جاتا اور وہ سگریٹ پیتے ہوتے تو اُسے مسل کر چُھپا دیتے یا پھینک دیتے اور سرو قد کھڑے ہو جاتے۔ میں نے ان سے بارہا کہا اس تکلّف میں کچھ دھرا نہ تھا، اِس سے مجھے آپ ہی سے نہیں، خود اپنے سے بیگانگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۲۶۳ [2] گنج ہائے گراں مایہ، ۲۶۴

[3] گنج ہائے گراں مایہ، ۲۶۴ [4] گنج ہائے گراں مایہ، ۲۶۵

یہ بات میرے لیے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کو یہی اچھا لگتا ہے۔

وہ[1] جذباتی آدمی تھے۔ جذباتی آدمی بالعموم مخلص ہوتا ہے۔ اس کے دل میں کھوٹ کپٹ کا بڑی مشکل سے گزر ہوتا ہے۔ طبعاً وہ عوام کے آدمی تھے اور چھوٹوں کی حمایت میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مجھے اُن کی یہ ادا بھاتی تھی!

میرا وہ بہت خیال کرتے تھے۔ اُن کو دیکھ کر میرے دل میں شگفتگی اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا، اور جس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی یہ حالت ہوتی ہے، اُس کے مرنے کا مجھے بڑا غم ہوتا ہے لیکن اِس غم کا مقابلہ اُس غم سے کیسے کروں اور کون کر سکتا ہے جو مرحوم کے بوڑھے باپ، بوڑھی ماں، بھائی پہ فدا ہونے والی بہنوں نیک نفس بیوی اور معصوم بچوں کا ہوگا۔ ایسوں کا غم اور ایسا غم اس رحمتِ بیکراں کی طرف سے مغفرت کی بشارت ہے جس کے جوار میں مرحوم پہنچ گئے۔ میں کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہوں!

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے

کندن[2] کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا۔ معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۳۰، ۳۵ سال سے، اِتنے دنوں سے اِس پابندی سے کہ اِس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آ جائے گا!

طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدّتِ ملازمت ختم کی، یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اُسے گھنٹے بجاتا چھوڑا، گھنٹے کی آواز روزمرّہ کے اوقات میں اِس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آ رہی ہو جیسے وہ

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ، ۲۶۶ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۵۹

وظایفِ جسمانی کے اُن معمولات میں داخل ہوگئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا!

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کُندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا، اَرے کُندن مر گیا! اِتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسبِ معمول یہی سمجھتا رہا کہ کُندن بجا رہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہوگیا کہ کُندن مر گیا۔ نادانستگی میں اُس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا!

پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں نظامِ فطرت میں اِس سے زیادہ ناقابلِ التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اِس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے، نہ دُنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اِس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بیزاری کے احساس میں اِضافہ ہوگیا۔ کیسے نہ کہوں کہ اَفراد کا متاثر نہ ہونا، نظامِ فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ اِنسان کی جس نہج پہ ترکیب ہوئی ہے اُس میں تو اَفراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی "تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی!"

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا، کتنوں کو چھوٹا، کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شئے نہیں — اِس ۳۰، ۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دُور ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اِس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں — اُن سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں، یہ سب ہوتا رہا لیکن کُندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور مُعتبر ہونے کا اعلان تھا لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کُندن مر گیا۔ تقدیر

ؑ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۶۱

کے اِس معمول میں فرق نہ آیا نہ رندِ ہیچ تو ئی یا زفتِ ہیچ منی ! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی !

یونیورسٹی میں . . . . تقریبیں . . . . چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں، نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اُسی کے بس کی بات تھی ۔ چیخ پکار، نہ دوڑ دھوپ نہ تو تکار ! علی گڑھ میں سر فن مولا نہیں تو ہر فن مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلّمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اُس کو اِس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے اُن کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا مؤکل قبضے میں ہو !

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لیے ایک . . . . اچھا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا ۔ "کالج کا نمک کھانے" کا ایک تصرّف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا، تقریب منائے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے ۔ ستم یہ ہے کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اِسی پیمانے پر کرنے، کرانے یا دیکھنے کا جی چاہتا ہے ۔ اِس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اِس "حرکت" سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا ! . . . کالج کا "نمک کھانے" کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا، وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اُتنے ہی محدود ہوتے ہیں ! کندن بھی اِسی تقدیر کا شکار ہوا !

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات

---

۵۱ ہم نفسانِ رفتہ ، ۱۶۹ ۵۲ ہم نفسانِ رفتہ ، ۱۶۹

۵۳ ہم نفسانِ رفتہ ، ۷۶ – ۱۷۵

اُمڈے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اُس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفاشعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں اُن کو روکا جا سکتا یا ان سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج یا کل دُنیا کا چاہے جیسا رنگ ہو کُندن کی یاد تازہ رہے گی۔۔

آج کی دُنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پُرانی ہو جاتی ہے۔ یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پُرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پُرانی دُنیا کی یہ بات قابل فخر ہے یا نئی دُنیا کی وہ، اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پُرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کُندن کی تھی!!

محمد ایوب عباسی مرحوم[1] . . . . . اتنے اچھے تھے، اتنے ارزاں تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ . . . . وہ موجود تھے تو اُن کی مثال نعائم فطرت کی تھی۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی لیکن ان میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آجائے تو پھر دیکھیے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی ناقابلِ التفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔ ایوب ایسے ہی تھے!

میری[2] ہی نہیں میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی اُن سے بڑی پُرانی ملاقات چلی آتی تھی اور میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر دخیل تھے اور اُن کی موت نے ہم سب کو کیسا بے قرار و مایوس اور کس درجہ بے دست و پا کر

لہ ہم نفسانِ رفتہ، ۱۷۷   ۲ہ گنج ہائے گراں مایہ، ۱۵۱

۳ہ گنج ہائے گراں مایہ، ۱۵۲

دیا ۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے اور ایک بڑے مستند شریف ، ذی علم اور صاحب خیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے ۔ مَیں علی گڑھ میں تھرڈ ایئر میں تھا جب ایوب فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے ۔ بی ۔ اے ، ایل ایل ۔ بی ہوکر پروسٹ آفس میں ملازمت کر لی اور علی گڑھ ہی میں رہ بس گئے ۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں و خوردوں کے ہم سبق تھے ۔ علی گڑھ آئے تو ہم سب ایک ہو گئے اور سترہ اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے ۔

مجھ پر[1]، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے ۔ ایک[2] دفعہ بیوی بچے مکان گئے میں اور دو بچیاں رہ گئیں ۔ باورچی یک بیک چلا گیا ۔ برسات کا موسم تھا میں دن بھر مارا مارا پھرا تھا ۔ کوئی پانچ چھے بجے شام گھر واپس ہوا ۔ دیکھا تو ہر چیز قرینے سے مکان میں لگی ہوئی ہے ۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں ۔ ذرا ہی دیر میں ایوب صاحب آنکھ ملتے ، راکھ میں لت پت باورچی خانے سے ڈانٹ کر بولے : جی گلچھرے اڑا آیئے ، لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں ، چولہا ٹوٹا ہوا ہے ۔ مَیں نے کہا کیا ہوا (کچھ سخت و سست الفاظ کے بعد) آخر ڈائننگ ہال کو کیا ہوا تھا ، وہیں سے انتظام کر لیا ہوتا ۔ بولے : جی شام کے پانچ چھے بجے آپ کے لیے ڈائننگ ہال سے باقر خانیاں نہ آجاتیں ، بچیاں کیا کرتیں ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آفس سے براہِ راست شہر گئے وہاں سے بچیوں کے لیے آم اور پکانے کے لیے کچھ ساگ ترکاری لائے ۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں پل پڑے ۔ ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے اُلجھے ہوئے تھے ۔ مَیں نے کہا بھئی ایوب خدا کے لیے کچھ تو ٹھکانے کی چیز کھا پی لیا کرو ، ورنہ آنکھیں بھیک مانگنے لگیں گی ۔ بولے : جناب نے بھی تو منجن ہی کھا کھا کر عینک کے نمبر بڑھائے ہیں ۔ کھانا[3] پینا ختم ہوا تو اپنی کھڑی چارپائی بچیوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ ، ۱۵۳ [2] گنج ہائے گراں مایہ ، ۱۵۶

[3] گنج ہائے گراں مایہ ، ۱۵۷

گئے اور اُن سے اُنہی کی دلچسپی کی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں، جب وُہ سو گئیں تو سَر سے پاؤں تک کمبل تان کر خاموش ہو گئے۔

ایوبؔ صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا اُن سے عزت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ اُن سے محبت کرنے میں اُسے لُطف آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی، ایک طرح کی پُر افتخار اور اطمینان بخش تسکین جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ محبت کی ایک قسم وُہ بھی ہوتی ہے جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے جیسے لوگ اپنے "کتّے" سے کرتے ہیں! یعنی اُسے سمجھتے "کتّا" ہی ہیں لیکن چومتے چمکارتے رہتے ہیں۔ اِس قسم کی محبت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں لیکن ذہنیّت یہ ہوتی ہے کہ محبت یا اَخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار سے تو لوگ اُنہیں انسان سمجھیں لیکن خود اُن کے جذبۂ فرعونیت کی تسکین ہو۔ یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں؛ اور اس طور پر اُس کی زندگی میں اُمید و فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہم چشموں میں بیٹھنے اور سر بلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اِس طرح کی محبت یا عزّت ایوب صاحب سے کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایوب صاحب وُہ تھے جن کے لیے ہر شخص اپنی عزّت یا شہرت کو داؤ پر لگا دینے کے لیے بلے تامّل تیار ہو سکتا تھا۔ ایوب صاحب سے محبّت نہ کیجیے یا اُن کی عزّت نہ کیجیے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا احساسِ ذمّہ داری کی کمی ہے![1]

وُہ[2] اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے۔ سب کے سب ایوّب صاحب کی شرافت اور کُشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے درپے رہتے تھے اِس کا اُنھیں غم تھا۔ . . . . ایک دن بہت اُداس تھے، آلِ ثروت میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اُن کا جی بہل جائے معلوم نہیں کیا ہوا کہ وُہ یک بیک

---

[1] گنجہائے گراں مایہ، ۱۶۳ [2] گنجہائے گراں مایہ، ۱۶۶

آبدیدہ ہوگئے ۔ میں نے پوچھا تو بڑے تامل کے بعد واقعہ سُنایا ۔ وہی عزیزوں کی دنائیت اور شقاوت کا۔ میں نے کہا ایوب صاحب ! آپ بددل نہ ہوں ۔ آپ کا کوئی قصور نہیں، قصور ہے تو صرف اِتنا ہے کہ آپ خوش حال اور نیک نام کیوں ہیں ہمارے آپ کے اعزّہ کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اُٹھا لی گئی ہے ۔ اغیار کو تو یہ مسرور اور بافراغت دیکھ کر خوش ہوں گے اور فخر کریں گے لیکن اپنوں کو کھاتا پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصّہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے ۔ یہ اپنے نکھٹّو پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا حربہ سمجھتے ہیں ۔ یہ اپنے کھاتے کماتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اُن تمام نعمتوں پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا ہے جو بصورتِ دیگر اُن کے قبضے میں آتیں ۔ وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور جو فراغت، ناموری اور نیک نامی سے رہ رہا ہے اُس نے کتنی محنت کی ہے اور اذیت اُٹھائی ہے اور یہ کچھ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ اِس اِنفرادی کمزوری اور کمینگی نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کرلیا ہے۔ جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی ۔ سرمایہ و مزدوری کی جنگ اپنی جگہ پر حق بجانب ہے اور جہاں تک اُس کے اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے اُس کے معقول ہونے میں شُبہ بھی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اِس اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے درپے بیشتر وہی لوگ ہیں جو نکھٹو بر خود غلط اور کینہ پرور ہیں۔ دُنیا کے کسی آشوب کا مطالعہ کیجیئے آپ کو بالآخر یہی نظر آئے گا کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی آپ ہی سوچیے کیا مزدور اور کاریگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اِس دنیا میں قابلِ عزت اور لحاظ نہیں ہے ۔ دُنیا کی نجات، دولت یا دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں ہے بلکہ محنت اور قابلیت کے صحیح احساس و تنظیم پر ہے ۔ میں آج کل بازی گروں کے اُصولِ تقسیم کا بالکل قائل نہیں جس سے "دولت" اُن کے ہاتھ میں جائے اور "مساوی" میرے ہاتھ میں رہ جائے !

آخر میں میں نے اُن سے کہا ! ایوبؔ صاحب اپنا کام کیے جایئے ۔ دولت

وشہرت کا حساب عزیزوں کو نہیں ، اللہ تعالیٰ کو دیا جائے گا ۔ البتہ آپ اس کے لیے تیار رہیے کہ جتنا اللہ آپ کو کارگزار ، فارغ البال ، نیک نام اور بھلامانس بنائے گا اُتنا ہی شیطنت آپ کی دشمن بنتی جائے گی ۔

مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے اُنھیں میرے ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملاکر بہت خوش ہوتے۔ پھر بڑا اصرار کرتے کہ میں اُن سے اُن کے گھر یا جائے قیام پر جاکر مل آؤں، یہی نہیں بلکہ جس کسی کو تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے یا اُس کے ہاں خوشی کی کوئی بات ہوتی تو مجھے خبر کرتے کہ میں وہاں ہو آؤں ۔ میں ایسا کر دیتا تو اُن پر مسرت اور شکر گزاری کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ ظاہر ہے اِس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ میری اِس بھلمنساہٹ کی لوگ قدر کریں لیکن یہ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی ۔ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا بات سے اُنھیں تقویت یا مسرت پہنچی تھی، اُس میں وہ مجھے شریک کر لینا چاہتے تھے ۔ دوسرے یہ کہ میں نے اُن کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اُس پر اِستناد کی مہر لگ گئی، تیسرے یہ کہ اُنھوں نے جس کو مجھے ملایا اُس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھ ایسے (بزعم خود) معقول آدمی سے اُسے متعارف کیا ۔ بظاہر یہ باتیں دُور ازکار اور خود میرے برخود غلط ہونے پر دال ہیں اور اپنے مُنہ سے ان کا تذکرہ کرنا میرے لیے بڑی بھدی (بھاری) بات ہے لیکن میں مرحوم کی بعض تحت شعوری سرگرمیوں سے واقف ہوں ۔ اُن کا مقصد وہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے ۔۔

یونیورسٹی[1] سے ایک قطعۂ زمین ، مکان بنانے کے لیے میں نے پٹہ پر لی تھی۔ یہ ایوب صاحب کے مکان سے مُتصل تھی۔ برسوں میرے پاس اُفتادہ پڑی رہی۔ مرحوم کا مُسلسل اِصرار رہا کہ رشید صاحب مکان بنوا لیجئے۔ ہر شخص بنوا رہا ہے آخر آپ کیوں نہ بنوائیں ۔ تھوڑا سا حصہ چھوڑ دیجئے گا ، اُس میں ایک جھونپڑا ڈال لوں گا ۔ مویشی پالوں گا ، مُرغیاں رکھوں گا اور کھیتی کیاری کروں گا ۔ میں نے کہا، میں

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ ، ۱۶۹

مکان نہ بنوآؤں گا۔ ساری زمین آپ کی ہے جو چاہے کیجئے مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سے کچھ ہوتا ہے یا نہیں۔ کہنے لگے جی نہیں، آپ مکان بنوا یئے میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ یہاں آپ کا مکان ہو۔ آپ تمام روپیہ خرافات میں اُٹھاتے ہیں مکان ہوگا تو ایک چیز ہو جائے گی آپ قریب ہو جائیں گے وسیع عالیشان مکان میں سمجھوں گا میرا ہی مکان ہے۔ جب چاہوں گا چلا جایا کروں گا۔ ایک ٹھکانہ ہو جائے گا۔

مکان بنا لیکن ایوب کا ارمان پورا نہ ہوا۔ اب وہ اور اُن کا ارمان دونوں یونیورسٹی کے گورستان میں آسودۂ راحت ہیں۔ یہاں پہنچ کر مجھے بے اختیار اپنا چھوٹا چچا زاد بھائی جواں مرگ رفیق یاد آگیا جس نے بارہ تیرہ سال تک مرتے دم تک مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر اپنی روشن اور رنگین زندگی کی وہ متاع نثار کر دی جس کی قیمت اِس دُنیا میں آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔ آہ کیا نثار ہونا اور کس کس طرح نثار ہونا! جس نے تمام عمر یہ خیال دل میں نہ آنے دیا کہ اپنی استعداد سے اپنے آپ کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنا چاہیے بلکہ اِسی کا قائل رہا اور اِسی پر مرمٹا کہ اُس کی ہر نعمت اور اُس کی ہر متاع میرے اور میرے بیوی بچوں ہی کو راحت و فائدہ پہنچانے کے لیے تھی۔

بہادر اور باوقار رفیق بھی مکان کا ارمان اپنے ساتھ لے گئے۔ مَیں اپنا مکان دیکھ کر مسرور اور مطمئن ضرور ہوتا ہوں لیکن جب رفیق اور ایوب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہوکر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں اُنھیں بھی مکان میں گلے لگاتا۔ اُن کا خوش ہونا اور دھرم مچانا دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا کہ مَیں نے بھی کچھ کام کیا!

مُدّتِ حیات[1] کا حساب کتاب سال اور ماہ کے گزرنے سے نہیں کرتے عزیزوں کی مفارقت سے بھی کرتے ہیں۔ وہ اُٹھا لیے جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ختم ہوگئی۔ عمر چاہے جہاں تک پہنچے، عمر پانے کو زندہ رہنا نہیں کہتے۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ،

زندگی اپنی زندگی سے اتنی عبارت نہیں ہوتی - جتنی عزیزوں کی زندگی اور خوشی سے ہوتی ہے - یہ نہیں تو زندہ رہنا اور نفس کے مطالبے پورے کرتا رہنا ایک مسلسل بے غیرتی اور بڑھتی ہوئی تنہائی اور تاریکی ہے جس کو نہ چھپا سکتے ہیں نہ اس سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اُسے حق بجانب بھی نہیں قرار دے سکتے۔[1]

یہاں اب تک جو کچھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے وہ کچھ غیر متعلق سا ہے ... میں دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں موضوع زیرِ بحث (اپنی ذات) سے نہایت طول طویل انحراف ہو گیا ہے لیکن یہ انکشاف خود راقم السطور کا ہے ناظرین میرے اعتراف سے قبل اس کا احساس خود بخود کبھی نہیں کر سکتے تھے یہ بھی انشا پردازی اور سخن سرائی کا ایک گُر ہے۔ اُستادوں نے ایک گُر تو یہ بتایا ہے کہ مخاطب کو احمق سمجھو اور پھر تم کو حماقت کرنے میں کہیں جھجک نہ ہوگی - دوسرا گُر یہ ہے کہ بکواس یا "لکھواس" (برعایتِ قافیہ) کیے جاؤ۔ البتہ موقع بموقع عنوان یا مبحث دہرا دیا کرو، بیڑا پار ہے لیکن میں مخاطب حضرات کو ایسا نہیں سمجھتا جیسا مجھ سے بہتر لوگوں نے اُن کو سمجھا ہے تاہم اُن کے لیے اتنی رعایت گوارا کر لوں گا کہ کبھی کبھی اُن کو بتا دیا کروں کہ موضوع زیرِ بحث کیا ہے!

(بہرنوع) جو لوگ اس جہاں سے (بہت پہلے) اُٹھ چکے ہیں اُن میں (بھی) کچھ ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا اکثر جی چاہا ہے کاش میں اُن کی زندگی میں اُن سے مل سکتا! اُن میں ایک غالب بھی ہیں!!

غالب کی گرفت مجھ پر اس لیے نہیں ہے کہ بڑے شاعر تھے بڑے شاعر تو اور بھی ہیں میں تو اُن سے دوستی کرنا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ ایک عہد تھے - ایک مزاج ایک علامت یا ایک عالم تھے ان کے باوجود ہمارے ہی آپ جیسے تھے حال میں کسی مستقبلِ بعید کا نمودار ہو جانا کتنی طرفہ بات ہے! میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان تجربہ کا ردِ عمل کہاں کہاں کس طرح ہوتا تھا! اور خود مجھ پر کیا ہوتا؟[2]

---

[1] مضامین رشید، ۹۹ [2] نقدِ غالب، ۳۱۴

11

"احباب ، اساتذہ ، اعزہ اور رُفقا سے قطع نظر کالج کے کتنے طرح طرح کے کردار یاد آتے ہیں۔ اِس لیے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا ہے کہ سیرت اور شخصیت یا بحیثیتِ مجموعی میری قسمت کی تشکیل میں ان کو دخل ہو تو عجب نہیں ——"

(احباب، اساتذہ، اعزہ اور رُفقا)[1] سے قطع نظر ایم۔ اے۔او کالج کے کتنے طرح طرح کے کردار بے اختیار یاد آتے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا ہے کہ سیرت اور شخصیت یا بحیثیت مجموعی میری قسمت کی تشکیل میں ان کو دخل ہو تو عجب نہیں۔ مثلاً میری سائڈ (سید محمود کورٹ مغربی) کا بیرا سراج ۱۹۱۵ء میں پہلی بار اُن سے سابقہ ہوا جہاں دس برس پہلے سے اُن کا عمل دخل تھا۔ اَب تک بفضلہ بقیدِ حیات ہیں۔ ایک دن اتفاق سے نظر آگئے۔ آنکھوں سے کچھ مَعذور ہو گئے ہیں۔ قریب پہنچ کر آواز دی تو پہچان گئے۔ کتنی باتیں اور یادیں تازہ ہو گئیں! اُن کو مَیں نے ہمیشہ ایک ہی حال میں پایا۔ نہ خوش نہ ناخوش، نہ سراسیمہ نہ مُستعجل نہ مُتامّل۔ نہایت کم گو، ہر سوال کا جواب مختصر سے الفاظ میں، اِس اندیشے سے قطعاً بے نیاز رہ کر کہ جواب کے عواقب کیا ہوں گے۔ ہر کام مُقررّہ وقت پر کر ڈالنا، یہ ناممکن تھا کہ اس میں دیر سویر ہو۔

دوپہر کو شہر جانا اور اپنے کمرے کے طالب علموں کی ضرورت کی چیزیں خرید لانا معمول تھا۔ یہ کبھی نہ ہوا کہ سراج کوئی چیز بھول گئے ہوں یا دام پر لڑکوں سے

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۷۱ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۷۳

حجت کی نوبت آئی ہو۔ یوں بھی اُس زمانے میں حساب کرنے میں جھگڑنا، چاہے وہ کسی سے ہو، اَچھی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ نہ کبھی بدتمیزی کی، نہ چوری کی، نہ انعام مانگا۔ کسی نے دے دیا تو اُس پر شادمانی اور شکر گذاری کا بھی اظہار نہیں کیا، یا کرتے ہوں تو اُن کا کوئی خاص طریقہ ہو گا جس کا علم دینے والے کو کبھی نہ ہُوا۔

۱۹۱۵ء سے اَب تک اُن کو یکساں حال میں دیکھ رہا ہوں۔ درمیان میں کیسے کیسے انقلاب آئے اور گزر گئے۔ اُس دن سراج کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ اُسی استغنا اور پامردی سے اُسی جگہ پر جمے ہوئے ہیں، جہاں مَیں نے اُن کو اُنھوں نے مجھ کو چھوڑا تھا۔ جیسے اِس دُنیا کا تمام نائو نوش یا نالہ و نفیر ان کے لیئے "بدرِ دہر نمی آذرد" کا مصداق ہو۔

مَیں نے چھ سال مُسلسل بورڈنگ ہاؤس میں گزارے اور صرف ایک پوسٹ مین سے سابقہ رہا۔ اُن کا نام یاد نہیں رہا۔ ہم سب اُن کو "شیخ جی" کہا کرتے تھے اور شیخ جی کا جیسا حُلیہ ہو سکتا ہے، بجنسہٖ اُن کا تھا۔ ہمہ وقت خلجان میں مُبتلا نظر آتے۔ چال ڈھال جسم و جان بات چیت، سبھی سے۔ جیسے غلط پتے پر کوئی رجسٹری بیمہ یا منی آرڈر دے آئے ہوں اور سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کریں۔

ظاہر ہے کہ بڑی تعداد میں طلبا کے خطوط اور منی آرڈر آتے ہوں گے شیخ جی ہر طالب علم سے آشنا تھے۔ صورت سے اتنے نہیں جتنے اُس کی آواز سے گھنٹہ بجا کلاس ختم ہوئی۔ سارے لڑکے کلاس روم سے نکل آئے ------ اِس موقع پر فرض کر لیجئے شیخ جی کا بھی گزر ہُوا۔ لڑکوں نے گھیر لیا۔ سبھی کہہ رہے ہیں "شیخ جی میرا ہے"؟ یعنی میرا کوئی خط یا منی آرڈر ہے اور شیخ جی بغیر کسی کو دیکھے صرف آواز پہچان کر کہتے جا رہے ہیں "آپ کا ہے" یا "آپ کا نہیں ہے"۔ یہ دونوں فقرے اِتنی جلد جلد اور اِس درجے بے اختیار ہو کر کہتے کہ اُس زمانے میں تفریحاً ہم سب اسی لہجے کی نقل کرنے لگے تھے۔ شیخ جی کا یہ کہہ دینا کہ "ہے" یا "نہیں ہے"، کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔

ل آشفتہ بیانی میری، ۱۷۴

نئے لڑکوں کو کبھی کبھی یقین نہ آتا۔ اس لیے وُہ خطوں کا پلندہ دیکھنے پر اصرار کرتے اور یہ شیخ جی کے قائل ہو جاتے۔

کھمّانی تفریح[1] تھے، ٹریجڈی تھے، بھید تھے، علامت تھے، تقدیر تھے جانے کیا تھے۔ شاید یہ سب ایک ساتھ تھے اتنے اور اس طرح کے بوڑھے کہ عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ چونچال اِتنے کہ نوجوان نہیں بچّے کا دھوکا ہوتا تھا۔ بات زیادہ دیر تک نہیں کر پاتے۔ سپاہیوں کی طرح قواعد پریڈ کرنے لگتے اور معلوم نہیں کس کس زبان کے الفاظ میں پریڈ کے احکام نافذ کرتے ۔۔۔ پان بیچتے تھے۔ لکڑی کی چھوٹی سی بھدّی گاڑی تھی جس پر سر کی ڈال رکھی تھی۔ وہ بھی جگہ جگہ سے خستہ۔ تمام دن رات گئے تک، اِسی گاڑی کو کھینچتے دھکیلتے بورڈنگ ہاؤسوں کا چکر لگاتے رہتے۔ پان کے سامان کے علاوہ اپنی زندگی کے لیے جن چیزوں کو ضروری سمجھتے تھے، وُہ سب اِسی گاڑی میں رکھ لی تھیں، گویا گاڑی نہ تھی پہیّے پر اُن کا مکان تھا!

کانوں میں عجب طرح کی آواز آنے لگتی جس سے معلوم ہو جاتا کہ آس پاس کہیں کھمّانی آ گئے ہیں۔ کسی طرح یہ پتہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کیا صدا لگاتے تھے۔ واقعی کچھ الفاظ تھے یا صرف حلق میں پھنسی ہوئی یا فضا میں بھٹکی ہوئی کوئی مُبہم آواز یا صرف ایک گونج! پان کیا بناتے تھے صرف لیپ پوت کر دیتے تھے۔ اس کا سارا سامان گاڑی کے اندر ہوتا جو باہر سے بالکل نظر نہ آتا لیکن اُن کا ہاتھ اُنھیں اجزا پر پڑتا جن کی ضرورت ہوتی۔

ترنگ[2] میں ہوئے اور اکثر رہا کرتے تھے تو پان دے کر فوجی قاعدے کا سلام کر دیا۔ آپ کی بھی طبیعت گدگدائی تو کہہ دیا "کھمّانی تمہاری قواعد دیکھنے کو جی چاہتا ہے" کھمّانی گاڑی کے اندر سے ڈنڈا نکال کر قواعد شروع کر دیتے۔ خود کمانڈ دیتے خود ہی پریڈ کرتے۔ کیا کمانڈ دیتے تھے، نہ وُہ جانتے تھے، نہ ہم آپ سمجھ سکتے

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۷۴

[2] آشفتہ بیانی میری، ۱۷۸

تھے۔ کسی نے فرمائش کر دی " کھمّانی انگریزی ناچ دکھاؤ" ۔ کھمّانی ڈنڈے کو "میم صاحب" قرار دے کر ناچنے لگتے جی میں آگیا تو ڈنڈا پھینک دیا اور دو چار پینترے ہندوستانی ناچ کے بھی دکھا دیئے ۔ کھمّانی بھولے بسرے یا عالم بے خبری میں محض ذرا دیر کے لیے اپنی بیوی کو یاد کرتے جسے وہ میم صاحب کہا کرتے تھے۔ ہم سب بھی تفریحاً میم صاحب ہی کہہ کر اُن کی بیگم کا ذکر چھیڑتے ۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کھمّانی کی زندگی میں کہیں کوئی ٹریجڈی ہے جس کو وہ اُپنے طرح طرح کی حرکتوں یا کرتبوں سے بھُلانے کی کوشش کرتے ہوں، جیسے ایک سرد سنسان تنہائی میں اسیر ہوں جس سے رہائی نصیب نہ ہوتی ہو ۔ کسی نے پان کے پیسے دے دیے تو احسان نہیں ۔ کھمّانی کسی شغل میں ہوں کوئی طالب علم قواعد یا ناچ کی فرمائش کر دیتا تو سب کام چھوڑ کر دکھانے بتانے لگتے ۔

کھمّانی کسی کو پہچانتے نہ تھے ۔ پان ہر ایک کو بے تکلف دے دیتے تھے ۔ کوئی دام دینا بھول جاتا، یا اُس وقت پیسے نہ ہوتے اور معذرت کر کے، یا اِس کے بغیر چلا جاتا تو اُن کو خبر نہ ہوتی ۔ اُس کا جب جی چاہتا دام چُکا دیتا ۔ کھمّانی یہ بھی نہ پوچھتے کہ دینے والا کون تھا ۔ کب کے دام چاہئیں تھے یا کتنے چاہئیں تھے۔ جیسے پان دے کر وہ سب کچھ بھول جاتے، اپنے کو بھی، جیسے اُس عالم میں پہنچ جاتے ہوں جہاں زمانہ خرام میں نہ ہو، قیام میں ہو!

کہیں اُن کا ذکر آتا یا آواز آجاتی تو ایک طرح کی بشاشت کی لہر دوڑ جاتی تھوڑی دیر کے لیے جیسے مصروفیت اور مکروہات ختم ہو جاتیں ۔ گویا کھمّانی کا دور تھا ۔ اُن کا پان کھایا جائے گا اور اُن سے جی بہلایا جائے گا ۔

ایم ۔ اے ۔ او کالج کے عہد میں بی ۔ اے ، ایم ۔ اے کا امتحان دینے الٰہ آباد جانا پڑتا تھا اور مُسلم بورڈنگ ہاؤس میں طعام و قیام کا بندوبست ہوتا ۔ ہر طرح کی آسائش اور آزادی میسر رہتی ۔ وہاں کے بورڈرز (Boarders) اور اُن کے مہتمم، بڑے اخلاص و احترام سے پذیرائی کرتے اور ہمارا بڑا خیال رکھتے ۔ باہم

محسوس کیا گیا کہ سب کچھ ملتا ہے، علی گڑھ نہیں ملتا! یہ کمی کس طرح پوری کی جائے۔ ایک دن اسی طرح کی گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک طرف سے کھمّانی کی آواز آئی۔ سب اُچھل پڑے کہ "بس کھمّانی کو ساتھ لیا جائے گا" ہم جو خلا محسوس کر رہے تھے، اُس کو صرف کھمّانی پورا کر سکتے تھے، چنانچہ اُن کو الہ آباد لے گئے۔

کسی کو معلوم نہ تھا کھمّانی کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور اُن کی سرگزشت کیا تھی۔ ایک دن معلوم ہوا کہ اُسی فضا میں گم ہو گئے جہاں کتنے دنوں سے اُن کی صدا گم ہونے کے لیے سرگرداں تھی!!

گزشتہ اوراق میں جن اصحاب ----- کے بارے میں عرض کیا گیا ہے، اُن کے علاوہ کتنے اور ممتاز و منفرد کردار ذکر ہونے سے رہ گئے جو ذہن کے دھندلے اُفق پر بار بار اور بے اختیار اُبھرتے ہیں لیکن اِن صفحات میں اُن سب کا ذکر میرے لیے بڑا مشکل ہے۔

یہ داستان[1] یوں بھی نامکمل ہے لیکن میرا خیال ہے کہ علی گڑھ کے بسکٹوں کا ذکر نہ کیا گیا تو نامکمل ہونے کے ساتھ یہ ناقص بھی رہ جائے گی۔ یہ بسکٹ یہاں کی زندگی میں بہت زیادہ دخیل رہے ہیں۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے عہد میں اِس کی مانگ اور کھپت ناشتے کی تمام دوسری چیزوں سے زیادہ تھی۔ اس لیے کہ سستے، مزیدار اور "بھاری بھرکم" ہونے کے علاوہ ہر وقت، ہر جگہ مل جاتے اور اپنے کھائے جانے میں کسی تکلّف یا اہتمام کے محتاج نہ ہوتے۔ جب چاہا، جہاں چاہا، جس طرح چاہا کھایا اور "فارغ ہوئے شتابی سے"[2] طالب علمی کے زمانے میں جب اشتہا بالعموم قوی اور جیب بالخصوص ہلکی ہوتی ہے، یہاں کے بسکٹوں کی یہ صفات نظر انداز نہیں کی جا سکتیں! علی گڑھ کا کوئی طالب علم ایسا نہ ہوگا جو ان کی کرامات سے واقف نہ ہو۔

اَب یہاں بوڑھے غلام حسین (بسکٹ والے) یاد آتے ہیں جو کالج میں یہ نعمت ہمارے لیے فراہم کیا کرتے تھے۔ اُن کا سراپا، اُن کا خوانچہ، اُن کی چال، اُن کا ڈنڈا

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۸۰ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۸۱

جس کی یکساں وقفے کی ہموار کھٹ کھٹ سے ہم کو خبر ہو جاتی کہ غلام حسین آگئے۔ صاف لباس میں شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو کبھی اپنی یا اپنے بسکٹوں کی جوبلی منانے کا خیال آجاتا تو ایک وقت میں ایک لباس، کرتہ یا پاجامہ صاف پہن لیتے اور اس کا انتقام اس طرح لیتے کہ دوسرے کو اور میلا کر لیتے یا تضاد کی وجہ سے زیادہ میلا نظر آتا۔ ٹوپی کے بجائے خوانچہ استعمال کرتے۔ حساب کسی سے ہفتہ وار ہوتا، کسی سے ماہ وار بہتوں سے "علی الحساب"!

غلام حسین کا ایک مصرف اور تھا۔ آج کل جلسے جلوس کی رونق کا مدار اس پر ہے کہ ہائے ہائے یا زندہ باد و مردہ باد کے نعرے کس بے جگری یا بے غیرتی سے لگائے جاتے ہیں۔ غلام حسین کے عہد میں یہ تقریب اس طرح منائی جاتی کہ رات کے وقت کھانے کے بعد ایک بورڈنگ ہاؤس سے آواز بلند ہوتی "غلام حسین" پاس کے بورڈنگ ہاؤس سے اُس کا جواب دیا جاتا "بسکٹ والا" پندرہ بیس منٹ تک یہ سوال جواب طرح طرح کے اونچے نیچے سُروں میں ہوتا رہتا اور پھر بند ہو جاتا۔ دوسرے دن معلوم ہوتا کہ وجۂ احتجاج کیا تھی جس کو دور کرنے کے لیے ضروری کارروائی عمل میں آتی۔ نہ کہیں احتجاج ہوتا، نہ جلوس نکلتا، نہ اس کارِ خیر میں شریک کرنے کے لیے سکول کے بچوں کو دعوت دی جاتی، نہ کسی کی آبرو یا عافیت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا!

۱۹۱۷ء میں ڈیوٹی ڈیپوٹیشن Duty Deputation کے ساتھ کلکتہ، چٹاگانگ، رنگون، میمیو وغیرہ جانا ہوا تو علی گڑھ کا بسکٹ اور مکھن زادِ راہ کے طور پر لیا گیا۔ جب تک سفر میں یہ ساتھ رہے یہی محسوس ہوتا رہا جیسے ہم علی گڑھ ہی کی فضا میں ہیں ------ اس دورے میں بعض "بڑے سخت مقام" آئے لیکن ان بسکٹوں کے سہارے ہم اُن سے اسی آسانی سے گزر گئے، جس طرح سے اقبال کو خیال تھا کہ وہ "مقامِ عقل" سے گزر گئے تھے! چٹاگانگ میں ایک مسلم بورڈنگ ہاؤس میں قیام کرنا پڑا جہاں سونے کے لیے تخت اور مبتلا ہونے کے لیے ہیضہ موجود تھا۔ کھانے پینے

لہ آشفتہ بیانی میری،

کا سامان دیکھ کر لرزہ بھی طاری ہونے لگا ---- اس موقع پر ہماری جان بہت کچھ تو اِن بسکٹوں نے بچائی، بقیہ جان اور بسکٹ لے کر ہم جلد ہی چٹاگانگ سے بھاگ نکلے!

موجودہ طلبا کا زیادہ حال نہیں معلوم، لیکن اُپنی طالب علمی کے عہد میں جب کبھی گھر جانا ہوتا علی گڑھ کے بسکٹوں کا خاصا انبار لے جانا پڑتا۔ اِس لیے کہ وطن میں اعزّہ اور احباب جس اشتیاق سے میری آمد کے منتظر ہوتے اُس سے کچھ کم اِن بسکٹوں کے ورودِ مسعود کے نہ ہوتے۔ یہ فریضہ اَب بھی ادا کرنا پڑتا ہے کبھی "انفرادیت" کے تقاضے سے، کبھی روایت کے احترام میں۔ البتہ اتنا فرق ضرور آگیا ہے کہ پہلے اِن بسکٹوں کو اپنے ہمراہ لے جاتا تھا اور جانے کا اتفاق کم ہوتا تھا۔ اَب دوسروں کے ہاتھ بھیجنا پڑتا ہے اور یہ سانحہ آئے دن پیش آتا رہتا ہے پہلے اس کا معاوضہ سُود دَر سُود کے حساب سے ملتا تھا، اب اسی حساب سے ادا کرنا پڑتا ہے۔

O

ل آشفتہ بیانی میری، ۱۸۳

۱۲

"بچے" خدا کا مصرعۂ طرح ہوتے ہیں....."

اَچھے[1] اور بڑے آدمیوں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اُن کو بچوں سے شغف ہو۔ اُن کو اِن معصوموں کی بعثت میں اپنی خدمات کے مفید اور با مقصد ہونے کی بشارت ملتی رہتی ہے۔ مستقبل کی پرورش و پرداخت ماضی کی گود میں نہ ہو تو حال؛ بقول ایک بزرگ کے جو رعائتِ لفظی کے پیشِ امام ہیں؛ بدحال ہو جائے! جس طرح ہم دنیادار اَپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ مال ملکیت چھوڑ جانے کے لیے تمام عمر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں "۔ اَچھے اور بڑے لوگ بچوں کو شائستگی اور صحت مندی سے آراستہ و استوار کر کے پوری نسلِ انسانی کے لیے خیر و برکت کا ورثہ چھوڑ جانے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ (اِسی لیے) کسی[2] آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اُس کو عزیزوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے۔ کہا[3] جاتا ہے کہ اولاد کی تقدیر بنانے میں والدین کو بڑا دخل کچھ کم نہیں ہوتا (بہر حال) اپنے بچوں[4] اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لینا۔۔۔۔ اور خوش ہونے کے لیے کسی بڑی تقریب کا منتظر نہ رہنا۔ چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈ لینا۔ یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے اور کم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے۔ بچّے[5] خدا کا مصرعۂ طرح ہوتے ہیں جن پہ خدا طرح طرح

---

[1] ہم نفسان رفتہ، ۱۸ [2] ہم نفسان رفتہ، ۸۴

[3] ہم نفسان رفتہ، ۱۰۲ [4] ہم نفسان رفتہ، ۴۵

[5] نقوش، شخصیات نمبر (حصّہ اول)، ۳۲۰۔

سے طبع آزمائی کرتا ہے!

کچھ دن ہوئے میری ملاقات شیخ نیازی[1] سے ہوئی۔ ایسی حالت میں کہ اُن کے آنکھیں تھیں لیکن کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ کان تھے لیکن کسی کی سُنتے نہ تھے۔ زبان تھی لیکن بول نہ سکتے تھے۔ ناک تھی لیکن خوشبو، بدبو میں فرق نہ کر پاتے۔ ہاتھ پاؤں تھے لیکن چل پھر نہ سکتے۔ اِن باتوں کے ہوتے ہوئے بھی اُن سے دوستی ایسی ہوئی کہ اُن کے بغیر مجھے چین نہیں۔ گو اَب تک یہ نہ معلوم ہو سکا، نہ یہ بات کبھی دھیان میں آئی کہ خود شیخ صاحب کا میرے بارے میں کیا خیال تھا!

شیخ[2] کے دو بڑے بھائی اقبال اور احسان ہیں اور دو بڑی بہنیں سلمیٰ اور عذرا۔ گھر بھر میں شیخ کو صرف عذرا پہ اعتبار ہے۔ یہ شیخ کی تمام کمزوریوں اور کارناموں سے واقف ہیں۔ بہت دنوں بعد اُن کی یہ عادت چھوٹی ورنہ ہر جھوٹی سچی بات کے آخر میں ضرور کہتے ہیں "ہاں عذرا" اور عذرا شاید ہی اُن سے کبھی اختلاف کرتیں۔ عذرا ان کی عمر کی تھیں تو ایک دن مجھے عینک اُتارتے ہوئے دیکھ کر بولیں۔ ابّا میاں آپ عینک اُتار دیتے ہیں تو دوسرے کے ابّا میاں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ عذرا کی بڑی بہن سلمیٰ ہیں ان کا کام دونوں کو چڑھانا اور ان پہ ہنسنا ہے!

دونوں بہنیں اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں ایک کلاس آگے پیچھے تھیں۔ سلمیٰ ایک سال اَپنے درجہ میں رہ گئیں۔ اس کا اُنھوں نے بڑا غم منایا۔ ہم سب نے اُن کو سمجھایا اور تسلّی دی تو کچھ سنبھل گئیں۔ شام کو عذرا کو خیال آیا کہ چھوٹی بہن کی حیثیت سے اُنھوں نے سلمیٰ کا غم غلط کرنے میں حصّہ نہیں لیا اور یہ بہت بڑی چوک ہوئی۔ چنانچہ بڑی یگانگت سے سلمیٰ کے پاس جاکر بیٹھ گئیں کچھ دیر تک اپنے ہاتھ کے ناخن اور سلمیٰ کے تیور باری باری دیکھتی رہیں اور جب دونوں طرف سے اطمینان ہوگیا تو بولیں آپا آپ روتی کیوں ہیں۔ یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ اَب ہم آپ ایک ہی کلاس میں بیٹھا کریں گے۔ اَپنی کتاب مجھے دے دیجئے۔ مَیں اپنی آپ کو دے دوں گی میری

---

[1] شیخ نیازی، ۳   [2] شیخ نیازی، ۳

کتاب پڑھ کر میری طرح آپ بھی پاس ہو جائیں گی۔

ہمدردی کی یہ باتیں سن کر سلمیٰ نے اُن کو ایک چانٹا رسید کیا اور پھر سے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ عذرا بے چاری بھوچکا ہو کر ایک طرف جا کھڑی ہوئیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

شیخ[1] کو کھانے پینے کا بڑا شوق ہے۔ اگر روک تھام نہ کی جائے تو یہ کھانے پر کبھی ترس نہ کھائیں۔ اس لیے اُن کو بے ٹمنک اور بے تکان کھانے پینے سے باز رکھا جاتا ہے۔ کوئی اور ہو تو اس سلوک سے اس درجہ ناراض ہو کہ تمام عمر میرا منہ نہ دیکھے لیکن شیخ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرتے۔ اُن کا خیال ہے کہ دُنیا میں ہر چیز کھانے پینے کے لیے بنائی گئی ہے وہ مار کھانا ہی کیوں نہ ہو!

شیخ کی شکل وصورت بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ تربوز جیسا سر، ہونٹ موٹے موٹے جیسے تنوری روٹی کے حاشیے، ناک چھوٹی، گاجر کی مانند۔ دہانہ ایسا کہ مسکرائیں بھی تو باچھیں کانوں کی لو تک پہنچ جائیں اور رونے میں اُسے کھول دیں تو خاصا بڑا ٹماٹر منہ میں آجائے آواز ایسی پاٹ دار کہ ایک نعرہ میں پاس پڑوس کے سارے شیخ شور رہی نہیں، چرند پرند تک چونک پڑیں، اور اِدھر اُدھر دبکنے لگیں لمبے کم، چوڑے سے زیادہ۔ نہ سردی کی خوشی نہ گرمی کا غم۔ آنکھیں نڈر اور بہت بڑی۔ ایک بار ایک صاحب نے بہت قریب سے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ شیخ صاحب آنکھ تو کیا جھپکاتے۔ ٹارچ کی طرف اس طرح دیکھتے رہے گویا وہ بھی کھانے کی کوئی چیز تھی لیکن ذرا دُور رکھی!

شیخ کو اچھا پہننے اوڑھنے کا بالکل شوق نہیں۔ اکثر دوسرے بھائیوں کا کپڑا الٹا سیدھا پہنا دیا جاتا ہے تو اسی میں مگن رہتے ہیں۔ لوگ چڑاتے یا طعنہ دیتے ہیں کہ فلاں بھائی یا بہن کی اُترن ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا، کہتے اُترن کیا! یہ تو صدری ہے، خود اماں بی نے پہنائی ہے۔

---

[1] شیخ نیازی، ۴۰

لیکن آدمی کی طبیعت کچھ اس طرح کی بنی ہے کہ شک شبہے کی کوئی بات کان میں ڈال دی جائے تو وہ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی رنگ لا کر رہتی ہے۔ چنانچہ اُترن والی بات، اُن کے ذہن سے اُتری نہ تھی بلکہ کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ البتہ وہ جس رنگ میں ظاہر ہوئی وہ طعنہ دینے والوں کے لیے مایوسی کا باعث ہوئی۔ ایک بار اُن کے بڑے بھائی ستھرے اور خوشنما لباس میں نظر آئے۔ دوسرے دن اُنھوں نے کہا اب تم پہن چکے۔ اُتارو، میں پہنوں گا۔ بھائی نے اُن کا مذاق اڑایا۔ یشخ نے ذرا بھی بُرا نہ مانا بلکہ تھوڑا مسکرائے، کچھ پینترا بدلا اور چھلانگ مار کر عذرا پر جا گرے یہ کہتے ہوئے کہ اچھا میلا ہونے دو، تب تو اُتارو گے!

یشخ کو صاف ستھرا رہنے کا بالکل شوق نہیں۔ جہاں کہیں مٹی کوڑا کیچڑ یا پانی دیکھا بیٹھ گئے اور اِس گیان دھیان اور لطف و اطمینان سے گویا صاف ستھری چاندنی، قالین یا گدّے پر براجمان ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ میلے کپڑوں یا ناصاف جگہوں پر نظر آئیں اُتنے ہی مجھے خوب صورت اور بھاری بھرکم معلوم ہوتے ہیں۔ دوسروں کا بھی یہی خیال ہے کہ اِس حُلیے میں یشخ کا رعب زیادہ پڑتا ہے۔

ایک دن میں نے جھنجلا کر کہا یشخ تم نے ناک میں دَم کر دیا ہے۔ نہانے دھونے کے بعد ذرا دیر تو صاف ستھرے رہا کرو۔ اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ناک پر ہاتھ پھیرا اور اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد کچھ اس انداز سے بولے، جیسے اُنھوں نے میرا کہا سنا معاف کر دیا ہو، مَیں کب نہایا تھا، عذرا نے نہلا دیا تھا۔ صاف رہنے کے لیے جو بار بار تاکید کی جاتی ہے اور کہنا نہ ماننے پر اُن سے سختی سے پیش آیا جاتا ہے، اُس سے یہ بہت گھبراتے ہیں۔ کھل کر کچھ نہیں کہتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صفائی کی طرف سے اُن کے دل میں مَیل آگیا ہو۔ ایک دفعہ اُنھوں نے کافی دیر تک صاف ستھرا رہنے کی مصیبت جھیلی۔ ماں نے یہ دیکھ کر ان کی بڑی تعریف کی اور گود میں لے کر پیار کیا۔ یہ تکلفات ختم ہوئے تو بڑی حسرت سے بولے "امّاں بی اب یہ کپڑے مَیلے کب ہوں گے!"

شیخ کی بڑی کمزوری ان کا کھانے پینے کا شوق ہے۔ اس شوق کے پیچھے ایک
بار ہا محکمے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اُن کے کھانے پینے کی نگرانی کی جانے لگی اور
کی زندگی تلخی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دست آنے
کھانے پینے سے کیا سروکار۔ عذرا سے پوچھا کیوں آیا یہ: دست کیوں آتے ہیں اُنھ
نے بتایا زیادہ کھا جانے سے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بولے اور زیادہ کس
کہتے ہیں۔ عذرا نے اُکتا کر کہا زیادہ کہتے ہیں کبابوں پر کباب ٹھونسے جانے کو۔ یہ
سُن کر شیخ کے چہرے پر رونق آگئی اور مُسکرا کر بولے جیسے عقل کے معاملے میں عذ
منہ دکھانے کے قابل نہ رہ گئی ہوں، آپا کباب نہیں مَیں نے تو گولریں کھا
تھیں!

شیخ کو دست آتے رہے۔ ایک دن ماں سے پوچھنے لگے، دست آنے
سے کیا ہوتا ہے۔ اُن کو بتایا گیا کہ اس سے آدمی دبلا اور کمزور ہو جاتا ہے کھیل کو
نہیں سکتا، اُس کو گھومنے پھرنے کھانے پینے نہیں دیا جاتا۔ پوچھا یہ بند کب ہوگا
کہا گیا کہ دوا پیتے رہو گے اور کھانا پینا بند کر دو گے تو بند ہو جائے گا۔

اتفاق سے اُس زمانے میں میرے ہاں ایک شاعر آئے۔ دُبلے پتلے،
چھوٹے قد کے۔ طور طریقہ نہایت نپا تُلا۔ بات بات پر ہاتھ جوڑتے اور تعظیم دیتے
اور جیسا کہ شاعروں کا قاعدہ ہے مصرعہ اُٹھانے، کرایہ ادا کرنے اور دسترخوان پر
ہاتھ بٹانے کے لیے کچھ شاگردوں اور ہاں میں ہاں ملانے والوں کو بھی ساتھ لائے۔
تھوڑی دیر تک مَیں اُن کی اور وہ میری تعریف کرتے رہے۔ اُنھوں میری تعریف
کرنی جلد ختم کر دی لیکن میں باز نہ آیا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ مَیں نے ان کی تعریف بند کی
تو ان کے شعر کی تعریف کرنی پڑے گی۔ اِس دوران میں اللہ کی رحمت کا منتظر رہا کہ
اُن کا مصرعہ اُٹھانے سے قبل وہ مجھی کو اُٹھا لے!

اِستنے میں اندر سے چائے آئی اور میری جان میں جان آئی۔ چائے کے ساتھ

لے شیخ نیازی، ۹

کچھ پھل مٹھائی اور آگے پیچھے شیخ صاحب بھی تھے مہمان عزیز کو جو چیز پیش کی جاتی ہاتھ جوڑ کر بڑی مسکنت کے ساتھ رُد کر دیتے، مَیں گھبرا رہا تھا کہ یہ وار خالی گیا تو مَیں مارا گیا۔ چنانچہ جان پر کھیل کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ حضور التفات نہ فرمائیں گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ شیخ کے کان کھڑے ہوئے اور سیدھے میری گود میں آ کر بیٹھ گئے اور ہاتھ سے میرا مُنہ اپنی طرف کرتے ہوئے بڑے پیار کے لہجے میں بولے اَبّا میاں ان کو کچھ نہ دیجیے، اِن کو دست آتے ہیں، ان کی امّاں بی نے کھانے کو منع کر دیا ہے!

شاعر، اُن کے ساتھیوں اور اِس خاکسار پہ کیا گزری اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ محفل درہم برہم ہو گئی اور شیخ، مجھے اور چائے کے خوان کو میدانِ جنگ سے صاف نکال لائے۔

شیخ صاحب شاعر اور گپّی بھی واقع ہوئے ہیں۔ عام طور پہ ہمارے شاعر بھوکے اور گپّی پیٹ بھرے ہوتے ہیں لیکن شیخ صاحب شعر اسی وقت کہتے ہیں جب پیٹ بھرا ہو ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ شیخ صاحب جس عمر اور جس حُلیے کے ہیں، اُس کے ہوتے ہوئے یہ شاعر کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھ کا پھیر ہے۔ بچے بڑے اچھے شعر کہتے ہیں۔ جو بات دل کو بھائے یا بہلائے وہی تو شعر ہے۔ کسی بھولے بھالے تندرست بچے کو دیکھیے۔ اُس کی ہر بات شعر میں ڈوبی ڈھلی ہوئی ملے گی۔ اپنے زمانے کے سب سے بڑے آدمی سے کسی نے پوچھا آپ کو سب سے زیادہ خوبصورت کیا چیز نظر آئی تو اُنھوں نے جواب دیا، "تندرست بچہ تندرست ماں کی گود میں۔" رہا حُلیے کا معاملہ تو بات یہ ہے کہ شاعر ہر حلیہ کا ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ حلیہ بدلتا بھی رہتا ہے۔ شعر کہتے وقت اُس کا حُلیہ کچھ ہوتا ہے۔ سُناتے ہوئے کچھ اور شعر کے دام مانگتے ہوئے، بس اللہ دے اور بندہ لے!

شیخ کے کارنامے اُن کی زبان سے سُنیے تو معلوم ہو گا کہ ایسی باتیں نہ کبھی ہوئیں

لہ شیخ نیازی، ۱۵

اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے ۔ مثلاً ایک بھیڑیا آیا اور شیخ صاحب اُسے کھا گئے چیونٹیوں
نے اُن کو ڈنڈا مارا اور اُنھوں نے ڈنڈا چھین کر پھینکا تو وہ المونڑہ جا گرا۔ حالانکہ شیخ
نے کبھی کوئی بھیڑیا دیکھا نہ تھا، صرف اُس کا تذکرہ سُنا تھا ۔ اُن کو بتایا گیا تھا کہ بھیڑیا
چھوٹے بچوں کو جو کہنا نہیں مانتے اُٹھا لے جاتا ہے اور کبھی کبھی کھا جاتا ہے۔ خیال یہ
کہ یہ بات اُن کے کان میں پڑے گی تو یہ وقت بے وقت گھر سے باہر نکل جانے یا
دوسروں کے حصّہ کی چیزیں کھا جانے سے باز رہا کریں گے ۔ اس کا توڑ اُنھوں نے
اس طرح کیا کہ خود بھیڑیئے کو کھانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ کے ماں باپ جس تردّد میں
مُبتلا تھے وہ تو رہا اپنی جگہ پر، بھیڑیئے کے ماں باپ بھی تردّد میں پڑ گئے ۔

اَب رہا یہ کہ اُنھوں نے چیونٹیوں پر کیا الزام لگایا اور ڈنڈے کے ساتھ کیا
سلوک کیا یہ کچھ اس طرح کی باتیں ہیں، جن کے بارے میں کوئی قطعی بات میں نہیں کہہ
سکتا ۔ کھوج لگانے سے اتنا پتہ ضرور چلا کہ ایک دفعہ گھر میں شیخ ایسی جلیبیاں کھاتے
پکڑے گئے جن پر کثرت سے چیونٹیاں چھائی ہوئی تھیں ۔ نوکر نے شور مچایا تو گھر
کے سارے چھوٹے بڑے جمع ہو گئے اور قریب تھا کہ اُن کے ساتھ وہی سلوک
کیا جاتا جو اُنھوں نے چیونٹیوں کے ساتھ کیا تھا کہ عذرا نے ایک قانونی پیچ ڈال دیا۔
اُنھوں نے کہا معاملہ عدالتِ ماتحت کا نہیں، بلکہ عدالتِ عالیہ کا تھا، اس لیے ابا میاں
کے سامنے پیش کیا جائے گا ۔ مَیں آیا تو یہ حاضر کیے گئے ۔ جواب طلب کرنے پر اُنھوں
نے ایک دوسرا جھگڑا کھڑا کر دیا ۔ بولے چیونٹیاں بھی تو جلیبی کھا رہی تھیں ۔ اس
جواب سے میری حالت کچھ ایسی ہوئی کہ اگر میں اس کو ظاہر ہو جانے دیتا تو شیخ تو
صاف بری ہو جاتے، عدالت کا فضیحتا ہو جاتا۔ اتنے میں سلمٰی نے کہا کہ تمہارا قصور یہ
نہیں ہے کہ تم نے جلیبی کھائی بلکہ تم نے چیونٹیاں کھائیں ۔ بے چاری چیونٹیوں نے
تمہارا کیا قصور کیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں نے دیکھا اَب عدالت، عدالت نہیں رہ
گئی تھی بلکہ مشاعرہ برپا ہو گیا تھا اور اس طرح کے شوشے نکلتے رہے تو معاملہ عدالت
اور ہجوم دونوں کے قابو سے باہر ہو جائے گا ۔ مَیں نے حکم دیا آئندہ سے ایسا انتظام

رکھا جائے کہ شیخ نیازی، جلیبی اور چیونٹیاں اکٹھا نہ ہو پائیں!

شیخ صاحب[1] شاعر کے علاوہ گویّے بھی ہیں۔ شاعر کا گویّا یا گویّے کا شاعر ہونا تو کوئی اچنبھے کی بات ہے نہ بڑی بات۔۔۔۔ یہ صرف بات کا پھیر ہے ورنہ دراصل دونوں قریب قریب ایک ہیں۔ البتہ شیخ کا یہ حال ہے کہ وہ اوٹ پٹانگ میں ایک مصرعہ کہتے ہیں اور اپنے ہی بنائے طرح طرح کے سُروں میں الاپ کر اُس کے مَوزوں ہونے ہی کا نہیں بلکہ بھرپور شعر ہونے کا یقین کر لیتے ہیں۔ اِس طرح کی دھاندلی شیخ برابر کرتے رہتے ہیں۔

پُرانی چال کا مُعلّم ہونے کی حیثیت سے مَیں نے شیخ کے اِس فن میں نی نکالی تو جواب میں اُنھوں نے پھر اُسی طرح کا ایک شعر کہہ دیا۔ مَیں چُپ ہوگیا، اِس لیے نہیں کہ شیخ کی بات میرے ذہن میں اُتر گئی تھی بلکہ شیخ کی اِس حرکت پر چھوٹے بڑے کچھ اس طرح پر ہنس پڑے کہ میرے دل میں شک گزرا کہ اِس ہنسی کا رُخ کچھ کچھ میری طرف بھی تھا! اس لیے ایک خاص طرح کا گھونٹ پی کر چپ ہوگیا!!

شیخ تلفظ کا جھگڑا کبھی نہیں مول لیتے۔ جس لفظ کو جس طرح چاہتے ہیں بولنے لگتے ہیں۔ اُن کی یہ حرکت مجھے اکثر کھٹکی اور مَیں نے اِس کی کوشش کی کہ یہ لفظوں کی آبرو کا خیال رکھیں لیکن سوچنے پر مَیں اِس نتیجے پر پہنچا کہ قدرت شیخ کے ذریعے اپنی بات منوانا چاہتی ہے یعنی وہی کرو اور ویسے ہی کرو جس میں آسانی ہو یا آرام ملے، جیسے دُور اور پھیر کا راستہ ہو تو سڑک پر چلنے کے بجائے جلد سے جلد پہنچ جانے کے لیے ہم پگڈنڈی بنا لیتے ہیں اور اُسی پر چلتے ہیں۔ اگر زبان سے کوئی لفظ مشکل سے ادا ہوتا ہے تو ہم سب کا دل یہی چاہتا ہے کہ اسے کوئی پیٹ یا کاٹ چھانٹ کر ایسا بنا لیں کہ وہ زبان سے آسانی سے اور جلد سے جلد اُدا ہو جائے، اِسی لیے زبان کے جان کاروں کا کہنا یہ ہے کہ وہی زبان اچھی ہے جو آسانی سے بولی اور سمجھی جائے۔ شیخ نے اِس بھید اور بھاؤ کو خود سمجھا ہو یا نہیں ہم کو سمجھایا بڑے

---

[1] شیخ نیازی، ۲۰

مزے سے ہے۔

ایک[1] دن سولن میں بارش ہو رہی تھی۔ بادل اور کہر سے چاروں طرف ڈھندلکا چھایا ہوا تھا۔ ہوا میں نرمی اور تازگی تھی۔ دور سامنے پہاڑی پر رنگ برنگ کے گھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ہرے بھرے درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں تلے اوپر، کبوتر کے کابک رکھ دیئے ہوں۔ پہاڑی ریل اس طور پر گھڑ گھڑاتی، گونجتی، گنگناتی گزرتی تھی جیسے بڑے بڑے گوبریلے یا بھونرے ایک کے پیچھے ایک چلے رہے ہوں۔ پاس کی پہاڑی سے مویشیوں کا گلہ سر جھکائے دھیرے دھیرے نیچی اُنچی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا جن کے گلے کی چھوٹی بڑی گھنٹیاں بجتی جاتی تھیں، جیسے پہاڑ کی دیوی پر سے آرتی اُتاری جا رہی ہو۔ چرواہا کوئی پہاڑی گیت گا رہا تھا جس کی گونج پہاڑی کے معلوم نہیں کن کن دُور اور نزدیک کے گوشوں سے ٹکراتی ہا پھیلتی سُننے والوں کے دل کی معلوم نہیں کن گہرائیوں میں ڈوبتی اُبھرتی اُس کو آس اور نراس کی وادیوں میں پہنچا دیتی!

مکان سے ملا ہوا نیچے کی جانب مکئے کا کھیت تھا۔ جس کی جتائی بوائی گھر والوں کی طرف سے ہوئی تھی اور اس کا بٹوارہ اس طور پر کر دیا گیا تھا کہ ہر چھوٹا بڑا بچہ اپنے اپنے ٹکڑے کا زمیندار اور کاشت کار دونوں تھا۔ کھیت کے بیچ میں ناشپاتی کا ایک چھوٹا سا درخت تھا جس پر بیٹھ کر شیخ کھیت کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔ شیخ کے سپرد جو کام کیا گیا تھا اُس میں بھید یہ تھا کہ اِس طرح اُن کی اور کھیت، دونوں کی رکھوالی ہوتی اور ناشپاتی کی رونق بڑھتی رہے گی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ناشپاتی کی رونق جس تیزی سے بڑھتی گئی اُس سے کہیں زیادہ تیزی سے اُس کے پھلوں کی تعداد گھٹتی گئی!

شیخ[2] صاحب ایک دن کودتے پھاندتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ بڑا جغادری مینڈک بیٹھا ہوا تھا۔ چلائے عذرا دوڑو۔ عذرا پہنچیں۔ اُن کے ساتھ

---

[1] شیخ نیازی، ۲۲ [2] شیخ نیازی، ۲۷

کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ دیکھا تو شیخ مینڈک کے گرد شیو کا رقص کر رہے ہیں۔ عذرا بولیں ارے! یہ تو مینڈک ہے، فرمایا اور کیا! دیکھو کیسا بیٹھا ہوا ہے جیسے ثمرِ بہشت (آم)! اس فقرے کی سب نے اس طرح تعریف کی جیسے کسی اچھے شعر پر دل کھول کر مشاعرہ میں داد دیتے ہیں۔ اسی دوران میں سلمیٰ نے پکارا اماں بی! اماں بی! ذرا چلی آیئے۔ وہ دوڑتی بھاگتی پہنچیں تو سلمیٰ نے مینڈک طرف اشارہ کیا اور کہا وہ دیکھیے مُنّا (شیخ کا گھریلو نام) بیٹھے ہیں! ۔ شیخ کے معاملے میں سلمیٰ اور اُن ماں میں اکثر نوک جھونک رہتی تھی لیکن آج کے اس فقرے نے ماں کو اس طرح زچ کر دیا کہ وہ اپنے اَن گنت اور من مانے اختیارات کے ہوتے ہوئے کچھ نہ کر پائیں!

ایک دن بیٹھے بٹھائے اُنھیں کیا جانیے کیا خیال آیا، اُٹھے اور اسکول چلے گئے کسی کا کوٹ، کسی کی ٹوپی، ایک جوتا اپنا، ایک دوسرے کا۔ کمر بند ڈالنے کی سلائی بطور قلم کے کتاب یا کاپی کے بجائے کوئی پھٹا پرانا رسالہ۔ کچھ دنوں اسی طرح آتے جاتے رہے۔ ایک دن واپس آئے تو کہنے لگے میڈم نے بارہ روپے ماہوار مانگے ہیں، داخلہ ہوگا۔ میں نے کہا ایسے اسکول میں داخلے سے کیا فائدہ جہاں میڈم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شیخ صاحب کے داخلے کی فیس لی نہیں بلکہ دی جاتی ہے۔ فرمایا اور کیا؟ میں نے کہا شیخ صبر کرو۔ بولے صبر کیا؟ میں نے کہا وہی جس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بولے اور کیا؟ میں نے کہا پڑھ لکھ کر کیا کرو گے قوم کو تم سے اور تم کو قوم سے اور کام لینے ہیں۔ بولے قوم کسے کہتے ہیں۔ میں نے کہا اس کا قصّہ پھر کبھی سناؤں گا، اِس وقت اتنا سمجھ لو کہ ایک طرح کی رسّی کو کہتے ہیں جس کے سہارے جادوگر طرح طرح کے کرتب دکھاتے ہیں۔ شیخ نے کھڑے کھڑے ایک چھلانگ لگائی اور غائب ہو گئے!

جس[1] زمانے میں شیخ ماں کا دودھ پیتے تھے۔ اُن کے سر اور چہرے پر کثرت

---

[1] شیخ نیازی، ۳۰

سے پھنسیاں نکل آئیں جن میں بڑی ٹیس اور جلن تھی اور یہ رات دن بیقرار رہتے۔ اُنہی دنوں ان کی ماں بھی بیمار پڑ گئیں اور تکلیف اتنی بڑھی کہ ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ شیخ کی پھنسیوں کا زور کم نہ ہوتا تھا ۔ دُودھ پیتا بچّہ ہر تکلیف سے پناہ لینے کے لیے ہمیشہ ماں کی چھاتی کا سہارا ڈھونڈتا ہے ۔ وَہیں اُس کو سکون ملتا ہے ، شیخ کا بھی یہی حال تھا ۔

ایک دن شام کے قریب ہسپتال پہنچا ۔ دیکھا کہ پھنسیوں پر کسی کالی دوا کا لیپ کر دیا گیا ہے ۔کسی نے ایک خاص پھل کو کوئلہ کر کے تیل میں ملا کر لگانے کو بتا دیا تھا ۔ سر چہرہ اور گردن سیاہی سے بھر گئی تھی اور مشکل سے جہاں تہاں کی جِلد نظر آتی تھی ۔ ماں کی چھاتی اُن کے منہ میں تھی اور ماں بیٹے دونوں نڈھال ہو کر تھوڑی دیر کے لیے غافل ہو گئے تھے ۔

شیخ کا یہ کالا پھنسیوں سے لدا ہوا ڈراؤنا چہرہ جو مشکل سے آدمی کے بچے کا چہرہ معلوم ہوتا تھا ! دوسری طرف ماں کا صاف شفاف خوبصورت سینہ بے قراری اور بیکسی میں کُھلا رہ گیا تھا جس کا سرا شیخ کے آدھ کُھلے مُنہ میں دکھائی دیتا تھا ۔ کیسے بھیانک منہ میں کتنی حسین اور پاکیزہ چیز تھی ۔ لیکن وہ بھیانک چہرہ تو ماں کے بچّے کا تھا، جس سے زیادہ دنیا جہان میں اُس چھاتی کا کوئی حق دار نہ تھا اور وُہ سینہ اُس ماں کا تھا جو اِس بھیانک چہرے سے زیادہ دنیا کی خوبصورت سے خوبصورت اور قیمتی چیز کو خاطر میں نہ لا سکتی تھی ۔

کُھلی ہوئی خوبصورتی اور کُھلی ہوئی بدصورتی کا اِس طرح اکٹھا ہو کر آدمی اور آدمیت کے لیے ایک چھپی ہوئی انمول سچائی بن جانا کیسی انوکھی بات تھی اور ایک انوکھی بات سے دنیا کی کتنی اور کُھلی اور چُھپی ہوئی اَنمول سچائیوں کا بھید کُھلتا تھا !

لیکن دل پھر دل ہے وُہ بھی مجھ جیسے معمولی آدمی کا دل ۔ اس نے پلٹا کھایا ۔ شیخ اور اُن کی بیمار ماں کی بے بسی کا یہ عالم دیکھ کر میرے دل میں غم اور غصّے کے بھورے کالے بادل اِس طرح اُمنڈنے لگے جیسے پورب دیس کی بھری برسات

میں کبھی کبھی نظر آجاتا ہے اور یہ وسوسہ پیدا ہوا جیسے میری غیر حاضری میں کسی آسیب نے دونوں کو بے بس پاکر ان پر ظلم توڑا ہو اور ان سے مجھے جو گہرا لگاؤ تھا، اُس کا مذاق اڑایا ہے پھر کچھ ایسا لگنے لگا جیسے میری محبت اور غیرت اس کا بدلہ لینا چاہتی ہے اور جب تک بدلہ نہ لے لوں گا چین نہ آئے گا۔

یہ حالت بھی دیر تک قائم نہ رہی۔ بس جیسے سورج پر سے بادل کا ٹکڑا گزر گیا ہو۔ جس طرح محبت اور غیرت کا جذبہ نفرت اور انتقام پر اُکساتا ہے اُسی طرح خدمت اور قربانی کی اتھاہ طاقتوں کو بھی اُبھارتا ہے میرے دل میں یہ بات آئی کہ اُن دونوں سے مجھے جو محبت ہے اُس کو کسی سے نفرت اور عداوت کا بہانہ بنانا ٹھیک نہیں۔ محبت کو تو خدمت ہی میں ڈھالنا چاہیے۔

مَیں نے شیخ کو آہستہ سے گود میں اُٹھا لیا۔ اُنھوں نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے دیکھ کر مُسکرا دیے جیسے میرا شکریہ ادا کیا ہو۔ میں نے اِتنا اُن کو نہیں اپنے آپ کو ہمت دلانے کے لیے کہا شیخ گھبرانا نہیں۔ مَیں آگیا تم اچھے ہو جاؤ گے! توبہ توبہ یہ کس نے تمہاری صورت بگاڑ دی۔ ابھی دھو کر صاف کرتا ہوں۔ پھر مَیں نے ان کے سر اور چہرہ کو صابون اور گرم پانی سے آہستہ آہستہ دھو ڈالا اور زخموں پر پوڈر چھڑک دیا۔ یہ اپنی شکل میں نظر آئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ اچھے ہونے لگے ہوں۔ ماں نے دیکھا تو اُن کی بھی ڈھارس بندھی۔ کچھ دنوں میں دونوں اچھے ہو گئے اور خوش خوش گھر واپس آ گئے۔

عمر[1] کے ساتھ شیخ کی عقل اور لمبائی چوڑائی بھی بڑھ گئی ہے آواز اور زیادہ پاٹ دار ہو گئی ہے۔ ابھی یہ اتنا لکھ پڑھ نہیں پائے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اُسے خود پڑھ سکیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مَیں نے ان کی جو باتیں اِدھر اُدھر لکھیں اُس کو اِن کے بھائی بہن کچھ اِس طرح نمک مرچ لگا کر اُن کو سناتے ہیں کہ یہ جامے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے

---

[1] شیخ نیازی، ۴۲

کہ جامے سے باہر ہوکر شیخ کیا رنگ لاتے ہوں گے ! اوّل تو مَیں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جس سے یہ ناراض ہوتے دوسرے یہ مجھ سے اکثر اقرار کر چکے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وُہ سب صحیح تھا۔

شیخ صاحب کو گھر والے کبھی کبھی یوں بھی چھیڑ دیا کرتے ہیں ۔ اُس لہ حال میں یہ کسی کو پکڑ پائیں تو پھر اُسے اس طرح بھنبھوڑ ڈالتے ہیں کہ بہت دنوں تک زندگی کی ہر لذت سے اُس کا دل کھٹا رہتا ہے ۔

اِسی طرح کے حادثے کا حال سُن کر ایک دن میں نے جھنجھلا کر کہہ دیا اور مَیں یقین دلاتا ہوں اِس سے اُن کی توہین نہیں بلکہ اپنی جھنجھلاہٹ ، دور کرنی تھی ۔ کہ پکڑ لاؤ اِس گوریلے کو ذرا اس کی مرمت کر دوں ۔ بات ختم ہو گئی تھی لیکن بعض باتوں کا خاصّہ یہ ہے کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں وہ ختم نہیں ہوتیں اور بعض لوگوں کا بھی خاصّہ ہوتا ہے کہ وہ بات ختم نہیں ہونے دیتے چنانچہ گوریلے کے لفظوں پر لوگوں نے چُپکے چُپکے ہنسنا شروع کیا ۔ شیخ کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے جب کان کھڑے ہوں تو بے تکی سے بے تکی بات بھی کان میں داخل ہو جاتی ہے ۔

شیخ صاحب میرے پاس آئے اور نہایت غصیلی اور گونجیلی آواز میں بولے دیکھئے سب لوگ مجھے گوریلا کہتے ہیں ۔ شیخ کا تیور دیکھ کر مَیں خوشیٹا گیا ۔ مَیں نے کہا آؤ بیٹھ جاؤ ۔ سب نالائق ہیں ۔ کب سے پانی مانگتا ہوں کوئی سنتا نہیں ۔ ذرا تم پانی پلا دو مَیں اِس کا قصّہ سناؤں شیخ کچھ ڈھیلے پڑے اور گلاس میں پانی لائے۔ مَیں نے پانی پیا اور جو بچ رہا تھا اُس کو اُن کے سر پر چھڑک دیا ۔ میری اس بے تکلفی پر ہنس پڑے تو مجھے اطمینان ہوا ۔

مَیں نے کہا تم کو معلوم بھی ہے گوریلا کہتے کس کو ہیں ۔ اُنھوں نے جواب دیا اقبال ، احسان (ان کے دو بڑے بھائی) کہتے ہیں کہ گوریلا ایک طرح کا بڑا

لہ شیخ نیازی ، ۳۶

ڈراؤنا بدشکل بندر رہتا ہے۔

مَیں نے کہا اُن کو کیا معلوم گوریلا کسے کہتے ہیں۔ گوریلا کے معنی ہیں غوریلا۔ پوچھا غوریلا کیا۔ میں نے عرض کیا غور کرنے والا۔ کہنے لگے (اور آواز میں غورر اور غراہٹ دونوں شامل تھی) غور کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ مَیں نے کہا غور کرنے کے بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہی دیکھو غوریلا ہمیشہ اچھے اچھے پھل کھاتا ہے۔ پوچھا، کون کون سے پھل؟ مَیں نے کہا بس یہی اَمرود، آڑو، ناشپاتی، بُھٹے۔ اَچھا تم کو کون سا پھل پسند ہے۔ فوراً بولے اَمرود! مَیں نے جیب سے اکنّی نکال کر ان کے حوالے کی اور تاکید کر دی کہ جوں ہی پھل والا آئے، امرود خرید لینا۔ اُنھوں نے قہقہہ لگا کر ایک چھلانگ ماری اور میری جان بچ گئی۔

شیخ[1] اَب اسکول جانے لگے ہیں۔ بڑی پابندی سے جاتے ہیں اور بڑی مُستعدی سے واپس ہوتے ہیں۔ اور سیدھے وہاں پہنچتے ہیں جہاں سے کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ سب سے اچھی پلیٹ چُنتے ہیں اور سب سے زیادہ کھانا لینا چاہتے ہیں۔ کھانا ختم ہونے پر (ایک روز) ان کے بھائی بہنوں نے مجھ سے کہا، ابّا میاں نیازی کا حساب بڑا اچھا ہے۔ آپ امتحان لیجیے۔ مَیں تیار ہو گیا ...... مَیں نے کہا بھئی شیخ تمہارے حساب جاننے کا سب پر بڑا رعب ہے۔ ایک آدھ سوال مَیں بھی کر دوں؟ کڑک کر بولے ہاں، ہاں۔ میں نے پوچھا تمہاری عمر کیا ہے؟ بولے چھے برس کی۔ مَیں نے پوچھا عذرا کی؟ کہا سمجھ لو آٹھ برس کی۔ میں نے کہا اچھا، اَب یہ بتاؤ کے سال میں تم عذرا کے برابر ہو جاؤ گے؟ فوراً بولے دو برس میں! سوا عذرا کے سب نے اِس جواب پر شیخ کو مُبارک باد دی۔ مَیں نے عذرا سے پوچھا کیوں عذرا تم نے شیخ کی سوجھ بوجھ کی تعریف کیوں نہ کی؟ تو سلمیٰ نے جواب دیا اِن کو اِس کی کوفت ہوئی کہ نیازی ان کے برابر کیوں ہو گئے۔ عذرا گھٹ کر رہ گئیں۔

کچھ دن بعد شیخ کی حساب کی قابلیت کا معاملہ پھر سامنے لایا گیا اور مجھ سے

---

[1] شیخ نیاری، ۴۰ [1] شیخ نیازی، ۴۲

فرمائش کی گئی کہ میں شیخ کا ایک بار اور امتحان لوں ۔ مَیں نے پوچھا شیخ تم کو اپنی عمر تو معلوم ہے ۔ بولے جی ہاں چھٹے برس کی ۔ مَیں نے سوال کیا اور تمہاری اماں بی کی کیا عمر ہے ؟ بولے مجھے کیا معلوم ۔ مَیں نے کہا پوچھ کر بتاؤ ۔

اتنے میں ایک دوسرا حساب کتاب شروع ہو گیا ۔ ماں چڑ کر بولیں یہ تم عمر کا جھگڑا کیا کھڑا کر دیتے ہو ۔ کچھ اور پوچھنے کو نہیں رہا ۔ مَیں نے عرض کیا یہ تو بچوّں کا کھیل ہے اِس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے ۔ بولیں اگر بچوں کا کھیل ہے تو بچوّں کو کھیلنے دو ۔ تم کہاں سے عمر پوچھنے آ گئے ۔ مَیں نے بھی کچھ گرم لیکن جلد ہی اُس سے زیادہ نرم ہو کر کہا شادی کے وقت تو تمہارے ماں باپ نے میرے پوچھے بغیر تمہاری عمر بتا دی تھی اور آج اپنے بچوّں کے پوچھنے پر بھی اپنی عمر نہیں بتاتیں ۔ اِس پر اور زیادہ خفا ہو کر کہا اچھا میری عمر پچاس سال کی ہے تب؟ میں نے کہا مجھے تو یاد آتا ہے یہ عُمر تم نے اپنی والدہ کی بتائی تھی غصّے میں رونے کے قریب ہو کر بولیں مجھے کیا پڑی تھی میں کیوں بتاتی ۔ مَیں نے کہا اچھا جانے دو ۔ کسی اور نے کسی اور کی بتائی ہو گی ۔

اِتنے میں شیخ نے پُکارا ابّا میاں جلدی پوچھیے ۔ عذرا آپا نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے ۔ مَیں نے کہا اچھا قریب آ جاؤ ۔ آئے تو مَیں نے کہا اس وقت تمہاری عمر چھٹے سال کی ہے نا ؟ مَیں نے کہا فرض کرو تمہاری اماّں بی کی عمر ۲۶ چھبیس سال کی ہے ۔ خوب سمجھ گئے ؟ کہا ۔ ہاں ہاں سمجھ گیا ۔ مَیں نے پوچھا اچھا اب بتاؤ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہاری اماّں بی کی عُمر کیا تھی ؟

شیخ نے سوچا ، چہرے پر مسکراہٹ آئی ۔ ناک ، ہونٹ ، دہانہ ، تھوڑی ، گال دھیرے دھیرے بڑھنے پھولنے لگے ۔ کچھ جھومے اور قہقہہ لگا کر لوٹ گئے ۔ پھر بولے سمجھ گیا ۔ مجھ کو دھوکا دیا جا رہا ہے ۔ ہاں عذرا آپا ؟ عذرا نے اُکتا کر کہا آخر کیا دھوکا دیا جا رہا ہے ، جواب دو ۔ بولے دیکھیے جب میں پیدا ہوا تھا تو بالکل ننھّا منّا سا تھا جیسے احمد (ان کا چھوٹا بھائی جس کی عمر مشکل سے ڈیڑھ دو

مہینے کی تھی ! مجھے کیا معلوم اماں بی کی عمر کیا تھی ؟!

اِس جواب کی ہر شخص نے داد دی ۔ کسی نے چیخ کر، کسی نے اُچھل کر بعضوں نے لوٹ پوٹ کر ۔ مَیں نے شیخ سے ہاتھ ملایا اور اُن کے سامنے جھک کر تعظیم دی!

اسی[1] سال جنگ حَبش کا خاتمہ اور شیخ نیازی کا ختنہ ہوا ۔ شیخ[2] صاحب کو ختنہ کی اطلاع دی جا چکی تھی اور اس پر اُن کی رائے بھی لے لی گئی تھی لیکن جیسا کہ زبردست کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے وہ فیصلہ پہلے کر لیتا ہے، رائے بعد میں لیتا ہے شیخ کے ساتھ ناانصافی ہو گی اگر یہاں اِس بات کا اقرار نہ کر لیا جائے کہ شیخ کی کمزوری جان کر ختنہ کا مسئلہ اُن کے سامنے اِس طرح رکھا گیا کہ ختنہ کیا وہ اِس سے بھی بڑے حادثے سے گزرنا قبول کر لیتے ۔

چنانچہ[3] ایک ختنہ پر موقوف ہے گھر کی رونق ۔ ہم سب ایک دن یوم ختنہ منانے کے لیے تیار ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ ختنہ کرنے والا ایک میلی کچیلی سفید پگڑی اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی لیے گھر کے دروازے پر نمودار ہوا ۔ نائی کی سج دھج اور تیور دیکھ کر شیخ تو کیا شیخ کے بزرگوں کے بھی ہوش اُڑنے لگے ۔ اس کے بعد جو پکڑ دھکڑ اور چیخ پکار مچی ہے اُس سے بچے ہی نہیں اُن کی سات پشت واقف ہے،

شیخ نیازی نے جتنے دن ختنہ کے سلسلے میں چارپائی پر گزارے اُن میں طرح طرح کی کہانیاں سنتے سنتے عذرا کی کوشش سے لکھنے پڑھنے میں کچھ شُد بُد پیدا کر لی ۔ چنانچہ صحت پا کر دُنیا کی چھین جھپٹ میں آئے تو پہلا خط اُنھوں نے اپنے چچا کے نام لکھا ۔ اِس خط میں اُنھوں نے لکھاوٹ کی بہت ساری ایسی اُلجھنیں دُور کرنے کی کوشش کی تھی جو ہم جیسے لکھے پڑھے جاہلوں نے پھیلا رکھی ہیں۔ یہ خط پنسل سے کاغذ کے ایسے پُرزے پر لکھا گیا تھا جو سوا تحریر کے ہر مصرف میں آ چکا تھا ۔ جس بات کو ہم یوں لکھتے ! "جواب دو" ——— اُس کو اُنھوں نے

---

1. شیخ نیازی ، ۵۱　　2. شیخ نیازی ، ۵۲

3. شیخ نیازی ، ۵۳

یوں لکھا تھا: "ج واب ۲" ۔ !

اِس حادثہ پر شیخ کو ہموار کرنے میں جب اُن کے تمام بھائی بہنوں کا ہنسنا، سمجھانا اور عزّاتا بے کار ثابت ہوا تو یہ مسئلہ میرے سامنے لایا گیا میں نے شیخ کو سراہا اور کہا شیخ تم نے جس طرح لکھا ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو اُس کے معقول ہونے میں شبہ نہیں لیکن ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ لوگ اس سمجھیں یا مانیں ۔کیونکہ اِس دنیا کا جس میں ہم تم آ پھنسے ہیں، قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایکا ایکی نہ تو سینکڑوں ہزاروں سال پیچھے دھکیلی جاسکتی ہے اور نہ سینکڑوں ہزاروں سال آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔اُردو لکھنے کا جو کینڈا تم نے نکالا ہے ۔ وہ اُردو اِملا کے پورن راج کا طریقہ ہے۔بولے پورن راج کسے کہتے ہیں ؟ میں نے کہا شاید ایسے زمانے کو کہتے ہیں جب دُنیا میں اچھائی کا راج ہوگا اور بُرائی دیکھنے کو نہ ملے گی ۔بولے ٹھٹھے بھی نہ ہوں گے ! ۔ لوگ ہنسنے سے باز نہ آتے اور مجھ سے کوئی ٹھکانے کا جواب نہ بن پڑا تو میں نے کہا دیکھو بات ختم ہو لینے دیا کرو ۔پورن راج میں کبھی کوئی آدمی بات کے بیچ میں نہیں ٹوکے گا !

اَچھا سنو، تم جو چائے پیتے ہو۔ اُس میں کیا چیزیں ملی ہوتی ہیں بولے ۔ پانی چائے، شکر، دودھ ۔میں نے کہا اگر یہ چیزیں میز پر علیحدہ علیحدہ رکھ کر تمہارے سامنے پیش کی جائیں تو تم کتنے چزبز ہو گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِس لیے ضروری ہے کہ چائے کو پینے کے لائق بنانے کے لیے قاعدہ کے مطابق چائے، پانی، شکر، دودھ کو لانا چاہیے ۔

چائے کا نسخہ جب شیخ کے حلق سے نیچے اُتر گیا تو میں نے کہا اسی طرح ہر حرف کو موقع موقع سے ملا کر یا علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں تو پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے اور مطلب صاف ہو جاتا ہے ۔جیسے ہر چیز ٹھیک طور پر ملانے سے گوشت کباب، کھچڑی، ترکاری تیار ہوتی ہے وہ علیحدہ علیحدہ رکھنے سے نہ تو کھانا تیار ہوتا ہے، نہ بھوک دُور ہوتی ہے، نہ جی بھرتا ہے ——— اسی طور یہ ان کو ۲ اور

دو کا مطلب سمجھایا گیا ۔

گھر کے[1] صحن میں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ہر کیاری بچّے کے قبضے میں دے دی گئی تھی ۔ ایک[2] دن ان کے کلاس کے کچھ لڑکے ہمارے ہاں آئے شیخ اپنی کیاری کے پھول پودے سب کو دکھا رہے تھے اور ہنسنے بولنے میں مشغول تھے ۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا تم لوگوں میں سے کون کون کلاس میں مار کھاتا ہے اور مار کھانے پر روتا ہے ۔ سب نے اقرار کیا ۔ مار بھی کھاتے ہیں اور روتے بھی ہیں ۔ ایک نے کہا نیازی بھی تو مار کھاتے ہیں ۔ شیخ صاحب چمک کر بولے لیکن روتا تو نہیں ۔ میں نے پوچھا روتے کیوں نہیں ۔ بولے رونے سے اور مار پڑتی ہے ۔ ماں نے پوچھا آخر اِس کا کیا سبب ہے کہ گھر پر بغیر مار کھائے بھی روتے ہو ۔ لڑکوں کی طرف چپکے سے اِشارہ کر کے بولے ، یہ جو وہاں ہوتے ہیں ۔

فرمائش کرنے میں شیخ سب سے آگے رہتے ہیں ۔ ایک دن شہر جا رہا تھا کہنے لگے میرے لیے فٹ بال لائیے گا ۔ مَیں نے کہا اَچھّا ۔ اَب میری خدمت خاطر میں مصروف ہو گئے جوتا لا کر سامنے رکھ دیا ۔ ٹوپی ہاتھ میں لے لی ۔ کسی مکھّی کی مجال نہ تھی کہ دو دو چار چار گز تک میرے قریب آ سکے ۔ اِس دوران میں برابر فٹ بال کی شکل ، رنگ ، فٹ بال میچ ، اَپنے کھیلنے کی تعریف ، فٹ بال کے گم ہو جانے کے اندیشے اور اُس کے محفوظ رکھنے کی تدبیریں ، اَپنے دوستوں کی بڑائی ، دشمنوں کی بُرائی ، ماں کو دوا نہ پینے پر ملامت ، خود ہر طرح کی دوا پینے پر آمادہ رہنا ۔ غرض کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر ایک ہی سانس میں یہ اَپنے سارے خیالات نہ ظاہر کرتے جا رہے ہوں اِتنے میں عذرا میرے قریب آ گئیں ۔ شیخ نے لپک کر اَیسا دھکّا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچیں ۔ بولے دیکھتی نہیں ہو اَبّا میاں میرے لیے فٹ بال لینے جا رہے ہیں ۔

مَیں تانگے پر سوار ہوا ۔ تانگے تک یہ بھی آئے اور برابر فٹ بال کے مسئلے پر گفتگو کرتے رہے ۔ تانگہ کچھ آگے بڑھا کہ اُنھوں نے پکارا اور دوڑ پڑے ۔ مَیں رُک

---

[1] شیخ نیازی ، ۴۶ [2] شیخ نیازی ، ۴۷

گیا - بولے یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ فٹ بال کا فیتہ بھی لائیے گا - میں نے کہا اچھا — گھر تک پہنچے تھے کہ پھر پکارا، ابّا میاں جلدی جلدی جائیے زور کی بارش آرہی ہے! میں شہر سے دیر میں واپس ہوا - اندھیرا ہو گیا تھا - دیکھا تو شیخ دروازے پر اندھیرے میں کھڑے ہیں تانگہ آتے ہی پکارا — "ابّا میاں فٹ بال!" میں نے برآمدہ میں پہنچ کر بھرا ہوا فٹ بال اُن کے حوالے کیا - فٹ بال پا کر اُن کے چہرے پر خوشی کی جو کرنیں پھوٹی ہیں اور میرے احسان اور اپنی شکر گزاری کے اظہار میں یہ جس جس طرح تھرکے ہیں اور حلق اور منہ سے جیسی جیسی سُریلی اور گونجیلی آوازیں نکالی ہیں، مجھے کچھ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ ساری دُنیا ایک فٹ بال ہے جسے خدا نے مجھے اسی طرح تحفہ میں دیا ہے، جس طرح میں نے شیخ کو فٹ بال دیا تھا!

آج کل[1] مکان بننے والا ہے زمین کی صفائی ہو رہی ہے - گدھے اور خچر مٹی اور اینٹیں لا لا کر ڈال جاتے ہیں - بچوں کی عید ہے - اس لیے نہیں کہ نیا مکان بننے والا ہے - بلکہ والدین کے بجائے اب خچر اور گدھوں سے واسطہ ہے - تمام دن مٹی پر لوٹتے اور خچر اور گدھے پر سواری کرتے ہیں - ہر بچے نے اپنا اپنا خچر اور گدھا چُن لیا ہے - شیخ نے جس گدھے کو اپنایا ہے وہ سب سے زیادہ غریب صورت ہے لیکن سب سے زیادہ دولتی جھاڑتا ہے - لدا پھندا جوں ہی پہنچا شیخ نے بڑھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا - بوجھ اُتارنے میں گدھے والے کی مدد کی اور فوراً گدھے پر قابض ہو گئے -

شیخ صاحب کو گدھوں کا تجربہ نہ تھا، اور انصاف کی بات یہ ہے کہ گدھوں کو بھی شیخ صاحب کا تجربہ نہ تھا - پہلے دُم کی طرف سے چڑھنے کی کوشش کی - اس نے دولتی جھاڑ دی، اور یہ زمین پر ڈھیر ہو گئے - اِدھر اُدھر دیکھ جلدی سے اُٹھ بیٹھے اور اُس کے منہ کی طرف سے چڑھنے لگے - گدھے نے مُنہ مارا تو پھر زمین پر آرہے - گدھے نے فتح کی خوشی میں اپنا قومی ترانہ الاپنا شروع کیا تو یہ غرّا کر بولے

---

[1] شیخ نیازی، ۶۸

واہ بے گدھے مارتا بھی ہے اور شور بھی مچاتا ہے ۔ اَب اُنھوں کے گدھے کا آگا پیچھا سوچ کر پہلو سے حملہ کیا اور اُس کی پیٹھ پر بیٹھ گئے ۔ دو چار قدم چلنے کے بعد گدھے نے جُھرجُھری لی اور شیخ مٹی کے ایک بڑے ڈھیلے کی طرح زمین پر لڑھک گئے ۔

شام کو گھر واپس آئے تو حلیہ بتا رہا تھا کہ تمام دن ان کا گدھوں سے اور گدھوں کا ان سے کیسا سابقہ رہا ہوگا ۔ معمول کے خلاف چپ چپ سے رہے اور کھا پی کر سو رہے سویرے اُٹھے تو چہرے پر ایک خاص انداز کی لٹک نظر آئی ۔ دوستوں کا خیال تھا کہ شیخ کے دھیان میں کچھ اونچی باتیں تھیں ۔ دشمن یہ کہتے تھے کہ کچھ نہیں فقط گدھے کی لاتیں تھیں ۔ ناشتہ وغیرہ کے بکھیڑوں سے جلد جلد اور چُپ چاپ گذر گئے اور گھر سے چلتے ہوئے عذرا کو بھی اپنا پروگرام نہ بتایا ۔

عذرا کو شبہ ہوا پوچھا کیوں متّا کیا بات ہے ، کدھر کا ارادہ ہے ؟ بغل میں کیا دبا رکھا ہے ۔ شیخ نے اِدھر اُدھر دیکھا ، اطمینان کر لینے کے بعد بغل سے بقچی نکالی ، اُس میں ماں کا موباف اور عذرا کا میلا دوپٹہ تھا ۔ عذرا نے گھبرا کر پوچھا یہ تم کیا کرنے والے ہو ۔ کہا کل گدھے نے بڑی بدمعاشی کی ، پہلے تو چڑھنے نہیں دیتا تھا اور لاتیں اُوپر سے مارتا تھا آج میں (موباف دکھا کر) اس سے تو اس کی ٹانگیں باندھوں گا اور دوپٹہ منہ پر لپیٹ لوں گا تاکہ لاتیں نہ لگیں ۔ عذرا نے جل کر کہا تم بھی کیسے گدھے ہو اُس کی ٹانگ باندھ دوگے تو وُہ چلے گا کیسے؟ اور اپنا منہ لپیٹ لوگے تو دیکھوگے کیسے کہ گدھا کدھر لیے جا رہا ہے یا کیا کر رہا ہے ؟ میرا دوپٹہ اس کام کے لیے نہیں ہے ۔

اتفاق سے ادھر ماں کا گذر ہوا جہاں گدھے کے خلاف دونوں میں گفتگو ہو رہی تھی ۔ اُنھوں نے اپنے موباف کا یہ مصرف سُنا تو شیخ کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا جو اُن سے پہلے گدھا کر چکا تھا ۔ اُدھر دوپٹہ کا بیچ کچھ اِس طرح آن پڑا تھا کہ عذرا کے دل میں شیخ کے لیے محبّت کے جتنے خانے تھے اُن میں بہت سے سونے ہو گئے تھے لیکن جتنے آباد رہ گئے تھے وُہ رہ رہ کر اپنا رنگ دکھا جاتے ۔ یعنی ماں کی

طرف سے جو غلہ شیخ پر ہوتا تھا اُس کی روک تھام تو کرتیں لیکن اَپنے دل کا جو بخار اُٹھتا اُس کو قابو میں نہ رکھ پاتیں۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ میں پہنچ گیا۔

دوپٹہ میں نے عذرا کے حوالے کیا۔ اُنھوں نے اُسے پہلے کھول کر اور بعد میں اچھی طرح جھٹک کر اپنا اطمینان کر لیا کہ اس میں گدھا یا شیخ صاحب تو بندھے ہوئے نہ تھے۔ پھر شیخ کو اپنے ہمراہ لے کر واپس چلی گئیں ماں کی برہمی ابھی دُور نہیں ہوئی تھی۔ مَیں نے کہا شیخ پر تمہارا بگڑنا بجا ہے لیکن وہ اَبھی ناسمجھ ہے۔ وُہ کیا جانے موباف کا کتنا مان دان ہم نور باف کرتے ہیں۔ یہ دُنیا ہے۔ شیخ گدھے کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہتے تھے یا گدھے نے اُن کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وُہ بالکل اَیسا ہے جیسے تم نے دیکھا ہوگا میاں بیوی یا لیڈر اور قوم ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اُس کے بعد کچھ اس طور کی کھڑکھڑاہٹ اور گڑگڑاہٹ ہوئی جیسے ریڈیو سیٹ میں ہوتی ہے اور وہ یک بیک رُک جاتا ہے!

مکان بنے کتنے سال ہو گئے! کل کے ناسمجھ بچے بچیاں آج سیانے ہو گئے اور زندگی کے ایسے کاموں میں لگ گئے ہیں جن میں ان کو خوشی اور نیک نامی نصیب ہے جب کبھی اکٹھا ہوتے ہیں اور مکان کے خوبصورت، کشادہ اور آرام دہ ہونے کی بات نکلتی ہے تو اُس زمانے کا ذکر کرنے لگتے ہیں جب مکان کے لیے نیو کھُد رہی تھی اور وہ اس کے اندر بھاگے بھاگے پھرتے اور طرح طرح سے دھومیں مچاتے تھے!

عذرا کا چھوٹا بچہ طارق ہے ــــــ اُس کے کھانے پینے رہنے سہنے کے انتظام میں وُہ دن رات اس درجہ سر کھپاتی ہیں کہ دوسرے بھائی بہن ان کو اکثر چڑا کر خفا کر دیتے ہیں۔ بچّوں کی تندرستی برقرار رکھنے کے لیے میں بھی یہی سب کرتا تھا، اَب بھی کرتا ہوں اور اس سلسلے میں دوستوں بلکہ ڈاکٹروں، حکیموں تک نے میرا مذاق جب اُڑایا تھا اور اب بھی اُڑاتے ہیں۔

حال ہی میں طارق نے ایک خوانچہ والے کی ریوڑیوں کے لیے جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، مچلنا شروع کیا۔ بہلانے چمکارنے سے نہ مانا اور شور و غل

زیادہ ہوا تو عذرا بہنچیں کچھ دیر چُپ کھڑی رہیں اور پھر ریوڑی خرید کر بچّے کو دے دی! واپس آئیں تو سلمیٰ کو بڑا اچنبھا ہوا اور اس کی وجہ پوچھی۔

عذرا کے آنسو نکل آئے جسے وہ جلد ہی پونچھ کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں سلمیٰ وُہ دن بھی یاد ہیں جب یہ مکان بن رہا تھا۔ مزدوروں کے ننگ دھڑنگ میلے کچیلے بچّے بچیّاں موجود ہوتیں جن کے ساتھ ہم سب کس بے فکری اور بے تکلّفی سے کھیلا کودا کرتے تھے۔ کوئی خوانچے والا آتا تو مزدوروں کے یہ بچّے کسی طرح ٹوٹ کر گرتے۔ خوانچے والے کو گھیر لیتے۔ ماں باپ کچھ دلوا دیتے تو کتنے خوش ہوتے تھے جن کے ماں باپ کچھ نہ دلوا سکتے اور بچّوں کے بلکنے پر اُن کو جھڑکتے، گالیاں دیتے اور کبھی ایک آدھ تھپڑ مار دیتے تو کتنے مایوس ہوتے اَور بجھ سے جاتے!

ہم تم بھی خوانچہ والے کی ریوڑی کے لیے کتنے بے قرار ہوتے تھے۔ ابّا میاں کی تاکید اور نوکروں کی نگرانی کی وجہ سے ریوڑیوں تک نہ پہنچ پاتے تو کیسی مایوسی اور بے لبسی کا سامنا ہوتا۔ مجھے اِس وقت وہ زمانہ یاد آگیا اور وہی باتیں نظر کے سامنے آگئیں اور دل نہ مانا کہ طارق کو وہی تکلیف ہو۔

عذرا کے اس کہنے سے میں چونک پڑا اور دل کو دھچکا سا لگا۔ زندگی کا یہ کیسا انوکھا پھیر تھا کہ جو کام اپنے خیال میں ماں باپ، بھولے بھالے ناسمجھ بچّے کی بھلائی کے لیے پیار اور سمجھ داری سے کرتے ہوں، وُہ بچے کو اِتنا دکھ پہنچاتا ہو تھوڑی دیر تک وُہ باتیں یاد آئیں جو مَیں نے بچّوں کو اپنے خیال میں دُکھ سے بچانے اور آرام پہنچانے کے لیے کی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی ستانے لگا کہ اُن کے کہنا نہ ماننے پر مَیں نے کبھی کبھی ڈانٹا اور مارا بھی تھا۔ اِس سے اُن کے دل پر کیا گذری ہوگی!

۱۳

وہ مرا پہلے پہل داخلِ "زنداں" ہونا — !

○

کالج کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ اُس[1] زمانے میں دوا تجویز کرتے میں جتنی توجہ صرف کی جاتی اُتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اُسی زمانے کی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے تصرّف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اِس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کرلے، دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کروں گا! اس کے بہت سے فوائد ہیں ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اُٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جس کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو تیسرے یہ کہ اس حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی:

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

یعنی مرض دُور نہ ہوا، نہ سہی، دوا تو مزیدار تھی۔ پھر یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ مریض اپنے پیدائشی یا جمہوری حق سے محروم نہیں ہوتا یعنی آئینی یا حفاظتی حدود میں رہ کر اُس کو اپنی عاقبت یا صحت بگاڑنے یا سُدھارنے کا حق اور اختیار حاصل رہتا ہے۔

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۶۵ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۶۶

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری سے اپنی تکلیف میں رجوع کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی، نم ناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو، اس وقت میں اُن کے مطب کا رُخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کمرہ میں بیٹھا فتحپوری کی دوکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر، یہ مشغولیت، یہ خلفشارِ زندگی ہے جس سے میں ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا جاؤں گا ——— زندگی ہی وہ کُل ہے جو اپنے جُزو سے مُستغنی ہے تو مجھ پر ہراس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا اور میں زیادہ بے تابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہوتا۔

اِتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی ..... دیکھتے ہی مسکراتے اس طور پر کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی مُسکرانے لگتیں۔ کہتے بھئی تم کہاں، بڑے عرصے تک غائب رہے۔ میں کہتا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے، پریشان ہوں ——— کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ بولتے، گھبراؤ نہیں، ابھی دیکھتا ہوں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں اس لب و لہجے سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد اور اعتقاد، دل آسائی اور دل رُبائی کے ساتھ دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا۔ اِس سے پہلے کیوں نہ آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مُبتلا رہا ——؟

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ میں مطب سے اُترتے ہی فتحپوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل

لے گنج ہائے گراں مایہ، ۱۳   لے گنج ہائے گراں مایہ ۶ ۱۶

اور ہماہمی میں گم ہوجاتا ۔ پھل والوں کے ہاں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جاکر کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھوچکا ہوتا اُس کو بدپرہیزی سے از سرِنو حاصل کرتا اور زندگی خوش گوار اور خوش آیند معلوم ہونے لگتی ۔

میرے[1] نزدیک ہر مرض کی کوئی نہ کوئی حد ہونی چاہیے ۔ بصورتِ دیگر مریض کو اختیار ہے کہ وہ حد سے گزر جائے ۔ جس طور پر ہمیشہ تندرست رہنا بھی غیر طبعی ہے اُسی طور پر ہمیشہ بیمار رہنا بھی بد مزاقی ہے ۔ پھر چوں کہ یہ دورِ ترقی و تہذیب کا ہے (یعنی تم جو چاہو کر سکو یا نہیں تمہاری بیویاں جو چاہیں کر سکیں) میں نے گُردہ صاحب کی مُتواتر اور مسلسل کئی ماہ تک تالیفِ قلوب کی لیکن جب دیکھا کہ میرے اغماض اور چشم پوشی کو یہ ایک روشن خیال تعلیم یافتہ بیوی کے مانند میری کمزوری پر محمول کرنے لگے ہیں تو پھر ۔ ایک[2] رات جب کہ زلفِ شب گُردہ تک پہنچ چکی تھی ہم علی گڑھ سے کنگ جارج میڈیکل کالج ، لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگئے اور ارادہ کر لیا کہ اس کمبخت گُردہ کو بالکل "مٹیا برج" بنا ڈالیں گے بیوی بچوں سے کہہ دیا کہ حکیم عبدالطیف صاحب وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ کا اِصرار ہے وہ لکھنؤ خربزے کھلانے لیے جا رہے ہیں ، تمہارے لیے بھی بھیجوں گا ۔ غرض دوسرے دن دوپہر کے قریب لکھنؤ پہنچ گیا ۔

میں[3] نے کوشش کی تھی کہ کسی عزیز ، دوست یا دشمن کو میرے ارادۂ عملِ جراحی کی خبر نہ ہونے پائے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ پردہ تقدیر نہیں بلکہ پردہ تحریر میں کیا ہے ۔ لکھنؤ میں ہمارے (ایک) دوست اور رفیقِ کار ۔۔۔۔ مل گئے ۔ ایک روز ذرا دیر کے لیے ملاقات ہوئی تھی تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم دونوں رخصت ہوگئے ۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ہماری آمد اور ارادہ کی خبر لکھنؤ کے کسی روزنامہ میں موجود ہے ۔ اب کیا تھا راز کا افشا ہونا تھا کہ اَحباب و اعزہ "صف اندر صف قطار اندر قطار" چلے آرہے ہیں ۔ خطوط اور تار ان کے علاوہ !

---

[1] مضامین رشید ، ۲۹ [2] مضامین رشید ، ۳۰

[3] مضامین رشید ، ۳۶

اَب میرا زیادہ وقت موت وحیات کے فلسفہ یا تندرستی ومرض کے نظریہ پر بحث کرنے میں صرف ہوتا تھا - کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے ذہن یا تجربہ میں کوئی بات ایسی نہ آئی ہو جو میرے ارادے کے نامعقول یا نامسعود ہونے کے مقابلے میں نصِ قطعی کا حکم نہ رکھتی ہو - ایک صاحب نے کہا اس قسم کے عمل جرّاحی سے عہدہ برآ ہوتے کسی کو نہیں دیکھا - فلاں شخص آپریشن کراتے ہی جاں بحق ہوا - مَیں نے کہا میرا ارادہ جاں بحق ہونے کا نہیں ہے - یوں اس کو کیا کیجیے گا لوگوں کی شادیاں بھی ہو جاتی ہیں مر بھی جاتے ہوں گے - پھر اِس کو کیا کیجیے ، مَیں اَیسی زندگی کو موت سے زیادہ ہولناک سمجھتا ہوں جس میں انسان زندگی کے فرائض اور لذائذ دونوں سے محروم رہے - انسان اُپنے بیوی بچوّں ، اعزّا و احباب کی نسبت سے زندگی کو نا چیز یا محبوب سمجھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں سے خاطر خواہ طور پر عہدہ برآ ہونا کامیاب اور کامران زندگی کی دلیل ہے ---- مَیں بذاتِ خود زندگی کو ایک ذمّہ دارانہ تفریح سمجھنے کا عادی رہا ہوں اور ہر ایسی حالت یا واقعہ کو جلد سے جلد بھول جانے کا خوگر رہا ہوں جو زندگی کے اس مفہوم کے منافی ہو لیکن اِن دنوں مُسلسل اور غیر شاعرانہ طور پر بیمار رہنے سے میری طبعی شگفتگی مُضمحل ہونے لگی تھی اور یہی سبب ہے کہ مَیں نے آخری اور قطعی فیصلہ کر لیا ہے - اَب رہا یہ کہ مَیں جاں بر نہ ہوسکوں گا - بیوی بچوّں پر کیا گزُرے گی - یہ صورت حال بھی ایک سمجھ دار شخص کے نزدیک ناقابلِ تسخیر نہ ہونا چاہیے - ایک مجہول اور مریض شوہر یا باپ ، اپنے بیوی بچوّں کے لیے ایک متوفی باپ یا شوہر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا بشرطیکہ وہ اتنی دولت و ثروت کا مالک نہ ہو کہ وہ روزی کمانے یا نہ کمانے سے بے نیاز ہو اور میری حالت ایسی نہیں ہے - پس میرے نزدیک لوگوں کی انتہائی گمراہی یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کی صلاح و فلاح کا تنہا اُپنے آپ ذمّہ دار سمجھتے ہیں - اگر ایسا ہوتا تو آج دُنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا یا شاید دُنیا اور اس کا نقشہ دونوں ہی ناپید ہوتے - دنیا میں کافی مثالیں ایسی ملیں گی جس میں بیوہ اور یتیم کافی عافیت اور شہرت کے ساتھ دادِ حیات

دے چکے ہیں اسی طور پر کافی مثالیں ایسی بھی ہیں ۔۔۔ جہاں شوہر اور باپ کی موجودگی میں بھی صرف محرومیاں حصے میں آئی ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کی کمزوری ہے اور اُس کی بے بنیاد وحشتیں ہیں جن کے سبب سے اُس نے اپنے مرنے کے عدم جواز میں یہ افسانے اور کمزور دلائل قایم کر لیے ہیں ۔ مرنے اور بیوی بچوّں کو چھوڑ کر جانے کی مصیبت تو عام ہے ۔ بہت کم گھرانے ایسے ہوں گے جہاں یہ ہولناک حادثے نہ پیش آئے ہوں گے ۔ اگر ہمارے گھر یہ مصیبت پیش آنے والی ہے تو بُرا ماننے یا ضرورت سے زیادہ ماتم کرنے کے کیا معنی ، ایک ایسا سانحہ جو تمام دنیا اور تمام خاندانوں کے لیے عام ہے آخر میرے خاندان کے لیے کیوں نہ ہو ۔ اصل یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر خاندان کی کفیل خود دُنیا اور اس کی بوالعجبیاں ہیں یا اگر ہمارے ناظرین زیادہ تعلیم یافتہ روشن خیال نہ ہوں تو مَیں کہوں گا کہ اِس میں تھوڑا بہت خدا کا بھی ہاتھ ہوتا ہے ، اور جب ہم خدا کے قائل ہیں تو اُس کی واضح یا پُر اسرار قدُرتوں اور مصلحتوں کا بھی قائل ہونا پڑے گا !!

میرے ایک دوست ، بزرگ اور اُستاد جو میرے خیال میں مجھے اِس درجہ عزیز رکھتے ہیں جتنا شاید میں کوشش بھی کروں تو خود اُن کو یا کسی دوسرے کو عزیز نہیں رکھ سکتا ۔ جس حد تک وہ میرے لیے قربانی یا ایثار کر سکتے ہیں مَیں ان کے لیے نہیں کر سکتا اور نہ شاید آمادہ ہو سکتا ہوں ۔ میرے اِس ارادے کے مؤید تھے لیکن مَیں محسوس کرتا تھا کہ اُن کا عزم و استقلال ، محبت یا بشریت کی بنا پر میرے اس ارادے سے کبھی کبھی مُتاثر اور متزلزل ہو جاتا تھا ۔ چنانچہ میں نے ایک موقع پر بسبیلِ تذکرہ اُن سے عرض کیا کہ آپ دیکھتے ہیں مرض کی یہ آئے دن کی مُصیبت کیسی تلخ ہے آپ کو یہ بھی معلوم ہے اِس صورت حال کے ماتحت زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا ۔ آپ جانتے ہیں اَب اس کا علاج صرف آپریشن رہ گیا ہے ۔ رہا یہ کہ عملِ جرّاحی کامیاب ہو گا یا نہیں تو بصورتِ اوّل فہو المراد بصورتِ دیگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک آخری انجام کا وقوف نہ ہو اُس پر حکم لگانا بے محل اور غلط طریقۂ کار ہے ۔

آخری آنجام ایک ایسا سلسلۂ لامتناہی ہے جس کی کسی کو خبر نہیں۔ موت ہو یا زندگی یا کوئی بھی واقعہ کیوں نہ ہو وہ انجام نہیں ہے بلکہ صرف ایک جدید آغاز۔ ساری دنیا ایک مُسلسل آغاز ہے۔ انجام اُس کے ہاتھوں میں ہے جو آغازِ مُطلق اور انجامِ مُطلق دونوں سے بے نیاز! اس لیے میرے نزدیک انجام کو غیر معمولی اہمیت دینا اور وہ بھی ایسا انجام جو صرف چند روزہ ہو غیر ضروری اور غیر دانشمندانہ ہے لیکن فلسفہ اور الہیات کی پیچیدگیوں سے طبیعت کو اکثر سکون و تسکین نہیں حاصل ہوتی۔ اِس لیے اِس مسئلہ پہ دُنیاوی نقطۂ نظر سے بھی غور فرمائیے۔

مَیں قسمت کا قائل ہوں اور یہاں مَیں قسمت کے الہیاتی یا مذہبی مفہوم سے نہیں لُغوی مفہوم سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک قسمت نام ہے صرف "حصّہ" یا "تقسیم" کا۔ یعنی ہر شخص کو دُنیا کی نعمتیں اور دُنیا کی محرومیاں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ مساوی اور غیر مساوی کا سوال نہیں ہے۔ کسی کو تندرستی، کسی کو دولت و قناعت کسی کو ہمت و حیا، کسی کو زن و فرزند، کسی کو، علم و فضل کسی کو قبولِ عام ارزانی کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے محرومیاں اور نامرادیاں بھی حصّے میں آئی ہیں۔ عام طور سے ہم کو جو نعمت حاصل ہوتی ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو کوئی نعمت حاصل نہ ہوتی ہو (اُس کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں) اور دوسروں کو جو نعمت حاصل ہے اُس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کی مجموعی نعمتیں مجموعی طور پر کسی کو کبھی نصیب نہیں ہوئیں اور نہ ہوں گی اور بالفرض نصیب بھی ہوئیں تب بھی میرا خیال ہے آپ اُس کو مطمئن نہ پائیں گے۔ زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ فطرت کی طرف سے انسان کو جو نعمتیں عطا کی گئی ہوں اُن پر قناعت کرے اُن سے جائز طور پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔

اَب مجھے دیکھیے آپ میری سوانحِ زندگی سے واقف ہیں خدا نے علم کی دولت عطا فرمائی۔ کھانے پینے سے خوش رکھا۔ جاں نثار احباب و اعزہ دیے۔ شہرت اور قبولِ عام ارزانی فرمایا۔ مجموعی طور پر یہ نعمتیں ایسی ہیں جن کے وجود پر ہر سمجھ دار انسان کو شکر گزار ہونا چاہیے۔ میرے اُستادِ محترم مولانا حاجی سید سلیمان اشرف صاحب

......حج کے لیے تشریف لے گئے تھے ۔ کتنوں نے آپ سے فرمائش کی تھی کہ خانہ کعبہ میں پہنچ کر اُن کے مختلف اُمورِ دینی یا دُنیاوی کے بارے میں دُعا فرمائیے گا ۔ مولانا محترم کے پاس میں نے ایک عریضہ بھیجا تھا اور یہ استدعا کی تھی کہ حریم قدس میں میری طرف سے یہ عرض کر دیا جائے کہ اے خدا تیرا ایک ناچیز بندہ تیری دی ہوئی نعمتوں کا شُکر گزار ہے ۔ وہ کچھ مانگتا نہیں اُس کا صرف سجدۂ شکر قبول فرمایا جائے۔

آپ یقین فرمائیں ، مَیں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھتا ہوں اب اگر پیامِ رحلت آگیا ہے تو گھبرانا بے معنی ہے ۔ اَب تک خُدا نے ہر قسم کی خجالت و مصیبت سے محفوظ رکھا ہے۔ معلوم نہیں آئندہ کیا پیش آئے ۔ اِس وقت تک میری زندگی جیسی کامیاب اور مَسرور گزری ہے وہ غالباً میرے بعد میرے احباب ، اَعزّہ اور مُلک کے لیے ایک سرمایۂ نیک ہو گی ۔ اِس کے علاوہ اور کیا چاہیے ۔ دوسری طرف اگر اِس مرض کو میری زندگی کا دردناک پہلو تصور فرمائیے تو اس حقیقت کو بھی مدِّنظر رکھیے کہ مَیں اِس مرض کی شدّت اور سختی کے باوجود ہمیشہ غیر معمولی طور پر شگفتہ اور بشّاش رہا ہوں اور یہی نہیں بلکہ جو لوگ مجھ سے وابستہ رہے ہیں اُن کو بھی شگفتہ اور بشّاش رکھ سکا ہوں ۔ پھر اِس مرض کو عذابِ جان یا میری زندگی کی محرومی کیوں تصوّر فرمائیے ۔ اچھا ، اِن سب کو جانے دیجیے وہ لوگ جو مرض اور ازالۂ مرض کے بارے میں ماہرینِ فن کا درجہ رکھتے ہیں اُن کی رائے ہے کہ آپریشن ہونا چاہیے ۔ اس لیے جہاں تک دُنیاوی تدابیر میری جان بچانے اور مرض کے دفعیہ کے لیے کی جاسکتی ہیں وہ کی جائیں گی بہت مُمکن ہے کہ جاں بَر ہو جاؤں پھر اس وقت کی خوشی اور شادمانی کا کون اندازہ کر سکتا ہے ۔ ؟!

بالآخر ہم یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں پہنچ گئے :

وُہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

جس[1] روز آپریشن ہونے والا تھا اُس کی صبح کو ہر آنے والے نے بشارت دی کہ آج آپریشن ہو گا ۔ ڈاکٹروں نے دلاسا دیا ۔ نرسوں نے پوچھا ڈرتے تو نہیں ۔ بعض صاحبوں

---

[1] مضامین رشید ، ۹۲

نے کہا "شاباش" اور کسی نے صرف "افسوس" پر اکتفا کیا۔ اعزّہ پریشان افسردہ تھے۔ دوستوں پر یاس طاری تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں مُستعد اور آمادہ کار نظر آتی تھیں۔ مجھے نوٹس دیا گیا کہ دس منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔ مَیں نے وضو کیا۔ دو رکعت نفل ادا کی اور دُعا مانگی خدایا تو جو کچھ کر رہا ہے وہ بالکل صحیح اور دُرست ہے اب تک تو نے مجھ پر جو احسان و کرم کیا ہے تو علیم ہے، میں کتنا شکر گزار ہوں۔ ایک تمنا یہ البتہ ہے کہ اگر یہ آخری وقت ہے تو میری یاد کو مجھ سے محبت کرنے والوں کے لیے آسان کر دے۔ زندگی میں مَیں نے تجھے اکثر بھلا دیا ہے اس کے گواہ بہت ملیں گے لیکن اس وقت صرف تجھے یاد کر رہا ہوں اس کا گواہ صرف تو ہے۔ اس کے بعد ایک ڈاکٹر نے آکر مارفیا کا انجکشن دیا اور دو خدمت گاروں نے بیماروں کی کرسی پر بٹھا کر آپریشن تھیٹر پہنچا دیا۔

کرسی سے اُتر کر آپریشن تھیٹر میں داخل ہوا جو میز بتائی گئی اُس پر لیٹ گیا۔ سرہانے سے ایک ڈاکٹر نے کلوروفارم دینا شروع کیا۔ مَیں نے سوچا دیکھوں کلوروفارم کا اثر کس طور پر ہوتا ہے۔ اِس لیے یہ ارادہ کر لیا کہ بیہوش ہونے میں عجلت سے کام نہ لوں بلکہ کلوروفارم کے اثر کی مدافعت کروں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً تین چار منٹ تک کلوروفارم دیا گیا اور دماغ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز حلق میں رہ رہ کر اٹکتی اور سوزش پیدا کرتی ہے اس لیے مَیں نے دو ایک دفعہ سر کو ایک طرف جھٹک بھی دیا لیکن پھر مَیں نے خیال کیا یہ تجربہ کچھ پُرلطف یا دلچسپ نہیں ہے اور مجھے کلوروفارم کا اثر قبول کر لینا چاہیے۔ چنانچہ مَیں نے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا اور ایک ہی سیکنڈ میں یہ معلوم ہوا گویا دماغ دُھنی ہوئی روئی کی مانند تھا اور اس میں آگ لگا دی گئی تھی اور پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا۔

آنکھ کھلی تو مَیں نے اپنے آپ کو کمرے میں پایا۔ تکیوں کے سہارے تقریباً ۱۳۰ درجے کے زاویے پر لٹا دیا گیا تھا .... نہ آپریشن کی کوئی تکلیف تھی اور نہ کلوروفارم کا کوئی اثر .... رات ہوئی اور تکلیف میں اضافہ ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے گُردے کے مضافات کی رگیں آتشِ سیّال بن گئی ہیں اور درد گردہ

عود کر آیا ہے ۔ یہ تکلیف ناقابلِ برداشت تھی یہاں تک کہ ایک ڈاکٹر اور نرس نے آکر مورفیا کا انجکشن دے دیا اور پھر صبح تک غافل رہا ۔ یہ حالت صرف شب میں تقریباً تین چار دن تک رہی اور دو ایک روز مورفیا کا انجکشن لیتا رہا لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ سونے کے لیے منشی اور منوم چیزوں کا عادی ہونا مضر ہے اس لیے اس کی کوشش کرو کہ خود بخود نیند آجائے ۔ چنانچہ اس کے بعد پھر نیند لانے کے لیے نہ کوئی انجکشن دیا گیا اور نہ کوئی دوا استعمال کی گئی ۔ دو تین راتیں نہایت تکلیف سے گزریں ۔ ۔ ۔ (اور ان تین چار دن تک میں نے آہ و بُکا اور اظہارِ مایوسی اور ماندگی میں کچھ ایسی بد مذاقی کا بھی ثبوت دیا کہ تیمار دار پریشان ہو گئے اور نرسوں اور ڈاکٹروں نے کبھی کبھی کسی قدر درشت لہجے میں میری خبر بھی لی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چار پانچ دن کے بعد ہر تکلیف میں تخفیف شروع ہو گئی ۔ غالباً ساتویں دن ٹانکے علیحدہ کر دیے گئے اور تقریباً کوئی تکلیف وہ شکایت باقی نہیں رہی میں خود بخود اُٹھنے بیٹھنے لگا تھوڑا بہت کمرے میں ٹہلنے بھی لگا ۔

اَب مجھ کو اجازت دے دی گئی تھی کہ "کھاؤ پیو اور ٹہلو" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
دوستوں اور اعزّا نے کھانے پینے کی چیزیں خوب خوب بھیجیں اور میں نے بھی انتہائی انتقامی جذبے کے ساتھ ان کی پذیرائی کی ۔ بیماری اور پرہیز میرے لیے لازم و ملزوم رہے ہیں لیکن کوئی سلیم المذاق انسان ہندوستانی علاج اور پرہیز سے عرصے تک ہم آہنگ نہیں رہ سکتا اس لیے تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میں ہمیشہ دوا اور پرہیز میں ایک حدِّ اوسط یا مفاہمہ قائم کر لیا کرتا تھا ۔ مثلاً ایک حکیم صاحب نے بتایا کہ پیٹھے کو کچل کر گردہ پر ضماد کیا جائے اور اس کا عرق پی لیا جائے ۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا اور اس پر کاربند بھی رہا کہ پیٹھے کی مٹھائی براہِ راست کھائی جا سکتی ہے!
میرے نزدیک ہسپتال سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مقام نہیں ہوتا ۔ اس اعتبار سے نہیں کہ وہاں انسان کو رہنے سہنے کی کوئی تکلیف ہوتی ہے بلکہ اس بنا پر کہ یہاں

لے مضامینِ رشید ، ۴۶

ہر ہر قدم پر ہر سمت اور ساری فضا میں سوا افسردگی، یاس، درد و شیون کے نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ کچھ اور محسوس ہوتا ہے۔ درماندہ مریض اور حزین تیمار دار دل کے تکلیف دہ منظر کو تندرست ڈاکٹر اور غالباً تندرست تر نرسوں کی مستعدی اور کبک خرامی اور زیادہ وحشت انگیز یا افسردہ کُن بنا دیتی ہے۔ صفائی اور ستھراپن میرے نزدیک بہترین چیزیں ہیں لیکن ہسپتال اور جیل خانہ کی صفائی اور ستھراپن میرے لیے اکثر وحشت انگیز ہوتا ہے۔

۱۴

"سیر کر دُنیا کی، غافل 'نوجوانی' پھر کہاں"!

○

میرے[1] سفر کی محرّک اکثر دو چیزیں ہوتی ہیں - آپریشن کرانا یا سفرِ خرچ وصول کرنا۔ جس کے مجموعے کا نام بڑے لوگوں نے "قومی کام" رکھا ہے۔ ریل[2] پر سفر کرنے والوں کی ایک عجیب ذہنیت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خرید لینے کے بعد وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وُہ ہر ایسے فعل کے لیے آزاد ہیں جس سے ڈبہ میں گندگی پھیلتی ہو یا ہو جانے کا امکان ہو۔ ڈبے[3] میں داخل ہوں گے تو اِس بدگمانی اور ارادہ کے ساتھ گویا تمام دوسرے مسافروں نے اُن کے حقوقِ راحت غصب کر لیے ہیں اور یہ نان کو آپریٹو قسم کے مظلوم ہیں یعنی ان کو اختیار ہے یہ جتنا چاہیں ظلم کر لیں دوسروں کو کوئی حقِ شکایت یا تدارک کا نہیں ہے!

میرا اُصُول[4] سفر یہ ہے کہ میں اور میرا ہم سفر پہلے یہ طے کر لے کہ کون سینئر ہوگا اور کون جونیئر - سینئر اور جونیئر میں فرق یہ ہے کہ میں (جونیئر) آپ (سینئر) کی معیت میں ہوں تو پھر میرا خوش گوار فرض ہوگا کہ میں تانگہ پکڑ لاؤں، اسباب بار کراؤں، کرایہ چکاؤں - دُوکان پر جائیں تو آپ تانگے ہی پر بیٹھے رہیں - میں کپڑے، موزے، جوتے پھل پھلہری لا لا کر آپ کو دکھاؤں، کوئی فقیر آجائے تو مار بھگاؤں یا آپ کے پیسے میں

۱؎ مضامینِ رشید، ۵ ۔۔۔ ۲؎ مضامینِ رشید، ۱۷

۳؎ مضامینِ رشید، ۲۳۱ ۔۔۔ ۴؎ مضامینِ رشید، ۱۸۳

سے خیرات میں دے دوں، مجھے کوئی چیز پسند آجائے تو آپ خرید دیں۔ کہیں بحث و مباحثہ کی نوبت آجائے تو قبل اس کے کہ آپ غلط اُردو بولنے پر مجبور ہوں میں غلط انگریزی بولنے لگوں۔[1]

سینیئر[2] اور جونیئر کے فرائض یہ ہیں کہ صرف ریل کا کرایہ اپنے پاس سے ادا کر دیں اس کے بعد موٹر، تانگے کا کرایہ، قُلی کی مزدوری، کھانے کی قیمت، قیام طعام اور راستہ کے تمام اخراجات سینیئر کے ذمّے۔ ناشتہ لے جانے کا ذمہ دار بھی سینیئر ہے یا جہاں جا رہے ہوں وہاں جونیئر کو روپوں کی ضرورت ہو تو سینیئر کا فرض ہے کہ وہ روپے بطور قرض عطا کرے جہاں تک اِس قسم کے قرض کا تعلق ہے جونیئر کا فرض ہے کہ وہ اپنی سہولت کو مدِّ نظر رکھ کر بالاقساط ادا کرے لیکن ہمیشہ اور ہر مجمع میں اس کا اقرار کرے کہ اُس نے قرض لیا ہے اس کے علاوہ جونیئر کا فرض یہ ہے کہ وہ اسباب وغیرہ کا نگران رہے۔ سینیئر کے لیے ریل پر ہر قسم کی سہولت فراہم کرے مثلاً نشست پر سینیٹری، دوڑ کر پانی یا ضرورت کی چیزیں اسٹیشن پر سے لایا کرے۔ قُلی، تانگہ والے سے لڑائی مول لے۔ ٹکٹ کلکٹر سے انگریزی بولے۔ ریل پر سوار ہوتے ہوئے نئے مسافروں کو اندر نہ آنے دے اور سینیئر کو باہر نہ جانے دے۔ ناشتہ دسترخوان پر چُن دے اور پھر ساری چیزوں اور برتنوں کو سمیٹ لے مختصر یہ کہ ہر قسم کے متوقع یا غیر متوقع اخراجات کا سینیئر اور خدمات کا جونیئر ذمّہ دار ہو۔

سینیئر[3] بننا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے صورت شکل، وضع قطع، رکھ رکھاؤ ضروری ہے۔ مجھے اکثر میٹنگ وغیرہ میں شریک ہونے کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسی دشواریاں آئی ہیں اور ایسی رُسوائی ہوئی کہ اکثر جی میں آیا ہے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس بیٹھ جاؤں۔ اوّل تو قُلی پوچھتا ہے کہ صاحب اِنٹر کلاس میں اسباب رکھوں؟ اُس کے بعد ہر بڑے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر آتا ہے، خوانچہ والے وہی بڑے پیش کرتے ہیں اور

---

[1] مضامینِ رشید، ۲۳۱ [2] مضامینِ رشید، ۱۸۴

پانی والا تا ملوٹ اور بالٹی دکھاتا ہے!

ایک بار ایک صاحب بہادر بھی ہم سفر تھے۔ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہی تھ
کہ نہایت دلنیذیری لہجے میں فرمایا: یہ تو فرسٹ کلاس ہے۔ مَیں نے اُن کی اطلاع س
کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا تو بولے: یہ سیکنڈ کلاس نہیں ہے۔ مَیں اَب بھی خاموش ر
ارشاد ہوا: انٹر کلاس آگے ہے۔ مَیں نے کہا: گاڑی چھوٹنے والی ہے، فرمایا: تو
تھرڈ میں بیٹھ جاؤ۔ مَیں نے عرض کیا: سفر لمبا ہے، اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے
فرمایا: یہ فرسٹ کلاس ہے، مُقدّمہ چلایا جائے گا۔ مَیں نے کہا! شکریہ، لیکن ہم دونو
ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اَب تک ہم دونوں صحیح انگریزی بول رہے تھے اس لی
کسی قسم کی ناہمواری نہیں پیدا ہوئی صاحب نے سگریٹ سُلگا کر کچھ اور فرمایا جس کو
مَیں نہ سمجھا، میں نے ڈبیہ میں سے ایک پان نکال کر مُنہ میں رکھا اور عرض کیا! مکرّر
ارشاد ہو۔ فرمایا: ہم بولا تم دوسری گاڑی میں جانا مانگتا۔ مَیں نے عرض کیا: ہم سمجھا
بٹ یہی جگہ بیٹھنے مانگتا۔ صاحب کا رنگ مُتغیّر ہونے لگا۔ ادھر خاکسار نے بھی
خلافِ معمول اَپنے چہرے پر کچھ آثارِ تسخیر پائے۔ صاحب نے انگریزی میں فرمایا: تم
کہاں جا رہے ہو۔ مَیں نے بھی انگریزی میں کہا: تم کہاں جا رہے ہو؟ فرمایا: جہنم کو۔
مَیں نے کہا مجھے بھی رفیقِ سفر سمجھیے لیکن میرا ٹکٹ واپسی کا ہے صاحب بہادر ہنس
پڑے، کہنے لگے جب منزل ایک تو ذریعۂ سفر ایک ہونے میں کوئی ہرج نہیں ہے
بولے: کیا کام کرتے ہو۔ مَیں نے کہا جاہلوں کو مہذب بناتا ہوں۔ صاحب کسی
قدر سرکہ جبیں ہو کر بولے: یعنی؟ مَیں نے کہا یونیورسٹی میں مُعلّم ہوں۔ صاحب بہادر
نے لپک کر نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا، معذرت چاہی اور اپنے طالب علمی
کے قصّے سناتے رہے۔ ایک اسٹیشن پر صاحب بہادر اُتر پڑے، ٹکٹ بابو
نے آکر مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ مَیں نے نکال کر دکھا دیا لیکن اُس کو کچھ اطمینان نہیں ہوا۔
اُس نے صاحب بہادر کی طرف اِس طور پر دیکھا گویا وہ چاہتا تھا کہ موصوف احتیاطاً
ٹکٹ دیکھ لیں۔ صاحب بہادر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا: کیا معاملہ ہے؟

میں نے کہا: میرے دوست کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں نے آپ کا ٹکٹ تو نہیں نکال لیا۔"

ریل[1] کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا خوش نصیبی ہے بشرطیکہ سفر خرچ دوسرے کے ذمّہ ہو! اس کے علاوہ حلیہ مسٹر لبھون جیسا، لباس صاف ستھرا جس میں سب نہیں تو ایک آدھ کپڑا اِل کا تیار کیا ہوا ضرور ہو۔ یہ اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ بعض کپڑے حسب ونسب کے اعتبار سے تو نجیب الطرفین ہوتے ہیں لیکن ان میں خاصیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ دھلے ہوئے ہونے پر بھی دھلے نہیں معلوم ہوتے۔ اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم پر صاف کپڑا بھی صاف نہیں معلوم ہوتا۔ خدا کے ایسے بندے بھی پائے جاتے ہیں جن کے جسم پر میلا کپڑا بھی میلا نظر نہیں آتا! یہ کرشمے کپڑے کے ہوں یا پہننے والے کے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے اس میں "غبار، دھند، جالا" وغیرہ کو دخل ہو جو فضا میں اکثر، میری آنکھ میں بیشتر اور سُرمے کے اشتہارات میں ہمیشہ ملتے ہیں۔

ٹرین میں جیسا کھانا، جن برتنوں اور جس شکل میں پیش کیا جاتا ہے اُس سے بچنے کے لیے ستھرے ناشتے دان میں گھر کا کھانا ہو۔ تھرمس یا صراحی میں صاف پانی ہو۔ ہولڈال ایسا ہو جیسے اسی سفر کے لیے خرید اگیا ہو نہ کہ بستر، پرانی ادوائن یا میلی گرہ دار نواڑ کے ٹکڑے سے بندھا ہو۔ ساتھی مسافر ایسے نہ ہوں جن کی بیویاں ہر اسٹیشن پر کورے گرد آلود آبخورے میں دودھ اور پتّے میں دہی بڑے خرید کر شوہر کے لیے فراہم کرتی ہوں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان خوبصورت، خوش لباس اور خوش اطوار بیویاں یہ سارے کام انجام دینے پر مامور رہتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ گرمی یا برسات کا موسم ہوا تو بار بار ہولڈال سے تولیہ نکال کر شوہر نامدار کو مسلسل پسینہ پونچھتے رہنے کے لیے دیتی رہتی ہے اور شوہر صرف بنیان میں ملبوس، تکیہ لے کر کبھی اوپر کی برتھ

---

[1] "اِدھر اُدھر کی" آج کل، دہلی فروری ۱۹۶۴ء، ۳

پر جا لیٹتا ہے کبھی فوراً ہی نیچے اُتر کر غسل خانے میں داخل ہو جائے گا اور وہاں سے نکل کر نچلی برتھ پر دراز ہو جائے گا۔ اُس کی یہ اور دوسری اضطراری حرکتیں اِس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ فرسٹ کلاس میں اُسے وُہ چین یا فضا نہیں میسّر ہے جس کا دراصل وہ عادی ہے۔ تندرست ہٹے کٹے شوہر کا سفر میں بیوی سے خادمہ کا کام لینا بڑی بدتمیزی ہے۔

ہم سفر کی سیرت کا اندازہ اِس طرح بھی کرتے ہیں کہ وُہ اپنی بیوی کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک رَوا رکھتا ہے نیز غسل خانہ استعمال کرنے کے طور طریقوں سے واقف ہے یا نہیں۔ اِیسا تو نہیں کہ فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کر کے وُہ سمجھے لگتا ہو کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب سے بھی وہ بَری ہو گیا۔! شریفوں کا شیوہ تو ہے کہ وہ اوّل درجے ہی میں نہیں تھرڈ کلاس میں بھی فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر مونگ پھلی، پکوڑے، دہی بڑے، کھیرا، لکڑی یا آم وغیرہ کھانے، پتّا چاٹنے اور ان کو کمپارٹمنٹ میں ڈال دینے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے۔ اَیسا معلوم ہوتا ہے جیسے اِس وحشی اور گنوار نے غسل خانہ اور کمپارٹمنٹ ایک کر دیا ہو۔

مجھے دولت پسند ہے، سب سے زیادہ اِس لیے کہ اس سے مَیں دوسروں کو مستغنی الاحوال بنا سکتا ہوں لیکن اَیسے نَو دولتوں کو چمٹے سے بھی چھونا پسند نہیں کرتا جو دولت کے زُعم میں اَقدارِ عالیہ کو نظر انداز کر دیتے ہوں۔ اَقدارِ عالیہ جتنے ہوں، ہُوا کریں، بذاتِ خود مَیں نے اس میں حفظِ مراتب اور صفائی ستھرائی کو بھی شامل کر رکھا ہے۔

یہ ساری باتیں ناخواندہ مہمان کی طرح ذہن میں آ گئیں۔ ظاہر ہے ایسے مہمان سے کسی نہ کسی طرح اور جلد سے جلد گلو خلاصی کرنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اِس کا ایک طریقہ ہے کہ اُپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ناظرین کو بھی اس میں شریک کر لے۔ دراصل جو واقعہ بیان کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ایک بار یونیورسٹی

کے خرچ پر فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ کالے کم رو، کم سخن، کُشرے سے بڑے ذہین، اپنے سے مطمئن، دوسرے سے بے نیاز، عمر کے اُس حصّے میں جب وہ ہوتی تو ہے کسی قدر زیادہ لیکن کم کرکے بتانے کی خواہش ہوتی ہے ...... اپنے کو نہیں تو دوسروں کو!

کمپارٹمنٹ میں داخل ہُوا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے موصوف کو میرا آنا پسند نہ آیا ہو۔ حلیہ شریف کا سوال نہ تھا، اِس لیے کہ میری صورت دیکھ کر وُہ کیا کوئی بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے نہایت شریفانہ لہجے اور آداب کے ساتھ سَلام کیا۔ اِس کا جواب اُنہوں نے اِس طرح دیا کہ مَیں اُن سے آیندہ کسی قسم کی توقع نہ رکھوں۔ اُن کے اِس سلوک سے دل ہی دل میں بہت محفوظ ہوا۔ بَد دماغ سے بد دماغی کا مظاہرہ ہو تو مجھے بڑا لُطف آتا ہے جیسے وہ شخص اپنے ہی جوشاندہ میں جوش کھا رہا ہوں۔ اِس وقت مجھے وُہ مثل یاد آئی جو کہیں پڑھ چکا تھا یعنی اُس بَدصورت عورت سے زیادہ بد دماغ اور مغرور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا جس کی شادی ہو گئی ہو!

اُن کی طرح مَیں، یا میری طرح وُہ ٹرین سے سفر کے تو قائل تھے لیکن ٹرین کے آب و دانہ کے نہ تھے، اِس لیے دونوں نے خورونوش کا انتظام پبلک سیکٹر کے بجائے پرائیوٹ سیکٹر سے کر رکھا تھا۔ اُن کا ناشتہ دان تامچینی کا تھا، میرا المونیم کا، جہاں تک اندازہ لگانے کا تعلق ہے، خوراک فروکرنے کی جو صلاحیت بظاہر اُن میں معلوم ہوتی تھی، اُس کی رُو سے اُن کا ناشتہ دان بڑا اور اسی اعتبار سے میرا چھوٹا تھا۔ اسی سے ناشتہ دانوں کے مشمولات و مقدار کا بھی حساب لگایا جا سکتا ہے، میرے پاس پانی کی صراحی اور گلاس تھا۔ انھوں نے اس کا انتظام بوتلوں میں کر رکھا تھا۔ میں گلاس میں پانی اُنڈیل کر پیتا تھا۔ وہ براہِ راست بوتل سے پیتے تھے۔ اُن کا پینا بالجہر ہوتا میرا بالسّر۔

مَیں دوپہر کا کھانا گھر سے کھا کر چلا تھا۔ یوں بھی ایک زمانے میں کھانے میں

نہ وقت کا پابند تھا نہ بھوک کا۔ جب ملا، جتنا ملا کھا لیا۔ کبھی دو ایک وقت پیشگی کا بھی۔ یوں بھی کھانے کے فن کاروں نے بتایا ہے کہ کھانے کے لیے بھوک کو نہیں مواقع کو اہمیت دینی چاہیے۔ اسی طرح اگر دو ایک وقت کھانا نہ ملے یا طبیعت کے مُطابق میسر نہ آئے تو آمادۂ فساد نہ ہونا چاہیے۔ شریف آدمی کو ٹھکانے کا کھانا بالفرور مل کر رہتا ہے!

گھر سے کھا کر چلنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہوتی ہے، روکھا پھیکا، روزمرّہ کا کھانا تو حسبِ معمول گھر پر کھا لیا۔ اس طرح اچھّے ناشتہ کی مقدار میں جو ہم سفر ہونے والا تھا کمی نہ آئی۔ دوسرے گھر والوں کا کہنا یہ تھا کہ سفر شروع نہ ہو چکا ہو تو سفر کے کھانے میں ہاتھ لگانا کیسا! پھر یہ بھی ممکن ہے راستے میں دوسروں کو بھی شریکِ دسترخوان کرنا پڑے تو کھانے کی کمی کی وجہ سے اِس کی نوبت نہ آئے کہ ایک دوسرے سے تا اختتامِ سفر آنکھ نہ ملا سکیں! اِس لیے مَیں سفر میں ناشتے کی مقدار ذرا زیادہ ہی رکھتا ہوں!

لنچ کا وقت آیا۔ ہم سفر نے ناشتہ دان کھولا، اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ جسے اُنھوں نے اِس رغبت سے، اِتنا جلد جلد اور اس مقدار میں کھانا شروع کیا جیسے وہ اپنا نہیں کسی دوسرے کا کھانا کھا رہے ہوں! مَیں اِس کا منتظر تھا کہ رسماً یا اخلاقاً مجھے بھی شرکت کی دعوت دیں گے۔ چونکہ میرے پاس خود کھانے کا سامان موجود تھا اِس لیے انہیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دعوت دینے کا بدلہ مَیں بھی کر سکتا تھا لیکن کچھ ایسا معلوم ہُوا کہ کھانے کے معاملے میں وہ ہر شبہے کو یقین پہ ترجیح دینا پسند کرتے ہیں!

اُنھوں نے مطلق التفات نہ کیا تو مَیں غور میں پڑ گیا کہ یہ کس قبیلہ یا قماش کے آدمی تھے کہ اتنا معمولی اور بے ضرر آداب ملحوظ رکھنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ وہ کچھ اِس طرح کھانے کے شغل میں منہمک رہے کہ مَیں اُن کی ولدیت، قومیت، سکونت، وارِدِ حال وغیرہ کے بارے میں کوئی رائے نہ قائم کر سکا۔ وہ کھاتے رہے اور میں

پیچ و تاب میں مُبتلا رہا یکایک اُنھوں نے ایک مُسلّم پیاز نکالی اور اُوپر کا ہلکا پھیکا سُرخ چھلکا دور کر کے براہ راست دانتوں سے کاٹ کر اس طرح اُس کو کھانا شروع کیا جیسے وہ پیاز نہ تھی آڑو یا آلوچہ تھا۔ اِس کے بعد کچھ دیر تک طرح طرح کی مٹھائیوں سے شغل فرماتے رہے۔ ایک بوتل کا نصف پانی غٹ غٹ پی گئے اور اطمینان کا ڈکار آہنگ، سانس لیا۔ ناشتہ دان بند کر دیا اور باوجود اس کے کہ گرمی کا موسم تھا، سر سے پاؤں تک کمبّل تان کر لیٹ رہے۔ گرمی کا موسم دوپہر کا وقت، کمبّل کا اوڑھنا سمجھ میں نہ آیا۔ ذرا دیر میں خرّاٹے کی آواز آنے لگی معلوم نہیں کیوں مجھے سونے میں خرّاٹے کی آواز اور باآواز بلند ڈکار لینے سے بڑی وحشت ہوتی ہے وحشت کی بجائے کوئی اور لفظ لکھنا چاہتا تھا لیکن "سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا" کی بنا پر جہاں کا تہاں رہ گیا۔

گاڑی چلتی رہی۔ وہ خرّاٹے لیتے رہے اور میں سوچتا رہا کچھ اس طرح سے سوچنا جس پر دیکھنے والوں کو اونگھنے کا گمان ہو۔ ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ پلیٹ فارم پر اُن کی پذیرائی کے لیے اِتنے اور اَیسے اَیسے لوگ نظر آئے کہ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ ان کی پذیرائی میری گرفتاری پر نہ ختم ہو۔ کچھ بڑے لوگ پلیٹ فارم پر مؤدبانہ ہاتھ ملانے لگے۔ اُن سے چھوٹے "اٹینشن" تھے اور جو اُن سے بھی کمتر درجے کے تھے وہ کمپارٹمنٹ سے سامان اُتارنے کے لیے اس طرح جھپٹے کہ مَیں سمٹ کر اپنی سیٹ کے گوشے میں پاؤں اُٹھا کر بیٹھ گیا کہ کہیں اسباب کے ساتھ اس خاکسار "اسبابِ بغاوتِ ہند" کو بھی حراست میں نہ لے لیں!

جس ہنگامے پر کمپارٹمنٹ اور پلیٹ فارم کی رونق تھی، وہ کچھ ماند پڑی تو اَپنے ہی جیسے حُلیے اور اَوقات کے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون تھے۔ اُنھوں نے نام اور القاب اور منصب بتائے تو اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ اُن کے بارے میں خیال تھا وہ صحیح تھا اور کھانے پر رسماً بھی مدعو نہ کرنے اور سموچے پیاز علی الاعلان کھانے میں وہ بالکل حق بجانب تھے!

ایک کام کے سلسلے میں کئی سال یونیورسٹی لائبریری جانا پڑتا تھا جہاں دفتر واقع تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ عمارت کے سامنے دُور دُور تک شوقِ شہادت میں شرابور (غالباً گرمی کا موسم تھا) بھڑکیلے رنگ کی قمیضوں اور چُست پتلونوں میں ملبوس یونیورسٹی اور اطراف و جوانب کے نوجوانوں کا ہجوم متلاطم ہے۔ مجمع بڑھتا جاتا تھا اور اس کے بے قابو ہونے کے آثار بھی پیدا ہو چلے تھے۔ قریب کے ایک صاحب سے پوچھا "یہ ماجرا کیا ہے؟"

پہلے تو اُنھوں نے مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھا جیسے اُن کے سامنے میں نہ تھا اصحابِ کہف میں سے کوئی صاحب تھے۔ پھر بولے: آپ نہیں جانتے کہ لائبریری میں آج ایک فلم کی شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ایک کمپنی آئی ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا: تو اس میں کیا حرج ہے۔ فرمایا: ہیرو اور ہیروئن کو ہماری نئی خوبصورت لائبریری میں مصروفِ مطالعہ یا معاشقہ دکھانے والے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یہ تو کوئی ایسی بات نہیں، یہ تو یوں بھی ہوتا رہتا ہے۔ کہنے لگے: آپ کہیں باہر سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پوائنٹ یہ ہے کہ لائبریری، یونیورسٹی اور تا بہ ثریا از آنِ ماست، ہیرو، ہیروئن بننے کا پہلا حق ہمارا ہے ورنہ پھر یہ کیا جائے کہ اِن دونوں میں سے ایک پبلک سیکٹر کا ہو دوسرا پرائیویٹ کا۔

میں نے کہا: پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر کا دردِ سر تو حکومت کا ہے۔ ہم آپ اس جھگڑے میں کیوں پڑیں۔ ہمارا آپ کا دردِ قولنج دوسرا ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے، ہر ڈرامے میں ہیرو ہیروئن کے علاوہ ایک اور کریکٹر بڑا جاندار ہوتا ہے۔ بولے: وہ کیا؟ میں نے کہا ویلن کا! ایک مسخرے کی بھی ضرورت ہوگی، پہلے پر آپ اکتفا کیجیے، دوسرے پر میں! اس وقت تو ان فلم والے غریبوں کو پیٹ کا دھندا کر لینے دیجیے۔ ہم آپ تو نمبری ہیں، کہیں اور راستہ نکال لیں گے۔ مُسکرا کر بولے: — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو۔" میں نے مؤدب ہو کر داد دی تو

گرج کر فرمایا: "ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند۔" مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب جبکہ یہ شعر پڑھنے لگے ہیں کچھ نہ کر پائیں گے۔

اِتنے میں ایک جوان، سادہ لباس میں نمودار ہوئے۔ غالباً پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے تھے، پوچھا، کیوں جی! یہ کون تھا جس نے ابھی ابھی کرپان کا نام لیا تھا۔ میں ڈر گیا اور "......من نہ بودم" کہتا ہوا آفس میں جا چھپا ——

تھوڑی دیر بعد جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مجمع منتشر اور میدان صاف ہو گیا ہے۔ تعجب ہوا کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگائے اور آس پاس کا حُلیہ بگاڑے بغیر مجمع کس طرح پسپا ہو گیا۔ بتایا گیا کہ اربابِ یونیورسٹی نے سمجھایا، پولیس نے دھمکایا۔ فلم والوں نے راہِ فرار اختیار کی، اِس لیے "تماشا نہ ہوا!"

بات آئی گئی ہو گئی — "جاڑا، گرمی، بہار، برسات" اور ان کی صبح و شام اُکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ گزرنے لگے جن کو میں زندگی کا ناقابلِ برداشت خلجان سمجھنے اور محسوس کرنے لگا ہوں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جب "ہر رُت میں نیا سماں، نئی بات" پاتا تھا۔ خیر، یہ بات تو برائے بیت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ از کار رفتہ اور تقریباً "مابعد الطبیعات" ہو جانے کے باوجود یہ خیال برابر آتا رہتا ہے کہ تیمور کے گھر کی حمیّت کہاں گئی اور کیوں گئی؟ کیوں گئی، اِس کا جواب تو واضح ہے کہ "شامتِ اعمال" کی زد میں آ گئی۔ رہا یہ کہ کہاں گئی، اِس کے بارے میں گمان ہوتا ہے، وہ کہیں گئی نہیں ہے، صرف متاعِ کاسہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اِس لیے کوئی اس کا خواہاں نہ رہا۔

جہاں سُنیے، جدھر دیکھیے نوجوانوں کا یکساں حال ہے۔ ایک زمانہ تھا بھلا یا بُرا جب اخلاق و عادات میں نوجوان اپنے بوڑھوں اور بزرگوں کی تقلید کرتے تھے۔ اب بوڑھے اور بزرگ نوجوانوں کے اخلاق، عادات، لباس اور طور طریقوں کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بوڑھوں کا یہ طریقہ جتنا مضحکہ خیز ہے اُتنا ہی عبرت انگیز بھی ہے۔ یوں تو زمانے کا دستور ہمیشہ سے یکساں چلا آتا ہے لیکن ایک نئی بات ضرور محسوس ہوتی ہے کہ پہلے زمانے میں بوڑھا ہونے سے کچھ قبل ہی لوگ اپنے

کو بوڑھوں کے زمرے میں شمار کرنے لگتے تھے اور اسے شرافت اور وضع داری کا تقاضا اور امتیاز سمجھتے تھے۔ اب بوڑھا ہونے پر بھی اپنے کو بوڑھا سمجھنا عار سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اکثر ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنے کو نوجوانوں سے بھی زیادہ نوجوان قرار دیے جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کہتے ہیں اس طرح کی خود فریبی سے عمر بڑھتی ہے، عقل گھٹتی ہے تو گھٹتی رہے!

اب صورتِ حال کچھ اِس طرح کی ہے کہ فرد ہو یا جماعت اپنے کو ہر طرح کے احتساب سے آزاد سمجھتی ہے جس کے جی میں جو آتا ہے کہہ ڈالتا ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔ اب گناہ، گناہ نہیں رہا۔ مان یہ لیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب بُرا نہیں، صرف اتنی احتیاط ضرور کر لینی چاہیے کہ مُلک کا قانون گرفت میں لے کر سزا نہ دے دے۔ رہے اخلاقی گناہ، اِن کو ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دے کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ایسے معاملات میں دخل دینا فرد کی آزادیٔ فکر و عمل میں مُخل ہونا ہے جو سب سے بڑا گناہ یعنی (BADTASTE) یار کا کت ہے مثلاً ناداری اور بھوک سے مجبور ہو کر کوئی بدنصیب دو مُٹھی اناج یا ایک آدھ روٹی چُرا لے تو اُسے جیل خانے بھیج دیا جائے لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو زدوکوب کرتا رہے اور دوسرے کی بیوی سے التفات کرے تو یہ اُس کا ذاتی فعل ہے، اس میں حائل ہونا بدمذاقی ہے۔ حالانکہ یہ ایک مُسلّمہ امر ہے کہ اچھے یا بُرے شخصی اعمال ہی سوسائٹی کے قوام کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر شخصی یا نجی بداعمالی جس کو ہماری تہذیب نظر انداز کرتی ہے وہی قومی و اجتماعی بداعمالی کی مُحرّکِ اعظم ہوتی ہے۔

اِسے ایک تسلیم شُدہ اُصول مان لیا گیا ہے کہ جو خرابیاں ہم اپنے اِرد گرد پاتے ہیں اُن کے اسباب جہالت افلاس، بیماری اور ناموافق ماحول ہیں لیکن اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری کوششوں سے اِن مصائب میں بہت کچھ کمی آ گئی ہے اور بتدریج آتی جا رہی ہے جسے بحیثیتِ مجموعی ہم نے معیارِ زندگی کی بلندی

کا نام دے رکھا ہے پھر کیوں ؎

ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

معیارِ زندگی کے اونچا ہونے سے معیارِ اخلاق کیوں اونچا نہیں ہوتا؟ ایسا تو نہیں، اِس نظریے میں کوئی مُغالطہ راہ پا گیا ہو۔ حالات کو دیکھتے ہوئے گمان یہ ہوتا ہے کہ یا تو معیارِ زندگی کے نشیب و فراز کا کوئی علاقہ معیارِ اخلاق کے نشیب و فراز سے نہیں یا پھر معیارِ زندگی کو ہر حال میں بڑھانا چاہیے، معیارِ اخلاق اپنی صحت و سلامتی کے لیے کوئی دوسرا دروازہ دیکھے!

زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے جو ذرائع اور وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں وہ ٹھیک ہیں لیکن اِس کی مضرتوں سے بچنے اور بچانے کے لیے اخلاقی اقدار کو مؤثر و مُستحکم کرنے کی بھی اتنی ہی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک ترقی یافتہ قوم اور مُلک کے جرائم و ذمائم غیر ترقی یافتہ قوم اور ملک جرائم ذمائم سے کہیں زیادہ سنگین اور دُور رس ہوتے ہیں۔ معیارِ زندگی کو یک طرفہ ترقی دینے کے خطرات کی طرف توجہ کم مائل ہوتی ہے، شاید اس لیے کہ ثواب کمانے سے کہیں آسان گناہ سے فائدہ اُٹھانا ہوتا ہے۔ اِس طرح کے دُور از کار خیالات میں دیر تک اونگھتا رہا۔ اِس کے بعد زندگی کے معمولات شروع ہو گئے اور وہ خس پندار کہ "ایں کشاکش باادوست" کا طلسم ٹوٹ گیا۔

علی گڑھ کا گرمی کا زمانہ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اِس موسم میں فضا و قدر ہم سے آدمیت کا شرف چھین لیتے ہیں گرد، گرمی تیز لو، تمام موجودات پر کرب و کراہت کا عالم، موت سے ڈرنا تقاضائے فطرت ہے لیکن ہر قیمت پر زندہ رہنے کی خواہش بھی کسی لعنت سے کم نہیں۔ ساری زندگی نیک نامی میں بسر کرنے کے بعد علی گڑھ میں گرمی کے زمانے میں مرنا بڑی ہی بدنصیبی ہے۔ دوڑ دھوپ، تجہیز و تکفین کا انتظام، عزیزوں اور شریفوں کا میّت کو دفنانے قبرستان لے جانا اور وہاں دیر تک انتظار کی زحمت اُٹھانا

بڑا تکلیف دہ خیال ہے جو آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے، اُتنا ہی زیادہ اُس کی تجہیز و تکفین میں شریفوں کو اذیت اُٹھانی پڑتی ہے یہ صورتِ حال مرنے والے کے لیے کسی طرح موجبِ فخر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کے خیالات غالبؔ کے رہے ہوں گے جب اُنھوں نے یہ لافانی شعر کہا تھا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اِس بارے میں غالبؔ اتنے غیور تھے کہ مرنے سے ایک منزل پہلے کی بھی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ مشہور قطعہ کا صرف آخری شعر کہہ دینا کافی ہوگا ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

جب کبھی موسم نہایت درجہ خراب ہوتا ہے۔ تہوار یا آس پاس کوئی اور تقریب ہونے والی ہوتی ہے تو اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ ایسے مواقع پر میری موت واقع نہ ہو۔ نارمل حالات میں چاہے جب ہو جائے۔ اِس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی سُن لیجے ــ لندن میں دو شنبہ کا اُٹھ سے دس بجے دِن تک کا وقت آفس یا کارخانے وغیرہ کے ملازموں کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کا ہوتا ہے۔ ہر شخص اَپنے کام پر ٹھیک وقت پر پہنچنا چاہتا ہے۔ زیرِ زمین بجلی سے چلنے والی گاڑیاں بڑی پابندی اور تیزی سے آتی جاتی رہتی ہیں ایسے ہی ایک دو شنبہ کو آٹھ سے دس بجے دن کے درمیان چلتی گاڑی کے سامنے چھلانگ لگا کر ایک شخص نے خودکشی کر لی۔ گاڑی روک دی گئی اور نعش کو علیحدہ کیے جانے کا انتظام کیا جانے لگا۔ اِس میں کچھ وقت صَرف ہوا۔ سواریوں میں سے ایک خاتون سے اُکتا کر فرمایا: کم بخت کو خودکشی کے لیے دو شنبہ ہی کا دن، اِسی گاڑی اور اسی وقت کا انتخاب کرنا تھا۔"

ایک دن گرمی انتہا پر تھی۔ لائبریری سے نکل کر دہکتی ہوئی دھوپ اور تیز لو

میں گھر واپس آرہا تھا۔ سڑک پار کی تو حاشیہ پر لگے ہوئے ایک جنید درخت کی جڑ پر بیٹھا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ جسم پر صرف ایک میلی پھٹی لنگی تھی۔ چھتری سنبھالتا، جھکڑ سے بچتا جلد جلد وہاں سے گزرا۔ غور سے یہ دیکھنے کی نہ ضرورت سمجھی نہ ہمت پڑی کہ کون شخص تھا اور وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ کچھ ہی دُور نکلا تھا خیال آیا کہ درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ آواز سُنی تھی جس کا میں نے کچھ خیال نہیں کیا اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ کوئی فقیر ہوگا جس نے پیسے مانگے ہوں گے۔ کچھ دُور جانے کے بعد بھوک اور موسم دونوں کی سختی اور زیادہ محسوس ہوئی تو فقیر کا خیال آیا کہ اُس پر معلوم نہیں کیا گزر رہی ہوگی۔ بادلِ ناخواستہ پلٹا۔ جیب سے کچھ پیسے نکالے اور اُس شخص کے پاس آکر کہا: یہ لو، تمہاری آواز اچھی طرح نہیں سُن سکا تھا"۔ قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں پہ اُبلی ہوئی ترکاری اور ساگ کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے اعتماد لیکن انکسار سے کہا: میاں! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ آپ کو دھوکا ہوا۔ مَیں نے کچھ مانگا نہیں تھا۔ کھانے کا وقت تھا، مَیں کھا رہا تھا۔ آپ بھی شاید بھوکے گزر رہے تھے مُنہ سے نکل گیا: "میاں کھانا حاضر ہے! آپ کے لائق یہ ساگ اور سوکھی روٹی نہ تھی لیکن باپ دادا کی ڈالی ہوئی عادت کو کیا کہوں۔ کھانا کھاتے وقت کسی کو پاس دیکھتا ہوں تو اس طرح کی بات مُنہ سے نکل ہی جاتی ہے کوئی شریک ہو جاتا ہے تو دل خوش ہو جاتا ہے۔ نہیں ہوتا، جب بھی ایک طرح کی تسکین ملتی ہے۔ مزدوری میں جو پیسے مل جاتے ہیں اُس سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔ اِس کا شکر ہے۔ محنت مزدوری سے سارے کام چلاتا رہتا ہوں۔ پیسے آپ اپنے پاس رکھیں۔"

میں نہایت شرمندہ ہوا اور اس مزدور کے فقرِ غیور کے مقابلے میں اپنے تمام مناصب و مراتب پر لعنت بھیجتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

۵

"یا مظہر العجائب"، یہ مَیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔[۱] یہ تو قطعاً غیر متعلق گفتگو ہوئی۔[۲]

---

[۱] مضامین رشد، ۳۰۲   [۲] مضامین رشد، ۲۷۳

ہاں تو (بات کچھ) کہنے جا رہا تھا (سفر، ریل اور تعطیل کی!)

(ایک[1]) سال یونیورسٹی میں غیر معمولی تعطیل ہوئی یعنی غیر معمولی طور پر طویل جیسی طور پر ہر احمق شادی پر مرتا ہے اور بیوی سے بیزار ہوتا ہے۔ ہم کو بھی تعطیل اور طویل کے سلسلے میں انھیں مراحل سے گزرنا پڑا۔ یونیورسٹی بند ہوئی تو پھر سوچنا پڑا کہ آخر کیا کیا جائے چنانچہ مرشد (ذاکر صاحب) سے رجوع کیا گیا ــــ مرشد نے فرمایا تعطیل گزارنے کی دو صورتیں ہیں یا تو ع

سَیر کر دنیا کی غافل "نوجوانی" پھر کہاں!

اور یہ صورت اس حالت میں روا ہے جب صحت اچھی ہو اور روپے نہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیے۔ عزیزوں کی مدد کیجئے۔ کسی کی روپے سے، کسی کی کپڑے لتے سے۔ ایک کی تیمار داری کیجئے اور دو چار کی تجہیز و تکفین اور پھر بیمار، مفلوک، مقروض اور مطعون ہو کر واپس آجائیے....
طے یہ پایا کہ اس بارہ میں مرشد کی ہدایت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اب مسئلہ کی صورت یہ تھی کہ کہاں چلا جائے اور کب چلا جائے؟

ایک[2] دن ہم سب نے:

نکل گھر سے بس راہ شملے کی لی

خیال[3] آیا کہ روپے کم اور سفر طویل۔ سبیل ایسی ہونی چاہیے کہ کہ یا تو سفر مختصر ہو جائے یا روپے فراہم ہو جائیں۔ مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ کام شروع کر دینے کے بعد اس کا پروگرام بناتا ہوں چنانچہ جب تہائی سفر اور نصف روپیہ ختم ہو گیا تو خیال آیا ــــ یہاں پہنچ کر آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ کام شروع کرنے کے بعد پروگرام ہی کیوں بناؤ ــــ میں کہتا ہوں یہ میری کمزوری ہے اور اپنی کمزوری تسلیم کرنے کے بعد آپ جتنی حماقتیں یا مظالم چاہیں کر سکتے ہیں کسی کو چوں و چرا کی مجال

---

[1] مضامین رشید، ۲۲۰ [2] مضامین رشید، ۲۲۱

[3] مضامین رشید، ۲۲۹ [4] مضامین رشید، ۹۴

نہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ بڑے آدمی ہوں ۔۔۔ میرے لیے یہ اکتفا کرتا ہے کہ میں کہہ دوں کہ جب ذہن میں پروگرام آگیا تو اس پر ضرور عمل کیا جائے گا خواہ وہ کام جس سے پروگرام متعلق ہو ختم ہی ہو چکا ہو ۔۔۔ اس بارے میں شعرا کا مقلد ہوں ۔ کوئی خیال آیا تو باندھا ضرور جائے گا[1] خواہ اس حرکت پر لوگوں کو اپنا کرایہ دے کر شاعر صاحب کو پیٹنے ہی کیوں نہ آنا پڑے ۔ بہر حال راستے[2] میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مرشد دہلی اُتر پڑے ۔ (میرے ایک دوست میرمنجھو ڈیٹنگ ٹھہر گئے اور میں مکان واپس آگیا ۔

میر منجھو[2] اور مرشد (ذاکر صاحب) سے نجات پاکر علی گڑھ واپس آیا اتفاق وقت خبر آئی کہ عزیزوں میں ایک صاحب شادی کرنے والے ہیں ۔ دوسرے صاحب سفرِ آخرت کر گئے ۔ تیسرے صاحب آمادۂ رحلت ہیں اور چوتھے حضرت خود ہمارے یہاں تشریف لانے والے ہیں ۔ یہ آخری خبر ایسی بدحواس کن ثابت ہوئی کہ فی الفور بیوی بچّوں کو محفوظ مقام پر بھیج دیا گیا اور میں نینی تال کے لیے روانہ ہو گیا ۔

ایک دفعہ ایک کتے سے کچھ اختلاف آرا ہوا تھا اس سلسلے میں کسولی جانا پڑا تھا ۔ ورنہ اب تک کسی پہاڑ کو مجھ سے سابقہ نہیں پڑا تھا ۔ میں ایک عرصے سے ڈاکٹر اصغر صاحب (شعبہ نباتیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) سے ناخوش تھا اور سبب یہ تھا کہ اُنھوں نے میرے ساتھ کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آخر وقت میں اُنھوں نے وہاں جانے کا خیال ترک کر دیا ۔ مجھے اس سلسلے میں بہت کچھ زیر بار ہونا پڑا تھا اور میں نے عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک سفر یا وعدہ وعید کا تعلق ہے مجھ کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوگا ۔ اُنھوں نے بہت کچھ عذر و معذرت بھی کی لیکن میں اُن سے قطعاً بیزار رہا ۔ بایں ہمہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو قصور میں اصغر صاحب کے سر ڈال رہا ہوں اُسے خود مجھ کو اوڑھ لینا چاہیے کیونکہ دراصل میں نے کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا اور آخر وقت میں میں نے سفر سے انکار کر دیا ، اور وہ مجھ سے

---

[1] مضامینِ رشید ، ۲۲۹ [2] مضامینِ رشید ، ۲۳۰

بیزار تھے اور عزم کر چکے تھے اب سے میرے قول و فعل کا کبھی اعتبار نہ کریں گے
اور[1] اور میں نے بہت کچھ معافی مانگی لیکن انھوں نے اعتنا نہ کی بہر حال اول تو م
عادت رد و قدح کرنے کی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اب میرے اور ان کے تعلقات
نئے سرے سے شگفتہ ہوتے ہیں اس لیے میں اس مسئلہ کو معرضِ بحث میں نہیں
لانا چاہتا۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ جب ہم اور وہ نینی تال کو اپنا ممنونِ کرم
بنانے کے لیے روانہ ہوئے ہیں تو تعلقات کچھ یوں ہی سے تھے۔

ہم دونوں نینی تال پہنچے۔ ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں صاحب (صدر شعبۂ جغرافیہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) پہلے سے موجود تھے۔ ہم لوگ[2] ڈاکٹر صاحب کے مکان پر
پہنچے۔ یہ ایک عام گمراہی خلق اللہ میں چلی آتی ہے کہ جب کہیں کسی کے ہاں مہمان
کی حیثیت سے جائیے اور یہ یقین ہو کہ اس سلسلے میں ہم کو نہیں بلکہ صرف میزبان کو
ہر قسم کے اخراجات کی زیر باری نصیب ہوگی تو پھر اپنے آپ کو مطبوع اور مقبول
بنانے کے لیے ہر قسم کی کوشش کرنی لازم ہے۔ مجھ کو اور اصغر صاحب دونوں کو
اس گمراہی کا علم تھا لیکن دونوں اس کو ایک دوسرے سے چھپانا چاہتے تھے۔
چنانچہ میں تو اسباب وغیرہ سے اُلجھا ہوا تھا۔ اُدھر اصغر صاحب نے ڈاکٹر صاحب
کے چھوٹے شیر خوار بچے کو اس طور پر چمکارنا اور کھلانا شروع کیا کہ میں باوجود
ایک "پیشہ ور" والدین ہونے کے تھوڑی دیر کے لیے دم بخود ہو گیا۔ اور معاً یہ
خیال دل میں آیا کہ جھیل میں کود پڑوں لیکن جھیل دور تھی اور بچے کے نانا قریب،
چنانچہ ایک ہی زقند بھر کر اُن کے پاس پہنچا اور ایک ایسا تعظیمی آداب بجا لاکر
دست بستہ کھڑا ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لیے دونوں ڈاکٹر مبہوت ہو گئے۔ اِدھر
بغل گیر ہو رہا تھا اُدھر بچے سے مخاطب ہو کر کافی بلند آواز میں گویا ہوا:
بیٹے اپنی والدہ سے میرا، میری بیوی کا اور میرے بچوں کا سلام کہنا اور یہ بھی
کہہ دینا کہ آپ کو علی گڑھ آنے کی دعوت ہے۔ ہم لوگوں کی اس مقاومت و

۱؎ مضامینِ رشید، ۲۳۴ ۲؎ مضامینِ رشید، ۲۳۵

مسابقت کا کیا انجام ہوا، اس کا اندازہ ہم کو سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو سکا ہے کہ اصغر صاحب مجھ سے کچھ زیادہ اُلجھنے لگے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کا خاندان میرا مُعترف ہے۔ اِس کی تصدیق اصغر صاحب اور عباد الرّحمٰن خاں صاحب کر سکتے ہیں!

ڈاکٹر اصغر، ڈاکٹر خاں اور مَیں ایک ہی کمرے میں مقیم ہوئے۔ شیر و شکر چائے کی مانند۔ مجھ سے اور ڈاکٹر اصغر سے صُلاح ہو گئی تھی لیکن اس قسم کی صلاح جو تیاریِ جنگ کی تمہید ہوتی ہے۔ مَیں اور ڈاکٹر اصغر اپنی چارپائیوں پر دراز ہو گئے اور جب ڈاکٹر خان کو اطمینان ہو گیا کہ ہم دونوں کچھ عافیت سے رہیں گے یا رہنے دیں گے تو چپکے سے اُٹھ کر کہیں اور مُخل عافیت ہونے کے لیے چل دیے۔ شام کے وقت اُٹھے تو معلوم ہوا کہ بارش اور چاء دونوں موجود ہیں۔ پورا[1] دن اسی طور پر گذرا۔ شب میں بارش تیز ہوئی۔ صبح اصغر صاحب کو زکام اور ڈاکٹر خان کو حرارت اور مجھ کو فرحت معلوم ہونے لگی۔

اصغر صاحب صبح کو غسل کرنے کے عادی ہیں اور مَیں سردیوں میں اس چیز کو غیر ضروری ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی سمجھتا ہوں۔ اصغر صاحب ہر صبح کو نہانے کے دل دادہ ہیں میں کم سے کم تیسرے دن اِس مسئلے پر غور کرتا ہوں۔ پہلی ہی صبح کو اصغر صاحب نے فرمایا اور کسی قدر فلیشن کے لہجے میں کہ تم کو نہانا بھی ہوگا اور خط بنانا بھی، ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ علی گڑھ نباشد نینی تال ہے!

مَیں نے کہا جناب دیکھیے اُصول کے تحت بحث ہونا چاہیے مَیں بغیر ضرورت کسی کام کا کرنا حماقت سمجھتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیے کہ غسل کیوں کروں اور آپ کو کیوں کرنے دوں۔ غسل صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ جسم کی کثافت دور ہو، تندرستی میں ترقی ہو۔ یعنی ضرورتاً یا تفریحاً۔ ماشاء اللہ مجھے اپنی طہارت اور پاکیزگی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور نہ محسوس ہوتا ہے۔ رہا تندرستی کا

---

[1] مضامین رشید، ۲۳۷

سوال، وہ بھی اس درجہ ہے کہ اس سے ترقی کرنا ممکن ہے یعنی نینی تال یا علی گڑھ کی رُسوائی کا باعث ہو۔

خط بنانے کا اصول البتہ کچھ سمجھ میں آتا ہے یعنی خط بڑھا ہو یا نمایاں ہو، عورتیں عاشق ہونا یا اُن کے اعزہ واحباب چائے پلانا بند کر دیں۔ عورتوں کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہے۔جہاں تک میرا سوال ہے اُن کو کبھی مجھ سے عشق کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی خدا ہندوستانی دواخانہ اور ہندوستانی عورتوں کو سلامت رکھے۔ داڑھی جزوِ مناکحت قرار دی گئی ہے اور نہ جزوِ طلاق بلکہ میں نے مُرشد سے سُنا ہے کہ داڑھی عورتوں کو پسند ہے!

یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خط بنوانا ایک معاشرتی فعل ہے۔ اس پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن غسل کرنا تو قطعاً ذاتی فعل ہے ۔۔۔۔۔ اگر آپ کو اس سے اختلاف ہے تو ڈاکٹر خان سے رجُوع کیجئے۔ وہ قسمت میں مجُھ سے بہتر ہیں اور عقل میں آپ سے اور شکل وصورت میں مجھ سے آپ سے دونوں سے ـــــ اور پھر "گورنمنٹی" آدمی ہیں جب تک خود ان کا معاملہ درمیان نہ ہو ہمیشہ انصاف سے کام لیں گے۔

چنانچہ مسئلہ پیش ہوا اور جیسا کہ ایسے معاملات میں گورنمنٹ کا رویہ رہتا ہے یعنی فریقین موجود ہوں تو کمزور کو گھڑکی اور قوی کو تھپکی اور ان میں سے ایک موجود ہو تو حاضر کو تھپکی اور غائب کو صلواتیں اور دونوں غائب ہوں تو دونوں کو احمق سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر خاں نے بھی اِسی طریقہ کار کو اپنا رہنما بنایا لیکن ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ یعنی دونوں موجود تھے اور دونوں احمق گردانے گئے!

بعد میں معلوم ہوا کہ چونکہ ابھی ابھی وہ حرم سرا سے تشریف لائے تھے اور وہاں کچھ اختلافِ آرا یا اختلافِ مقاصد کی نوبت آچکی تھی اس لیے دماغی توازن قائم نہ رکھ سکتے تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ اُن کی اِس غلطی یا تیور سے محاربین خاموش بھی ہو گئے!

جب سے ہم لوگ نینی تال پہنچے تھے بارش کا سلسلہ برابر قائم تھا - اکثر یہ ہوا کہ ہم سب کئی کئی دن مکان سے باہر نہ نکل سکے - اس لیے برآمدہ یا کمرہ ہی میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر خان کے ماحضر پر اکتفا کرتے رہے - اچھا مکان، اچھا کھانا، اچھا میزبان، اچھا موسم، کوئی کام نہیں - نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اور اصغر صاحب کے درمیان کسی قدر کشاکش شروع ہوگئی - بات صرف یہ تھی کہ ایک دن موسم کسی قدر اعتدال پر نظر آیا - ڈاکٹر صاحب کو نباتات کے بعض اور نمونے جمع کرنے تھے اور ڈاکٹر خان کو حجری نمونے دستیاب کرنے کا شوق - مجھ سے فرمانے لگے کہ تم بھی چلو - میں نے کہا کہ مجھ کو جہاں کا تہاں چھوڑیے - مجھے جس نمونے کی تلاش ہے وہ جھیل کے کنارے ہی مل جاتا ہے - اس لیے میرا اور آپ کا ساتھ نہیں ہوسکتا - دونوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ ہی چلے چلو - تم بھی اپنی تلاش میں کامیاب ہو جاؤ گے اور یقیناً نہایت سستے داموں، غرض سب لوگ چلنے پر آمادہ ہوئے - ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ موسم کا تیور بدلا - اصغر صاحب کو یہ شکایت کہ میں نے چلنے میں دیر کی اور مجھ کو اس پر کوفت کہ اصغر صاحب نے ہمت چھوڑ دی - بہر حال ہم سب مکان کی سمت روانہ ہوئے اور راستہ بھر ایک دوسرے کو اس قدر نیک و بد سمجھاتے رہے کہ کوئی دور سے دیکھتا تو خیال کرتا کہ بعض پیشہ ور بد مذاق برج کھیل کر واپس آرہے ہیں اور اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ کھیل ہی رہے ہیں !

مکان واپس آئے تو دیکھا کہ (ہمارے دوست) منجھو جلوہ افروز ہیں - ڈھلے منجے بالکل فرنچ کٹ - کرسی پر بیٹھے سگار اس طور پر پی رہے تھے گویا ساری دنیا سے بیزار ہیں - میر منجھو اُن لوگوں میں تھے جن کی شادی والدین کرتے ہیں اور عقدِ ثانی دوست احباب ..... میر صاحب بوڑھے ہو گئے تھے لیکن بڑھاپا ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے ..... نماز روزے سے مستغنی، عورتوں سے مایوس اور شادی سے گریز، تہجد کے وقت تک جاگتے اور چاشت تک سوتے اور ذرا سی[1]

---

[1] مضامینِ رشید، ۲۲۳

بات پر خفا ہو جاتے اور بڑی سے بڑی مسرت پر کبھی متبسم نہ ہوتے۔

ایک[1] دن میر منجھو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے اور تجویز یہ ہوئی کہ آج کہیں نہ کہیں ضرور چلا جائے اور عجیب بات تھی کہ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر خان کے ایما سے میں نے میر صاحب کو خائف یا ناراض کرنے کی کوشش کی لیکن میر صاحب پر کچھ ایسی "کروشن فیلنگ" طاری تھی کہ ایک پیش نہ گئی۔ میر منجھو کی آمادگی نے ڈاکٹر اصغر صاحب کو بھی چلنے پر اُکسایا حالانکہ یہ دونوں بزرگوار پیدل چلنے اور بلندی پر چڑھنے سے اُتنے ہی بیزار تھے جتنا مجھے کسی "بور" (شخصے کہ بے ارادہ مکلّف باشد! اجبش[2] کا اُردو مفہوم کسی قدر "بلائے جاں" "عافیت سوز" یا "مُخلِ عافیت" ہو سکتا ہے۔) سے ملنے کے لیے اُٹھنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔

ہم[3] سب ایک طرف چل نکلے۔ ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر خان تو اپنے اپنے فن کی چیزوں کی تلاش اور تعریف میں انسانیت سے گزرنے لگے جہاں سبزہ ہوتا تھا ڈاکٹر اصغر سر دھننے لگتے تھے اور ایک ایک پتّے اور اس کے رگ و ریشے پر راگ اور رقص کو دخل دیتے تھے۔ دوسری طرف عُریاں چٹانوں کو پا کر ڈاکٹر خان اس کی ہیئت اور ماہیت حجری پر سُر دُھنتے تھے۔

میں نے کہا میر صاحب یہ دونوں بزرگوار تو ہاتھ سے گئے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ ہم دونوں بھی اپنی اپنی فکر کریں۔ اچھا ایک پان کھلائیے اور اس پل پر بیٹھ جائیے۔ دیکھیے نیچے کتنا تاریک اور گہرا غار ہے اور غار کی تہہ میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اگر ہم دونوں اس میں کود پڑیں تو پہلے کون شخص زمین پر پہنچے گا میر صاحب نے فرمایا اور کون مسخرا اس میں کودے گا۔ میں نے کہا کودنے میں کیا لگتا ہے۔ فرض کیجیے آپ ہی کو کودنا پڑے۔ میر صاحب نے کچھ غصّہ اور کچھ تحیّر میں آکر جواب دیا کودنا پڑے! فرمایا! میں کب آمادہ ہوں۔ میں نے کہا آمادہ تو میں بھی

---

[1] مضامینِ رشید، ۲۴۲ [2] مضامینِ رشید، ۵۵

[3] مضامینِ رشید، ۲۴۲

نہیں ہوں لیکن یہ میرا ذمّہ ہے کہ مَیں آپ کو کودنے پر مجبور کر دوں گا۔ میر صاحب پُل پر سے نیچے اُتر آئے اور فرمایا: اب کہو۔ مَیں نے کہا جب مَیں ایک کہوں تو آپ توبہ استغفار کر لیجیے گا، دو کہوں تو آنکھیں بند کر لیجیئے گا اور تین کہوں تو کود پڑیئے گا اور پھر جی چاہے تو آنکھیں بھی کھول لیجیئے گا۔ فرمایا یہ سب کیوں اور میں کیوں ماننے لگا۔ مَیں نے کہا اور مَیں جو ہپناٹزم جانتا ہوں۔ یہ میرا ہی تصرّف تھا کہ آپ پُل پر سے نیچے اُتر آئے۔ یہ تو میرا ادنیٰ تصرّف تھا۔ اگر پوری توجہ کرتا تو آپ پُل کی دوسری طرف اُترتے اور یہ تو صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ توبہ استغفار کی نیت کر رہے ہیں۔ "اچھا ایک" یہ کہنا تھا کہ میر صاحب یک لخت چونک پڑے، کیونکہ نیچے سے ڈاکٹر خان نے آکر اُن کی آنکھوں پر اپنی انگلیاں جما دی تھیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اب کوئی شخص ایسی حرکت نہ کرے گا جس سے اُس کا ذوقِ علم وغیرہ ظاہر ہوتا ہو۔

چنانچہ ہم سب ایک طرف چل نکلے۔ راستہ تقریباً مُسطّح موسم خوش گوار اونچی اونچی سرسبز چوٹیاں۔ اُچھلتے، بل کھاتے رقص کرتے ہوئے شفاف چشمے یا فرہاد کا خوابِ شیریں ...... ہم لوگ کئی میل تک باتیں کرتے چلے گئے۔ جن کی شادی ہو گئی تھی وہ بیویوں سے دُور رہنے پر مطمئن۔ جن کی نہیں ہوئی وہ نہ کرنے پر پریشان کہیں بیٹھے، کہیں بھٹکے، کہیں ٹھٹکے۔ ایک طرف سے بخاراتِ ابر اُٹھے، دیکھتے دیکھتے ساری وادی تاریک اور نمناک ہو گئی۔ طے یہ ہوا کہ اب جلد سے جلد واپس ہونا چاہیے۔ اصغر صاحب کو ایک گھوڑا مل گیا اور ہم لوگوں کا کیونکہ چڑھائی کا راستہ مختصر تھا اس لیے طے یہی پایا کہ زیادہ محنت اور مختصر راستہ قابلِ ترجیح ہے۔ کچھ ہی فاصلہ طے کیا گیا تھا کہ بارش شروع ہوئی۔ اصغر صاحب جا چکے تھے۔ مَیں میر منجھو اور ڈاکٹر خاں رہ گئے تھے۔ کسی کے پاس نہ چھتری تھی اور نہ واٹر پروف۔ سب نے بھیگنا اور میر منجھو نے ہانپنا اور کوسنا شروع کیا۔ طے یہ پایا کہ اگر میر منجھو کے ہمدوش و ہم عناں رہے تو دو قدم بھی چلنا دُشوار ہو گا۔ اِس لیے میر منجھو چھوڑ دیے گیے۔ ڈاکٹر خان بڑھتے چلے گئے، مَیں نے سوچا اگر میر منجھو چھوڑ دیے گئے تو ممکن ہے کہیں کسی ایسی حرکت پر نہ آمادہ

ہو جائیں جو "نقصان مایہ و شماتتِ ہمسایہ" کا موجب ہو اس لیے میں کچھ آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر میں میر منجھو بھی آکر مل گئے۔

فلیٹ[1] پر آئے تو میر صاحب کو برابر خیال رہا کہ لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے۔ میں نے کہا میر صاحب یہ تو نینی تال ہے اور اس قسم کے حادثات آئے دن یہاں لوگوں کو پیش آتے ہوں گے۔ مردوں سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آخر ہم آپ یہاں کے کس مرد سے کم خوب صورت، توانا یا آبرو باختہ ہیں۔ رہیں لیڈیاں تو وہ ایک دفعہ آپ کو دیکھ کر ہنس تو ضرور پڑیں گی لیکن بعد میں ضرور خیال کریں گی کہ ہم کتنے جری اور جفاکش ہیں کہ اس ابتلا و مصیبت میں بھی بشاش چلے جا رہے ہیں اور ہاں وہ قصّہ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ شیریں فرہاد ۔۔۔۔ ڈاکٹر خان نے یہاں پہنچ کر مجھے تیور سے ڈانٹا کہ میں بھی چپ ہو گیا اور میر صاحب سہم گئے۔

گھر پہنچے تو بچّوں نے تالیاں بجائیں، نوکروں نے انگیٹھیاں سلگائیں، کپڑے تبدیل کیے گئے، کھانا کھایا گیا ۔۔۔۔ چارپائی پر دراز ہوئے میر منجھو کو نیند نے جھیل میں اور اصغر صاحب کو برلن پہنچا دیا بیداری میں ڈاکٹر خان "اندرون خانہ" پہنچے ــــ میں نے خطوط کی طرف رُخ کیا۔ معلوم ہوا کہ بیوی ہسپتال میں اور بچے مکان پر ہیں اور بچّوں کے نانا زیر آپریشن۔ سب کو جواب لکھے۔ بیوی کو لکھا میں دوسری شادی ہرگز نہ کروں گا اور نہ یہاں اس نیت سے آیا ہوں بچوں کو لکھا تم لوگ امّاں بی کو پریشان نہ کرو گے تو پڑھنے لکھنے سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیے جاؤ گے۔ اُن کے نانا میاں کو لکھا مرضئ مولا از ہمہ اولیٰ۔ یہاں تبدیلئ آب و ہوا کی غرض سے آیا تھا لیکن ــــــــــــ آب و ہوا کی کچھ ایسی کثرت ہو گئی ہے کہ بیوی بچّوں تک پہنچنا دشوار ہو رہا ہے!

---

[1] مضامینِ رشید، ۲۴۶

۱۵

"ہر عقلمند شخص کے لیے دو حماقتیں ضروری ہیں:
ایک شادی، دوسری شاعری! —"

○

ہر عقلمند[1] شخص کے لیے دو حماقتیں ضروری ہیں۔ ایک شادی، دوسری شاعری۔ شادی اضطراری ہے اس لیے اس سے مفر نہ ہوا۔ شاعری اختیاری تھی اس لیے اس کی کوشش کی مگر بقول آتش جب موصوف "جوان" تھے یا بقول فانی جب ممدوح کے:

"مر جانے کا زمانہ تھا"

بہ ہزار دقت اور اس میں غالباً کچھ سرقہ اور اتنا ہی توارد بھی شامل تھا، دو مصرعے کھڑے کیے لیکن قبل مسیح ایڈیشن کے استاد نے:

علیلی کی تھیں جس نے آنکھیں دیکھیں

بتایا کہ ایک مصرعہ تو موزوں نہیں ہے اور دوسرا بے معنی ہے۔ میں نے جی کڑا کر کے دریافت کیا کہ اگر دونوں ملا دیے جائیں تو کچھ کام کی بات نکل آئے گی؟ انھوں نے کہا دو مہمل مل کر ایک معقول کب ہوتا ہے۔ میں نے ذرا ڈھیٹ ہو کر کہا آخر انگریزی میں "بلینک ورس" بھی تو مروّج ہے۔ کہنے لگے اردو میں زٹل قافیہ بھی تو ہے۔

بہرحال موصوف نے اس کے بعد ہی دنیا سے رحلت کی۔ میں نے بھی فرط

---

[1] مقدمہ دیوان فانی، باب دوم ص ۷۰

عقیدت سے آپ نے دونوں مصرعے اُن کے لوح مزار پر ثبت کرا دینے چاہے لیکن اُدھر قبہ جات کے مسائل ایسے پیش آئے کہ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس دورِ فتنہ میں اس کا ارادہ کیا گیا تو "مرحوم"۔ خاکسار، پسماندہ اور باقیات صالحات یہ دو مصرعے، کسی کی خبر نہیں مجبوراً ان کو بحفاظت تمام مقفل کر دیا تھا۔ سنا ہے بعض بے فکروں نے ان کو اُڑا لیا ہے اور اب انہیں دو مصرعوں کی دُہائی مچ رہی ہے!

اِس "اقرارِ صالح" کے بعد ناظرین (اطلاع پائیں کہ) میں اُن لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اُس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک اُنھیں ناموزوں نہ بنا لیا جائے! یعنی[۱] مجھے اشعار یاد نہیں رہتے اور جو یاد آتے ہیں وہ شعر نہیں صرف سہل ممتنع ہو کر رہ جاتے ہیں کبھی سہل زیادہ ممتنع کم، اکثر ممتنع زیادہ اور سہل بالکل نہیں! (بایں ہمہ) اچھے اشعار[۲] کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے معلوم نہیں کیا چیز، تصوّرات کو کہاں کہاں لیے پھرتی ہے وہی افسانہ و افسوں، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و اُمید جو بچپن میں پیدا ہوتے تھے، اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں —

اچھا[۳] شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں سارا جھگڑا اِسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے!

بطیبِ خاطر میں کسی شاعر سے شعر سُنانے کی فرمائش نہیں کرتا اور اس بات سے اور زیادہ بدحظ ہوتا ہوں کہ خود شاعر بے تکلف ہو کر یا بے ادبی اشتعال جس کا

۱ے گنج ہائے گراں مایہ، ۲۳۶ ۲ے نقوش لاہور، مارچ ۱۹۶۳، ۱۲۹

۳ے گنج ہائے گراں مایہ، ۱۴۷ ۴ے گنج ہائے گراں مایہ، ۱۲۲

۵ے

مُرتکب بھی اکثر وہ خود، ہوتا ہے شعر سُنانے لگے! اِسے آپ میری بدتمیزی پر محمول کریں یا شاعر کی یا دونوں کی، کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

بات یہ ہے کہ بعض صوری یا معنوی اعتبار سے (صوری نہ زیادہ معنوی برائے نام) شعر سُننے اور داد دینے کے لیے بالعموم میرا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ پورا مصرع درکنار اس کا جز تک اُٹھانے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں الفاظ یا اعراب وغیرہ کا اُلٹ پھیر نہ ہو جائے۔ جب تک شاعر دوسرا مصرع پڑھتا ہے اور اکثر بار بار اور دیر تک پڑھتا رہتا ہے، پہلا بھول چکا ہوتا ہوں۔ اِس لیے پورے شعر کی داد دینے کے لیے طرح طرح کے سامعین کا مُنہ تکنا پڑتا ہے اور جلد سے جلد فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اُن میں کون حلوے مانڈے کی غرض سے آیا ہے، کون میزبان کو ایصالِ ثواب کرنا چاہتا ہے، کون شاعر کو ضربِ شدید یا خفیف پہنچانے کا تہیہ کر رہا ہے اور کون مجھ کو محفل سے باہر نکلنے کا چیلنج دے رہا ہے اس کے بعد کہیں میرا مُنہ اِس قابل ہوتا ہے کہ شاعر کو دکھا سکوں۔ دوسری اور سب سے بڑی آزمائش میرے لیے یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی میں شعر سے مُتاثر ایک طرح ہوتا ہوں لیکن داد دوسری طرح دینی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ اس کش مکش میں کہیں مُقدّم مُوخر نہ ہو جائے! چنانچہ جہاں کہیں اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ شاعر اور اس کے کلام دونوں کی کرامات پر سب سے پہلے مجھے ایمان لانا پڑے گا اور اعلان بھی کرنا پڑے گا۔ میں داد دینے والا ساتھ لے جاتا ہوں جس کی مجھے خاصی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ داد دینے والے سے طے یہ رہتا ہے کہ وہ اس طرح داد دے کہ اگر میں دینے لگوں تو کوئی سُن نہ پائے یا دینے والا ہوں تو ہمت نہ پڑے!

شاعری اور شاعر دونوں کی بڑائی اس میں ہے کہ کسی جذبے، فکر یا خیال کو مُرتفع کیے بغیر نہ پیش کیا جائے۔ بعض شاعر ہر طرح کے جذبات و خیالات کو جوں

لے ہم نفسانِ رفتہ، ۲۳۰

کا توں پیش کر دینا شاعری کا تقاضہ، سمجھتے ہیں۔ یہ اُن کی بھول یا بدنیتی ہے۔
انسان کی ترقی کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے جذبات یا میلانات کو اپنے اقوال و افعال میں منتقل کرنے سے پہلے کہاں تک جانچا اور پرکھا اور ان کی تراش وخراش اور تہذیب و ترتیب میں کہاں تک کوشش کی اور کامیاب ہوا۔

اسی طور پر دل میں مختلف قسم کے خیالات آتے ہیں لیکن ان کے ظاہر کرنے کا جواز صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ذہن و دماغ میں پیدا ہوئے بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کب، کس طور پر اور کتنی کمی بیشی کے ساتھ ظاہر کیے جائیں کہ حق ترجمانی بھی ادا ہو جائے اور بد مذاقی کا الزام بھی عائد نہ ہو۔

آج کل کے لکھنے والے خیالات کے پیدا ہونے، سوچنے اور ان کے اظہار میں کوئی وقفہ دینا پسند نہیں کرتے اور یہی اُن کی اور اُردو ادب کی محرومی ہے۔ خیالات کی آفرینش اور اُن کے قلم بند کیے جانے کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جس میں خود نفسِ خیال کے ترک و قبول اور اس کے طریقۂ اظہار پر غور کیا جاتا ہے یہی وہ ساعت ہوتی ہے جس کو نظر انداز کرنے یا نہ کرنے سے لکھنے والا ہمیشہ کے لیے بدنام یا نیک نام ہو جاتا ہے۔ رہ نوردانِ ادب کے لیے یہی منزل عالم برزخ ہے جس سے مفر نہیں۔

ہمارے[1] بعض شعرا اور افسانہ نگار ایسے ہیں جن کی فنی چابک دستی میں شبہ نہیں لیکن وہ اپنے جذبات و واردات کو ظاہر کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور اس کو اپنی خامی نہیں شاعری کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ شہوت[2]، غصہ، نفرت، خود نمائی کے جذبات بڑے منہ زور ہوتے ہیں اور کم و بیش ہر انسان میں ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ حیوان اور انسان میں فرق بھی ہے کہ حیوان ان پر قابو نہیں رکھ سکتا لیکن انسان ان کو بس ہی میں نہیں رکھتا بلکہ ان کو بہتر مقاصد اور بہتر شکل میں ڈھال لیتا ہے۔ وہ محسوس تو حیوان ہی کی

---

[1] مقدمہ دیوان غالب، باب اول، ۲۴
[2] ہم نفسان رفتہ، ۲۳۱

طرح کرتا ہے لیکن اظہار انسان کی مانند کرتا ہے۔ جو محسوس کرے اُسی کو ظاہر کرے قرینِ فطرت یقیناً ہے، قرینِ انسانیت نہیں ہے۔ اپنی خامی کو شاعری کا تقاضا سمجھنا نالائقی کی علامت ہے۔ انسان کا انا الحق کہنا ایسا غلط نہیں ہے۔ تلاشِ معرفت میں بعض فقرا یا صوفیا پر یہ واردات طاری ہوئے ہیں لیکن ان واردات اور اُن کے اظہار کو دلیلِ کم نظری و کم ظرفی قرار دے کر کہنے والے کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سو الہام کے جو خُدا کی طرف سے صرف اُس کے رسول پر نازل ہوتا ہے اور رسول اس کو بجنسہٖ اُمّت کو پہنچا دیتا ہے، کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو شاعر کے دل میں آتا ہے اور وہ اس میں حسبِ ضرورت تصرّف کیے بغیر ہم تک پہنچا دیتا ہو۔ یہ تمام تر شاعر کے ذوق اور ظرف پر مُنحصر ہے کہ وہ اس خیال کو کس مقصد سے، کس شکل میں ہم تک پہنچاتا ہے۔ اگر وہ سرشت کا اچھا، فن سے واقف، زبان کا رمز شناس ہے، کہنے کا سلیقہ رکھتا ہے اور صحیح موقع و محل کو پہچانتا ہے تو اس کی بات مُؤثر، مفید اور دیرپا ہوگی۔ اگر اس میں یہ صفات نہیں ہیں تو یہ شاعری نہیں کچھ اور ہوگی، جس کو آپ شاعر کی نارسائی یا نالائقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شاعر ڈاک خانہ، تار گھر، ریڈیو نہیں ہوتا جو صرف خبر رسانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ فن کار اور معلّم کی حیثیت سے حسن و صداقت کا داعی ہوتا ہے۔

میں[1] نے بعض مُستند اور عمر رسیدہ شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی بُرائی بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ میں شاعر اپنا کلام سُنا رہا ہے اور یہ بیٹھے اس پر بازاری فقرے چست کر رہے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی اس خفیفت الحرکتی کی داد لیتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہو تو ہو شاعر میں ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ اِس طرح کی حرکت شاعری نہیں

---

[1] نقوش، شخصیات نمبر (حصّہ اوّل) ۳۲۰

کرتے وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں اور جنہوں نے عمر کا بیشتر حصّہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ ان کے ہوتے دوسرا کیوں! بعض شعراء، بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی یا فقرے بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی یہ فقرے اور پھبتی کبھی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے۔ لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرہ میں سامعین کو حاصل ہے خود شعراء کو نہیں!

معتبر[۱] شاعر وہ ہے جو تمام علوم "سینہ و سفینہ" کے اسرار و رموز سے کما حقہ، واقف ہو یا نہ ہو، اس سے آشنا ہو کہ فلاں خیال، جذبہ یا فکر پر کس علم کا عمل مناسب حال ہوگا مثلاً کسی خاص خیال کو فنونِ لطیفہ، فلسفہ، تصوّف، اخلاقیات، مذہبیات، کیمیا طبیعیات وغیرہ میں سے کسی علم و فن یا علوم و فنون کے رمز و رعایت کی رو سے سلجھا کر توانائی دے کر اور سنوار کر سامعین تک پہنچایا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مفید و مؤثر ہو۔ یہاں اس سے یہ مُراد نہیں ہے کہ ہر شاعر، ہر علم و فن سے واقف ہو (سب سے زیادہ تو اُسے اپنے فرض اور فن سے واقف ہونا چاہیے)۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ جو علوم انسان کو فطرت کا راز سمجھنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے میں اَپنے اَپنے طور پر مدد پہنچاتے ہوں، شاعر کو اُن کا علم ہونا چاہیے۔ اس کو شاعر کے اُن علوم پر قدرت رکھنے سے تعبیر نہیں کریں گے، نہ اس کا مطالبہ کریں گے بلکہ اسے ان علوم پر اُس کا شاعرانہ تصرف قرار دیں گے۔

غزل[۲] جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ غزل کو میں اُردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں ...... غزل کی اہمیت کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ کبھی اس میں عشق و شباب

---

[۱] ہم نفسان رفتہ، ۲۳۳ [۲] جدید غزل، نگار (کراچی) سالنامہ ۱۹۶۵، ۱۰۲

کی باتیں کی جاتی تھیں یا اس کے وسیلے سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے۔ اس کا احترام اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے ۔۔۔ شاعری دُنیا کی مادری زبان ہے، اس لیے شاعری میں مخصوص ذہن، زندگی اور زمانہ کی ترجمانی اور تلاش ضروری بات ہو تو ہو آخری بات نہیں ہے۔ البتہ ایسی شاعری میں اعلیٰ انسانی اور فنی قدروں کا پایا جانا ضروری ہے اور میرے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی اور کائنات کے بامُراد اور اور برگزیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہوں۔ اَدنیٰ، اچھی یا اعلیٰ شاعری کا دارومدار اس پر ہے کہ شاعر کس سطح سے شاعری کا حق ادا کر رہا ہے۔ زندگی کی آنی و فانی لذت والم سے رشتہ جوڑتا ہے یا زندگی اور فن کی اعلیٰ قدروں کو جانتا اور کائنات کی عظمت کو پہچانتا ہے۔ شاعری فنونِ لطیفہ میں ہے لیکن مَیں صرف اُن فنونِ لطیفہ پر ایمان رکھتا ہوں جو فنونِ عظیمہ کا درجہ رکھتے ہوں۔

شاعر[1] بڑا ہے، اچھا ہے، معمولی ہے، گھٹیا ہے، اِن سب کا دارومدار اس پر ہے کہ اس نے اپنے تحت شعور کا اظہار کس طور پر کس سطح سے اور کس نیت سے کیا۔ شاعری خوب کو خوب تر بناتے رہنے کا مشن یا منصب ہے اور کوئی شاعر اِس منصب کا اہل نہیں اگر وہ عظیم سے واقف ہو اور حقیر پر اکتفا کرلے!

شاعری[2] میں حُسنِ محض کا مَیں قائل نہیں۔ مَیں سرے سے محض کا قائل نہیں ہوں۔ مَیں حُسنِ خیال اور حُسنِ عمل کو بھی ایک دوسرے سے علاوہ دیکھنے سے معذور ہوں۔ معقول شاعر، نامعقول شخص۔ یا نامعقول شخص معقول شاعر کیسے ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی ہوتا ہو لیکن نہ وہ میرے ذہن میں آتا ہے، نہ میرے دسترخوان پر آنے پائے گا۔

حُسنِ خیال اور حُسنِ اظہار کی کارفرمائی شاعری ہی میں نہیں ہوتی ہر ذہنی مشغلے میں ملتی ہے مَیں ریاضی، فلسفہ، سائنس وغیرہ کا طالب علم کبھی نہیں رہا لیکن کبھی کبھی

---

[1] جدید غزل، نگار (کراچی) سالنامہ ۱۹۶۵ء، ۱۰۶ [2] جدید غزل، نگار (کراچی) سالنامہ ۱۹۶۵ء، ۱۰۸

تقریباً ان کے بعض مستند مصنفین کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔ جہاں کہیں بات سمجھ میں آگئی ہے تو ان کے بات کہنے اور پیش کرنے کے انداز میں اتنا ہی لطف آیا ہے اور بصیرت نصیب ہوئی جتنا غالب اور اقبال کی نظموں میں ــــ

"میں کچھ اس کا قائل ہوں کہ شاعر ادیب، یا آرٹسٹ نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں، نہ زندگی کے، نہ نقاد کے! زمانہ، زندگی اور نقاد تینوں، شاعر ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں۔ زمانہ ان کا پابند ہوتا ہے وہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے۔ اگر شاعر اپنے ماحول کا پابند یا نقاد کی حکم برداری پر مجبور ہو تو شاعری، ادب اور زندگی سے تازہ کاری جو عینِ زندگی ہے جاتی رہے ــ ـ ـ ـ میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں لیکن تجربات میں شاعری کا نہیں ــ میں تجربے کو تجربہ ہی سمجھتا ہوں، الہام نہیں سمجھتا۔ فن اور زندگی دونوں میں جان تجربہ ہی سے آتی ہے۔ جو تجربے سے بھاگے یا تجربہ میں مقید ہو گئے اُن کا مستقبل کوئی نہیں۔ مستقبل کا بذاتِ خود میں کچھ زیادہ شیدائی نہیں ہوں میں تو ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی کا قائل ہوں۔ میں حال کو ماضی اور مستقبل دونوں سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ ماضی کا اسیر اور مستقبل کا منتظر، میں نے ایسوں کو پایا جن کا ماضی اور مستقبل، دونوں مشکوک ہوتا ہے۔"[۲]

"بڑی شاعری میں منجملہ اور باتوں کے دو نہایت ضروری ہیں۔ ایک تو اس کا رشتہ کسی اعلیٰ اور عظیم حقیقت سے اور دوسرے اس کا ربط کسی اعلیٰ اور عظیم شخص اور شخصیت سے۔ علم تلاشِ حقیقت ہے، شاعری جستجوئے انسانیت، بڑی سے بڑی کوئی حقیقت ایسی نہیں ہے جو انسان کے لیے نہ ہو ــ ـ ـ ـ ذاتی طور پر میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ بڑی شاعری میں بڑے انسان کا ہونا لازمی ہے اور بڑا انسان سب سے بڑے انسان کی نشاندہی کرتا ہے۔"[۳]

"میں شاعر کی اہمیت کا اندازہ اس سے کرتا ہوں کہ اس کا خدا، انسان اور

لہ جدید غزل، نگار، کراچی، سالنامہ ۶۵ء، ۱۳ ؎ ۲ہ نگار، سالنامہ ۱۹۶۵ء، ۲۰

۳ہ نقدِ غالب، ۱۳۱

عورت کا کیا تصوّر رہا ہے۔ ہماری زندگی اور ہماری شاعری میں ان تینوں کا بڑا دخل ہے۔ پُرانی چال کے شعرا ہوں یا نئی چال کے، چکر بالعموم عورت ہی کے گرد لگائیں گے۔ یہ اختیار آپ کو حاصل ہے چاہے ان کی شاعری کو عیاری اور عیاشی کہیں یا عبادت و انقلاب۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن اس کے غلط ہونے کا امکان ذرا کم ہی ہے کہ جس شاعر کا جیسا تصور عورت کا ہوگا کم و بیش ویسا ہی تصوّر اُس کا خدا اور انسان کا ہوگا۔ میں نے آج تک کسی بڑی شاعری یا بڑے شاعر کے ہاں یہ نہ دیکھا کہ اُس کا عورت کا تصوّر معمولی یا اَدنیٰ درجہ کا ہو۔ انسان کی عظمت کا قائل خدا کی عظمت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا![1]

دنیا[2] کتنی ہی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو، انسان کا ذہن ہمیشہ اس سے آگے ہوتا ہے۔ انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ وہ ان کارناموں میں نہ پناہ لیتا ہے نہ ان کو پناہ دینے کی خوامخواہ کوشش کرتا ہے۔ اچھے اور بڑے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں......... فن ہو یا زندگی منتخب افراد ہی کے ذہن کے مرکب پر سوار ہو کر آگے بڑھتی ہے۔ ان کے لیے اب تک کوئی مرکب دریافت نہیں ہوا۔ قدیم ہو یا جدید اُپنے اظہار و اقتدار کے لیے فرد کا محتاج ہے کسی اور کا نہیں۔ فرد کی اہمیت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے ظلم بھی!

میں[3] فن سے فن کار کو کہیں زیادہ اہم اور عظیم سمجھتا ہوں۔ فن کی کوئی حقیقت نہیں اگر اس کا پیدا کرنے والا یا اس کا پروان چڑھانے والا موجود نہ ہو۔ فن ریاضی کا مسئلہ نہیں ہے شخصیت کا مسئلہ ہے۔ فن ہو، مذہب ہو یا اس قبیل کی کوئی اور حیثیت یا حقیقت شخص کے بغیر ان کا فروغ پانا ناممکن ہے......... فن کی اہمیت کا اندازہ اس کے مقصد سے کیا جاتا ہے ماہیت سے نہیں اور شخص کا امتیاز اُس کی استعداد سے ہے اس کے انجام سے نہیں!

ل نگار، سالنامہ ۱۹۶۵ء، ۱۱۵   ۲ نقدِ غالب، ۳۲۸

شاعری ہو یا دوسرے فنونِ لطیفہ یا کوئی اور بڑا ذہنی کارنامہ، یہ سب سوسائٹی کے منفرد اشخاص کے سہارے نشو ونما پاتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ خواہ یہ منفرد اشخاص اونچے طبقے میں پیدا ہوئے ہوں خواہ نچلے طبقے میں۔ میں اسے بھی مانتا ہوں کہ اونچے طبقے میں منتخب افراد کے پیدا ہونے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اقدار اور روایات زندگی میں اس طور پر پیدا یا نمودار نہیں ہوتیں جس طرح فطرت میں حیوانات اور نباتات پیدا ہوتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں۔ اقدار اور روایات سوسائٹی کے بہترین افراد کے فکر وعمل کے کسر و انکسار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔[1]

سوسائٹی کے بارے میں میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ وہ بجائے خود ایک لایعقل لیکن سودمند ادارہ ہے اور صلح پسند اور سادہ مزاج لوگوں کی جائے پناہ۔ سوسائٹی منتخب افراد کو جنم دے کر بانجھ ہوجاتی ہے اور اس کا کوئی مصرف باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ منتخب افراد نئی سوسائٹی کو جنم دیتے ہیں۔ اس سوسائٹی کو بھی بالآخر وہی دن دیکھنے پڑتے ہیں۔ ایک ہی سوسائٹی دربارہ منتخب افراد کو جنم نہیں دے سکتی۔

شاعری[2] میں غم کے عنصر کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بذاتِ خود میں غم کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ زندگی، ادب، آرٹ غرض ہر عظیم انسانی سرگرمی کو روشنی، رہبری اور رفعت اُمید سے ملتی ہے، اَلم سے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی کو مرض اور مایوسی سے تعبیر کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ میں خود زندگی کو یکسر عیش و فراغت نہیں قرار دیتا لیکن زندگی فی نفسہٖ مرض اور مایوسی کی نفی کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ابتدائے تہذیب سے آج تک طرح طرح کی مزاحمتوں کے باوجود اچھے اور اولوالعزم انسان، زندگی کو بامعنی و بابرکت بنانے اور رکھنے میں کوشاں اور کامیاب رہے ہیں اور یہ انھیں کا فیضان ہے کہ زندگی اور زمانہ انسان

ا؎ جدید غزل، نگار (کراچی)، سالنامہ ۱۹۶۵ء، ۱۲۳

۲؎ جدید غزل، نگار (کراچی)، سالنامہ ۱۹۶۵ء، ۱۱۷

کی تعمیری و تخلیقی سرگرمیوں سے مالا مال رہا ہے۔ میں زندگی اور فن دونوں کا جواز اُمید میں پاتا ہوں۔ الم میں نہیں!

شاعری قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ شاعری زندگی کو آئینہ وغیرہ بھی نہیں دکھاتی۔ اس طرح کی حرکتیں دوسرے یا تیسرے درجے کے شعرا اور ادیب کرتے ہوں گے۔ شاعری زندگی آزمائی ہے۔ وہ زندگی جو انعام بھی ہے، آزمائش بھی۔ شاعری زندگی سے کچھ کم بڑا مسئلہ نہیں ہے زندگی کو آپ چاہیں تو امریکی یا روسی خانوں میں بانٹ لیں، شاعری خانوں میں نہیں بانٹی جاسکتی اس لیے کہ شاعری دُنیا کی مادری زبان ہے!

(اصل) بات[1] رہی جاتی ہے جو آغاز میں ظاہر کر دی گئی تھی اور اب نئے سرے سے شروع کی جاتی ہے یعنی حماقت، شاعری (شادی، استادی شاگردی ــــ) لیکن دقّت یہ ہے کہ ابتدا کس سے کی جائے.... (چلیے) حماقت ہی سے اس کی ابتدا سہی ــ فہو المراد ــ وہو ہذا۔

حماقت نہ کسبی ہے اور نہ وہبی لیکن یہ صرف مُتعدی ہے جو کسی نا اہل کی خوش نصیبی کی طرف اُڑ کر لگتی ہے۔ دُنیا میں کوئی شخص مستقل احمق نہیں ہے .... حماقت یا بعض امراض کے صرف دَورے ہوا کرتے ہیں جن کی کم و بیش مقررہ میعادیں ہوتی ہیں۔ جیسے ٹائیفائڈ یا کونسل اور اسمبلی کی میعادیں۔ اس دوران وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ شادی کر لیتا ہے، قرض ادا کر دیتا ہے (اور گاہ شاعری شروع کر دیتا ہے!)

ایک[2] صاحب نے بڑی دُعاؤں اور التجاؤں کے بعد ایک رفیقۂ حیات پائی۔ عہدِ زفاف منانے کے لیے کسی مقام پر پہنچے۔ عروسہ کو وہ جگہ پسند نہ آئی۔ ارشاد ہوا تم کیسے احمق ہو جو ایسی جگہ لائے۔ غریب نے دبی زبان سے کہا۔ جانِ من

---

[1] جدید غزل، نگار (کراچی) سالنامہ ۶۶۵، ۱۲۶ [2] مضامینِ رشید، ۳۰۰

[3] مضامینِ رشید، ۲۹۹

جگہ کا انتخاب تو تم ہی نے کیا تھا ۔ خطاب ہوا ! لیکن تم نے اختلاف کیوں نہیں کیا ! کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کی نصف مصیبتیں محض اس لیے ہیں کہ بابا آدم اپنی سالم پسلیوں کے ساتھ سپردِ خاک نہیں ہوئے !

تجسس[۱] عورت کی فطرت اور پاسبانی اس کی عادت ہے ۔ اُس[۲] کو اس کا فکر نہیں کہ مرد روپیہ کس طور پر کماتا ہے ۔ وہ دیکھتی ہے کہ خرچ کیوں کرکرتا ہے ۔ یہ بات بجائے خود قابلِ سوز خوانی نہیں ۔ رقت تو اس پر آتی ہے کہ اُس کا خرچ کرنے کا تصور وہی ہے جو برطانوی اقتدار میں ، آئی ۔ سی ۔ ایس کا ہوتا تھا ۔ یعنی ہر وہ فعل جو آئی ۔ سی ۔ ایس کرتا ، برطانوی اقتدار میں گویا معین ہوتا اور ہر وہ فعل جو کسی ہندوستانی تعلیم یافتہ سے سرزد ہوتا ، برطانوی اقتدار کے مُنافی ٹھہرتا !

وہ مرد کے مخلص ترین دوست کو اپنے سب سے نکمے رشتہ دار سے بدتر سمجھتی ہے اور اپنے ہر فعل کے جواز میں کسی نہ کسی طور پر اس حقیقت کو جتا دیا کرے گی کہ تم سے شادی کرنے میں اُس نے اپنی زندگی سب سے بڑی قربانی کی ہے اور اس کے ثبوت میں یہ دعویٰ پیش کرے گی کہ فلاں بیوی کے پاس مرغی طوطے ، بندر اور بھالو پلے ہوئے ہیں اور تمہارے یہاں یہ چیزیں نہیں ہیں ....

متجسس اور پاسبان کبھی قانع نہیں ہو سکتا ۔ یہی حالت عورت کی ہے اس کی ساری زندگی مسلسل تفتیش اور تذبذب ہے ۔ وہ[۳] اپنی خوبی یا خوش وقتی سے مسرور اور مطمئن نہ ہوگی بلکہ دوسروں کی ، بشرطیکہ وہ اس کے رشتہ دار نہیں ہیں ، کمزوری یا بدحالی سے مطمئن رہے گی ۔ گھر میں اُسے کوتوالی حیثیت حاصل ہے ، ایسا کوتوال جس سے بدمعاش آسودہ اور نیک معاش فکرمند رہتے ہوں ۔ شوہر کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کا نام درجِ رجسٹر نمبر دس ہوتا ہے !

عورت[۴] سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے ۔

---

۱ مضامینِ رشید ، ۱۰۰ ۲ مضامینِ رشید ، ۱۰۱
۳ مضامینِ رشید ، ۱۰۲ ۴ مضامینِ رشید ، ۱۰۳

اسی محبت کی آڑ یا زد میں سب کچھ ہوا۔ جیل خانہ، ہسپتال فنونِ لطیفہ مضمون نویسی شاعری، اُکاسا، وصیت نامے اور پاگل خانہ قسم کی تمام چیزیں اسی کی منت کش ہیں! اگر دُنیا[۱] کے انقلابات کی کبھی "اندرونِ خانہ" تاریخ لکھی جا سکی تو عشق مجازی کے کرتوت اور کارناموں کے عجیب و غریب کرشمے ملیں گے!

شاعری[۲] میں اُستادی شاگردی اور مذہب و اخلاق میں مُرشد مُرید یا گرو چیلے کا رشتہ کہیں اور نہیں تو ایشیائی ممالک میں اتنا قوی اور محترم مانا گیا ہے کہ اس کو کبھی کبھی خون کے رشتے سے زیادہ وقعت دی گئی ہے۔ اس طرح کے رشتے یا ادارے زمانۂ جہالت کی یادگار ہوں یا دورِ اجتہاد و انقلاب کی، اس سے بحث نہیں عرض صرف یہ کرنا ہے کہ ذوقِ شعر و ادب کی سیرابی اور صحت مندی کے لیے شاگردی، اُستادی اور اعمال و افکار کے سنوارنے سدھارنے کے لیے مُرشد مُرید گرو چیلے کا جو رشتہ یا ادارہ مشرق میں مُدّت الایام سے چلا آرہا ہے وہ اپنے گوناگوں فوائد کے اعتبار سے بہت اہم اور قابلِ قدر مانا گیا ہے اور ہندوستانی تمدّن میں اس رشتے اور رابطے کا ایک خاص مقام ہے۔ آج کل نوجوانوں میں جو عام ذہنی انتشار ملتا ہے اُس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ممکن ہے ایک، یہ بھی ہو کہ اُستاد شاگرد یا مُرشد مُرید کا "شخصی" رشتہ جو مدتوں سے "مجرّب" چلا آتا تھا، اس کی طرف سے ہم نے اپنی توجہ ہٹا لی ہے۔

شاعروں[۳] کی نسل اکثر منقطع ہوتی رہی اور نئی نسل وجود میں آتی رہی لیکن اُستادوں کی نسل کبھی نہ منقطع ہوئی۔ ازل سے اب تک جوں کی توں چلی آرہی ہے۔ اُردو شاعری اس کی گواہی دے سکتی ہے۔ شاید کسی اور زبان کا شعر و ادب اس طرح کی گواہی دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اُردو شاعری کی تقدیر کا ان اُستادوں سے کیا رشتہ رہا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے — ان کو:

اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست!

---

[۱] نگار، لکھنؤ (حسرت نمبر)، ۲۲،۶۱۹۵۲ ، ۲ [۲] آشفتہ بیانی میری ۱۳۸

[۳] جدید غزل، نگار (کراچی) سالنامہ ۶۱۹۶۵، ۱۲۸

۱۶

"میں کسی آدمی کی سیرت و شخصیت کا
اندازہ اس سے بھی لگاتا ہوں کہ وُہ میزبان
یا مہمان کی ذمّہ داریوں سے کس طرح عہدہ
برآ ہوتا ہے ____"

○

کالج کے عہد میں ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الغرض کا شمار طلبا کے بڑے قابل قدر اداروں میں ہوتا تھا۔ اب بھی کچھ کم نہیں ہے ۔۔۔۔ اس کے دو مقاصد بہت اہم تھے ایک نادار لیکن ہونہار طلبا کے لیے مالی امداد فراہم کرنا۔ دوسرے کالج کے بارے میں قوم اور ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہو اس کو دور کرنا۔ اسؔ انجمن نے نہ صرف طلبا میں درس گاہ کی اُلفت اور اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کیا بلکہ علی گڑھ کو تاریخی اہمیت دینے میں جو خدمات انجام دی ہیں اُن کو مقررّہ خانوں میں درج کر کے تو نہیں پیش کیا جا سکتا لیکن ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں روپے کی فراہمی پر اتنا زور دینا مقصود نہیں ہے جتنا اس پر کہ سوسائٹی کی خدمت کے طفیل طلبا کے کردار میں کتنی شائستگی اور مکمل آتی تھی۔ غیر متوقع مقامات پر غیر معمولی حالات میں پُرانے طلبا سے ملتے تھے تو کالج کی روایات اور کالج میں اپنی زندگی کو یاد کر کے ایک دوسرے سے کس درجہ مسرور اور متاثر ہوتے تھے۔ اب بھی یہاں کے جو طلبا تعلیم سے فارغ ہو کر زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں مصروف و منہمک ہیں، جب کبھی اور جہاں کہیں ملیں گے علی گڑھ کا زمانہ یاد کر کے اور یاد دلا کر تھوڑی دیر کے لیے بالضرور خوش وقت اور دل شاد ہولیں گے۔

لہ آشفتہ بیانی میری ، ۱۵۶   لمہ آشفتہ بیانی میری ، ۱۵۷

"ڈیوٹی سوسائٹی"[1] سے دیرینہ تعلق کے لوازم میں ایک بات یہ بھی رہی ہے کہ مجھے طرح طرح کے مراقع اور مباحث پر کثرت سے خطوط اور مضامین لکھنے پڑے ہیں۔ یہ کاروباری انداز کی خط و کتابت نہ ہوتی بلکہ ایسے اصحاب سے ہوتی جن سے سوسائٹی یا کسی دوسرے کارِخیر کے لیے عطیات کی درخواست کی جاتی یا وہ حضرات ہوتے جو سوسائٹی کے مقروض ہوتے لیکن اس بار سے سبکدوش ہونے پر مائل نہ ہوتے اس سلسلے میں مؤخر الذکر جیسے عجیب و غریب خطوط لکھتے تھے ان سے کیسی کیسی نفسیاتی گتھیوں کا انکشاف ہوتا تھا۔ ان دوستوں اور عزیزوں کو ایسے خطوط لکھنا کہ وہ نہ رنجیدہ ہوں نہ مشتعل، اور اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں جو سوسائٹی کی طرف سے اُن پر عائد ہوتا تھا، اچھا خاصا مشکل لیکن دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایسے خطوط لکھنے میں جس تحمل و توازن، خیر اندیشی، خوش مذاقی اور کبھی کبھی گلہ مندی یا آزردگی کا اظہار کرنا پڑتا وہ میرے طور طریقوں نیز میرے سلیقۂ تحریر کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ کالج کے عہد سے آج تک طرح طرح کے مباحث پر جتنے مضامین خطبے پمفلٹ اپنے یا دوسروں کے لیے، لکھنے پڑے، میرا خیال ہے طالب علمی کے عہد میں علی گڑھ میں شاید ہی کسی اور کو لکھنے پڑے ہوں۔

مجھے[2] اُن لوگوں پر ترس آتا ہے جو علی گڑھ میں طالب علمانہ زندگی بسر نہیں کر سکے ہیں، علی گڑھ کے "واقف کار" اور "ہمدرد" بن کر اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے آپ علی گڑھ کی مسرتوں سے کیا واقف۔ آپ کو کیا معلوم اس نام میں کیسی جاذبیت ہے اور یہ نام کیسا محبوب ہے! بعض کہیں گے، دیکھتے نہیں آج خود علی گڑھ والے علی گڑھ کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ آپ کی کم فہمی اور سطحیت ہے جو ایسا کہتے ہیں۔ کوئی علی گڑھ والا علی گڑھ کو بُرا نہیں کہتا۔ کیوں کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ وہ علی گڑھ والوں کو بُرا کہتا ہوگا اس کے اور اسباب ہیں جن پر یہاں اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں ہے۔ مادرِ کالج سے کون منحرف ہو سکتا ہے کسی علی گڑھ

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۵۹ [2] مضامینِ رشید، ۵۱

والے کے سامنے علی گڑھ کا نام لیجیے پھر دیکھیے وہ چشم زدن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مصائب اور مناصب سب بھول جائے گا اور تھوڑی دیر کے لیے اس کا تصوّر اس کو زمان و مکان سے آزاد کر کے اُسے مادرِ کالج کے آغوش میں پہنچا دے گا۔ وہی کمرے، وہی ڈائننگ ہال، وہی مسجد، وہی یونین وہی یہ گجی پارک، وہی کرکٹ فیلڈ، وہی شرارتیں وہی صحبتیں، وہی بے فکری، سب کچھ وہی جس سے اب وہ دور ہے ع

آنکھیں اُس کو ڈھونڈتی ہیں دل اس کا گرویدہ ہے!

مجھے[1] آج کم و بیش ۵۰ - ۱۹۴۰ سال علی گڑھ میں رہتے بستے گزرے ہیں۔ اس دوران میں جتنے لوگ طالب علمی کے مراحل سے گزرے ہیں اُن میں سے سب کو نہیں تو بیشتر کو جانتا ہوں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہاں کا ہر طالب علم اپنے عہد کے تقریباً ہر طالب علم سے کم و بیش واقف ہوتا ہے۔ (کہہ یہ رہا تھا کہ) گزشتہ (۵۰[2]) سال میں جو لوگ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر پبلک لائف میں داخل ہوئے اور چمکے، ان میں غالباً کوئی ایسا نہیں جس کو میں نہ جانتا بوجھتا ہوں۔ علی گڑھ میں رہتے بستے ایک عمر ہوئی۔ یہاں کی زندگی کا کون سا پہلو ہے جو نظر سے نہ گزرا ہو اور کونسی نعمتیں ہیں جو یہاں میسّر نہ آئی ہوں! میں نے آج تک[3] یہ نہ دیکھا کہ یہاں کے جن لوگوں کی طالب علمی کی زندگی جیسی رہی ہے اُس سے مختلف ان کی پبلک لائف ہو۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہر حال میں ہر جگہ ملیں گے ان کا کردار بجنسہ وہی ہوگا جو یہاں تھا خواہ وہ بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہوں خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے پر۔ یہ بات علی گڑھ کے سوا کہیں اور بمشکل ملے گی۔

علی گڑھ کی خصوصیت یہاں کی اقامتی زندگی ہے۔ یونیورسٹی کے حدود سے باہر طلبا کے لیے تفریح کی کوئی جگہ نہیں۔ کوئی دریا نہیں پہاڑ نہیں، باغات نہیں،

---

[1] ذاکر صاحب، ۴۴ [2] نگار لکھنؤ، حسرت نمبر ۱۹۵۲ء، ۲۵

[3] ذاکر صاحب، ۴۴

پُر رونق بازار نہیں، تاریخی آثار نہیں۔ سال میں ایک بار نمائش البتہ ہوتی ہے، جب طالب علم کباب پراٹھے کھانے اور کبھی کبھار پولیس والوں کے "سراپا ناز" ہونے یا نہ ہونے کا جشن منا لیتے ہیں!

علی گڑھ[1] میں ہر طرح کے نوجوان طلبا ہر گوشۂ ملک سے آتے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذاق یا میلان کا ہو اپنا رفیق و ہمدم مل جاتا ہے۔ علی گڑھ کی اس خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم رفتار و گفتار و کردار میں بے نقاب ہو کر رہتا ہے خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ کوشش کرے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے ہر طالب علم کا ایک ربطِ نہانی علی گڑھ سے مدت العمر قائم رہتا ہے اور وہ علی گڑھ کی یاد کو اپنی زندگی کی سب سے اچھی یاد سمجھتا ہے!

علی گڑھ[2] کے طلبا اور اساتذہ کو علی گڑھ اسی لیے عزیز ہے کہ اس میں ہر ذوق کی تسکین و تفریح کا سامان مہیا ملتا ہے۔ جو شخص جس قماش کا ہوگا اُس کو اسی قسم کی مکمل سوسائٹی میسّر آجائے گی۔ علی گڑھ کی ہر دل عزیزی کا یہی راز ہے ورنہ مقامی اعتبار سے علی گڑھ میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف یہاں نہ اعلیٰ درجہ کی دکانیں ہیں نہ مناظرِ فطرت، نہ تفریح گاہیں یہاں کا کوئی شخص محض تفریح کی خاطر کبھی شہر نہیں جاتا اور نہ کسی کے لیے یونیورسٹی کی حدود سے باہر دل بستگی کا کوئی سامان ہے۔ ہر شخص کو اپنے ہی مخصوص حلقہ میں دلچسپی کا سارا سامان میسّر آجاتا ہے۔

پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، شوخی شرارت، کھیل کود، رندی و پارسائی غرض یونیورسٹی کی مکمل زندگی میں جن اسباب یا مواقع کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب یہاں ملتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے جب کبھی اور جہاں کہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اُن کو تصنّع یا تکلف کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ اس قسم کے طرزِ عمل پر قادر ہو سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فریقین ایک

---

[1] ذاکر صاحب، ۴۵ [2] گنج ہائے گراں مایہ، ۹۳

دوسرے کی اچھائی بُرائی سے واقف اور علی گڑھ کی روایات سے آشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے کبھی اجنبی کی حیثیت سے نہیں مل سکتے۔

مَیں خود جب علی گڑھ سے باہر گیا اور کسی علی گڑھ والے سے مُلاقات ہوئی تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا گویا خود کالج میں ہوں اور اب مجھے اجنبی اور غریبُ الدیار محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ایک علی گڑھ والا دوسرے علی گڑھ والے سے ملتا ہے تو پھر بالعموم اس کو تکلّف رکھ رکھاؤ یا تصنّع کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی یہی نہیں بلکہ ان چیزوں سے نفرت ہو جاتی ہے کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ہم دونوں ایک دوسرے کی پشت ہا پشت سے واقف ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک دوسرے کی کمزوری یا اُس کے خاندانی حالات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ علی گڑھ بجائے خود ایک "قومیت" یا ایک "خاندان" معلوم ہونے لگتا ہے۔ اگر ایک وائسرائے ہے اور دوسرا ایک کلرک لیکن دونوں "پروردۂ علی گڑھ" ہیں تو اس طور پر ملیں گے یا ملنے کا جی چاہے گا گویا دونوں ایک سطح پر ہیں وہی سطح جو علی گڑھ نے قائم کی ہے۔

بات میں بات نکل آتی ہے۔ ایک دفعہ میں سفر کر رہا تھا کالکا پر اُترنے والا تھا۔ انبالہ اسٹیشن پر آنکھ کھُلی تو معلوم ہوا کوئی بزرگ نوٹ اور روپیوں کا بٹوا میرے تکیے کے نیچے سے نکال کر فرار ہو گئے ہیں۔ مجھے جلد سے جلد منزل مقصود پر پہنچنا تھا۔ اَب ایک ایسے اجنبی مقام پر یہ حادثہ پیش آیا کہ تھوڑی دیر کے لیے میں پریشان ہو گیا۔ مَیں کالکا پر اتنی دیر تک ٹھہر بھی نہیں سکتا کہ روپیوں کے لیے علی گڑھ تار دیتا۔ معاً خیال آیا کہ دیکھوں کوئی علی گڑھ والا تو سفر نہیں کر رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر اُتر کر دو چار ہی قدم گیا ہوں گا کہ ایک صاحب میری ہی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ معمولی علیک سلیک کے بعد مَیں نے دریافت کیا آپ علی گڑھ سے آ رہے ہیں فرمایا: ہاں مَیں نے کہا جا کہاں رہے ہیں کہنے لگے شملے بھائی کے پاس۔ مَیں نے پوچھا: مجھے پہچانتے

لہ مضامینِ رشید، ۵۲

ہیں - کہا: جی ہاں - مَیں نے کہا میری نقدی کوئی صاحب لے کر چل دیئے - آپ کے پاس جتنے روپے ہوں مجھے دے دیجئے آپ کو علی گڑھ سے روپیہ پہنچ جائے گا - چنانچہ انہوں نے کافی روپے دے دیئے - مَیں نے علی گڑھ خط لکھ دیا اور روپے اُن کے پاس شملے پہنچ گیے اور ساری تشویش لمحہ بھر میں ختم ہوگئی -

علی گڑھ[1] یونیورسٹی کی حیثیت محض ایک درس گاہ کی نہیں ہے اس کی نوعیت ایک وسیع خاندان کی بھی ہے - ایسا خاندان جو ہر طبقے اور مزاج کے "خورد و کلاں" پر مشتمل ہو -

علی گڑھ[2] کی روایات کی دھوپ چھاؤں میں مختلف دیار، مختلف طبائع اور طبقات کے جتنے طلبا ایک دوسرے کے کمروں میں، بورڈنگ ہاؤسوں میں، بورڈنگ ہال میں، کھیل کے میدانوں میں، یونین میں، مسجد میں، باغ میں، بازار میں، جماعتِ اساتذہ کے اراکین سے، اولڈ بوائیز سے متواتر اور مسلسل ملتے جلتے رہتے ہیں اُتنے شاید ہی کہیں اور نظر آئیں ـــــ اس طور پر ظاہر ہے یہاں کے طلبا میں فراخی، فرزانگی اور فراز بینی کے اوصاف پیدا ہوں گے جو اعلیٰ ظرافت و طنز نگاری کے لیے ضروری ہیں - علی گڑھ نے اچھے طنز نگار بھی پیدا کیے لیکن وہ جلن کے اتنے پیداوار نہ تھے جتنے جلال کے - ان میں اتنی بد دلی یا بیزاری نہ تھی جتنی برہمی - وہ اتنے بدمزاج اور بد باطن نہ تھے جتنے بے باک ـــــ اور بے پناہ طنز کے لیے یہ شرائط ضروری ہیں -

مجھے[3] اوائل طالب علمی میں زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرنا پڑا - فراز کم، نشیب زیادہ - فارسی بہت کم، عربی تھوڑی بہت گھر پہ پڑھ کر میں انگریزی اسکول میں داخل ہوا - سالہا سال اسکول اور چھ[4] سال تک علی گڑھ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا - مَیں نے انٹرنس پاس کرتے ہی کلرکی کر لی تھی - فرسٹ ایر میں

---

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۵۲ [2] آشفتہ بیانی میری، ۱۵۳

[3] سہیل کی سرگزشت، ۱۲ [4] سہیل کی سرگزشت، ۱۴

ڈیوٹی سوسائٹی کے وفد کے ساتھ مشرقی بنگال، چٹاگانگ اور برما کا دورہ کیا
بی۔ اے میں علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر اور ٹینس کا جنرل سیکرٹری اور ایم۔ اے
پاس کرتے ہی ٹینس کا پریذیڈنٹ اور اُردو کا لکچرار ہو گیا۔

بورڈنگ لائف کا ٹھپّہ میری بقیہ زندگی پر نمایاں رہا یعنی سپاہی اور قلندر
کی زندگی — آسودہ حال ہونے کے باوجود جب میں علی گڑھ کی اصطلاح میں
کافی عیّاشی کر سکتا تھا دیوجانس کلبی کی طرح ایک ہی مختصر کمرے میں پورا مکان اور
اپنی ضروریات کا تمام سامان سموئے رکھتا۔ سونے کا کمرہ پڑھنے کا کمرہ، مہمان کمرہ
ملاقات کا کمرہ، کھانے کا کمرہ، لباس کا کمرہ، غسل خانہ، بساط خانہ غرض ہر گفتنی و
ناگفتنی شدنی و ناشدنی امور کا جائے وقوع جغرافیائی اعتبار سے ایک ہی تھا۔
چنانچہ مَیں مہمان کی حیثیت سے کہیں جاتا اور میزبان میری پذیرائی اور طعام و قیام
میں اہتمام کرتا یا تکلّف برتتا تو مجھے بڑی وحشت اور ذہنی تکلیف ہوتی تھی۔ ایک
سبب یہ بھی ہے کہ مَیں کسی کا مہمان شاید ہی ہوتا (ہوں)۔

مہمان[1] بننے سے مَیں یوں بھی گھبراتا ہوں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے
جیسے میں کھاتا پیتا ہنستا بولتا مہمان نہیں ہوں بلکہ اِس دُنیا میں چند دنوں کا مہمان رہ
گیا ہوں اور لوگ خاطر مدارات کر کے اتنا خوش نہیں ہو رہے ہیں جتنا کسی مریض یا
مسافر کی خدمت کر کے ثواب کمانے کی فکر میں ہوں۔ میرے دل میں یہ
بات بیٹھ سی گئی ہے کہ کوئی بھلا مانس مہمان ضرورت سے زیادہ خاطر مدارت کا
متحمل نہیں ہو سکتا۔

مَیں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان
یا مہمان کی ذمّہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دستر خوان
کے آداب ملحوظ رکھتا ہے۔ مَیں اپنے مہمانوں سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی
کیوں نہ ہوں، حتی الوسع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں یا کتنی کھائیں۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۲ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۵۴

کھانا سامنے ہے اور اُنہی کے لیے ہے ۔ بڑے شوق اور اخلاص سے پیش کیا جا رہا ہے ۔ اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے ، شاندار اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ بغیر قول ، قسم یا منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے تو ذمہ داری اُن کی ہے ، میری نہیں ۔ مَیں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں ، اس لیے کہ مَیں اُس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کروں گا اور اپنے طور پر اپنے لیے خوش ہوں گا ، نہ اس لیے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے اور عاقبت سنورتی ہے !

مَیں سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک وملت میں مقتدر کیوں نہ ہوں جو دسترخوان کے آداب سے واقف ہوں اور ان کو برت سکتے ہوں ۔ کھانے پر کھانے سے ، یا کھانے والوں کے ساتھ تبختر بے جا تکلف یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے ۔ جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہیں وہ بڑا نازک مرحلہ ہے ۔ اس نزاکت کو سمجھنا اور بنا ہنا بڑا مشکل کام ہے ۔ بے تکلفی کا تعلق فن سے نہیں تہذیب سے ہے ! کھیل میں کھانے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے ، خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے ۔[1]

علی گڑھ کے طلبا کا یہ امتیاز رہا ہے کہ وہ اہم شخصیتوں سے ملنے ، کھانے پینے ، اُٹھنے بیٹھنے ، ہنسنے بولنے اور ہر طرح کے موقعوں پر مقررہ آداب سے عہدہ برآ ہونے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں ۔ یہ استعداد کچھ تو اُس زمانے کے عام مسلمان گھرانوں کی روایات کی دین تھی لیکن اس کی بہت کچھ تربیت اُن یوروپین پروفیسروں سے ملتی تھی جو دوسرے موقعوں کے علاوہ کھانے کی میز پر یا کھیل کے میدان میں ساتھ ہوتے اور ضروری آداب سے ہم کو آشنا کراتے رہتے ۔ اس طرح ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور جھجکنا ، ہچکچانا ہمیشہ کے لیے دُور ہو جاتا ۔۔۔[2]

آج کل اہم اور اعلیٰ تقاریب میں جہاں دوسرے ممالک کے سربرآوردہ اصحاب خورد و نوش پر مدعو ہوتے ہیں ہمارے بعض اکابر کھانے ، پینے ہنسنے بولنے اور شائستگی

---

[1] آشفتہ بیانی میری ، ۱۵۰ [2] آشفتہ بیانی میری ، ۱۵۱

کے آداب ملحوظ رکھنے میں ایسی غفلت برتتے ہیں یا ان سے اس درجہ ناواقف ہوتے ہیں کہ دوسرے در پردہ ان سے مُتنفّر ہوتے ہیں یا ان پر ہنستے ہیں۔ اس کا زیادہ تر سبب یہ ہے کہ ان اکابر نے یا تو تمیز دار لوگوں ساتھ دسترخوان پر کھانا کھانے کے آداب نہیں سیکھے یا کھیل کی مناسب تربیت نہیں پائی۔

جن لوگوں[1] میں ساتھ کھانے پینے کا دستور نہیں اُن میں کبھی اتحادِ خیال و اتحادِ عمل نہیں پیدا ہو سکتا! مِل[2] جُل کر بیٹھنے کھانے پینے اور بات چیت کرنے کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ علی گڑھ کی جن خصوصیات اور خوبیوں کو مُتّفقہ طور پر سراہا گیا ہے اُن کو بروئے کار لانے میں علی گڑھ کی اِس روایت کو بڑا دخل ہے کہ یہاں ساتھ کھانا کھانے اور دسترخوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے!

عام[3] طور سے دیکھا ہے کہ جس سوسائٹی میں لوگ الگ تھلگ رہتے ہیں یا رکھے جاتے ہیں وہاں کے افراد اپنے آپ پر اعتماد کرتے ہیں نہ دوسروں کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تنگ نظر اور خود پسند بھی ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر اعلیٰ کام کرنے کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں نہ ایسا کرنے کا حوصلہ کر سکتے ہیں!

○

[1] آشفتہ بیانی میری، ۱۵۰ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۵۷

[3] آشفتہ بیانی میری، ۱۵۲

۱۷

"میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے ہیں
مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں ——"

○

علی گڑھ میں آکر میری عادت ہوگئی ہے کہ ہر کام خواہ کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو، اُس وقت کیا جائے جب اس کام کا وقت بالکل ہی گزر جانے پر آگیا ہو۔ کام ہمیشہ وقت پر ہی ہو کر رہا لیکن اس کے لیے جس بے تُکی و بے پناہ جدوجہد کو بروئے کار لانا پڑتا اُس سے عہدہ برآ ہونے کا احساس بھی بڑے مزے کا ہوتا۔ اس سے مجھ میں وہ اعتماد پھر عود کر آتا جس کو میں کسی نہ کسی وجہ سے کھو چکا ہوتا تھا۔ اس سے میں اپنے آپ میں نوجوانوں کا سا حوصلہ اور تب و تاب محسوس کرنے لگتا۔ یہ وہ خود فریبی تھی جس نے مجھے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے مقابلے میں مستعد اور مگن رکھا۔

مجید صاحب اور مجھ میں بالمشافہ یہ طے ہوا کہ ہو سکا تو "کارواں" کے لیے مضمون لکھ دوں گا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ مجید صاحب کو یقین کہ میں مضمون لکھ دوں گا اور مجھے یہ تقویت کہ آخر لکھنا تو اپنے اختیار کی بات ہے۔ چنانچہ مجید صاحب نے یاد دہانی کے لیے تار بھی بھیجے لیکن میں دُنیا کی بے ثباتی پر ہنستا رہا۔

ایک روز دروازے پر ایک موٹر آکر رُکی۔ میں نے ہر قسم کی موٹر دیکھی ہے لیکن یہ موٹر اپنی سج دھج اور شور شغب میں نرالی تھی ...... ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ صاحب (پرنسپل طبّیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نمودار ہوئے ایک نعرہ لگایا...... مجید کا خط

لہ سہیل کی سرگزشت ، ۱۷
لہ مضامینِ رشید ، ۱۷۲

آیا ہے تم نے کاروان کے لیے مضمون لکھا یا نہیں ۔ پہلے تو مَیں نے ذہن میں اِس امر کا جائزہ لیا کہ مکان میں کوئی شخص بیمار تو نہیں ہے جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو کسی قدر دلیر ہو کر بولا : کیسا مضمون ؟ ڈاکٹر صاحب بولے ناک میں دم ہے ۔ تم نے "کاروان" کے لیے مجید سے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہوا تھا ۔ اس کا خط آیا ہے کہ مضمون لے کر بھیج دیا جائے ۔ مَیں نے کہا جناب لکھنے یا نہ لکھنے کا وعدہ تو مَیں نے اُن سے کیا تھا ۔ آپ مجھ پر کیسے مُسلّط ہو گئے ۔ بولے : اَلسّلام علیکم گاڑی پر لرزہ طاری ہوا ۔ محلّہ والوں کے کان کھڑے ہوئے ۔ انجن نے زقند بھری اور سوار و سواری دونوں غائب !

برق تھی، صرصر تھی یا تھا زلزلہ

ٹائیفائیڈ نے ورود فرمایا ۔ گھر میں بچّی بیمار ہوئی ۔ خیال آیا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلیں ۔ ساتھ ہی ساتھ مضمون کا خیال آیا جس کا کوسوں پتہ نہ تھا ۔ معاً جھوٹ بولنے کی تحریک ہوئی ۔ ایک مصرعہ بھی ذہن میں آگیا اور ایسا رواں اور شگفتہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری نظم مرتب ہو گئی ۔

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا ...... عرض کیا بچّی ٹائیفائیڈ میں مُبتلا ہے کہنے لگے حال سناؤ ۔ مَیں نے حال کہنا شروع کیا اور ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا ۔ مَیں نے ابھی بحر بھی مُتعیّن نہیں کی کہ ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کر دی ۔ اتنے میں آمنہ دوڑی آئیں اور فرمایا باجی نے پوچھا ہے آپ نے "کاروان" کے لیے مضمون نہیں لکھا ۔ مَیں نے کہا باجی سے کہہ دیجئے کہ اس پھیر میں نہ پڑیں ۔ ایڈیٹر اور مضمون نگار کے معاملات سے اُن کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ..

..... دکھا لفظی اور لسانی کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دیجیے تو بتائیے مضمون بھی لکھا یا نہیں ۔ اس کے لیے مَیں تیار ہو کر آیا تھا بولا عنقریب ختم ہونے والا ہے لیکن بچّی کی بیماری کو کیا کروں ۔ فرمایا : اچھی ہو جائے گی مضمون تیار کر لو ۔ مَیں نے

لہ مضامین رشید ، ۱۷۵

کہا لیکن مشکل یہ ہے کہ مضمون لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ کا نسخہ لکھ ڈالنا، لگے تو پھر تم نے لکھنے کا وعدہ کیوں "کیا ہوا" تھا۔ مَیں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب وعدہ کر لینا تو بس ایسا ہی ہے جیسے آپ نے کہا السّلام علیکم۔ مَیں نے کہا۔ وعلیکم السّلام۔ ایک اضطراری فعل کا جواب دوسرے اضطراری فعل سے دے دیا گیا۔ اس کے ایفا پر آپ کا اصرار کرنا یقیناً "حقِ آسائش میں خلل اندازی" ہے۔ فرمایا اچھا رخصت السّلام علیکم!

تعطیلوں میں بارش اور چوروں کی یورش ہوئی۔ اُس پر لُطف یہ کہ مکان کے ایک حصّے کی توسیع ہو رہی تھی۔ بارش اور سلسلۂ تعمیر نے "کاشانہ کا کیا یہ رنگ"!

کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

بچّی ٹائیفائڈ میں مُبتلا۔ دن بھر تو ڈاکٹروں اور دواخانوں کی سیر رہتی۔ رات بھر تیمار داری کا سلسلہ جاری رہتا۔ مَیں نے ایک بار تنگ آکر کہا تیمار داری سے تو بہتر ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہونا ہے۔ بیوی نے کہا خاموش ہو جاؤ۔ اللہ کی مصلحت میں چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ میں نے کہا چون وچرا کون کرتا ہے، رات بھر بیمار بچّی کو گود میں لے کر ٹہلانے میں ایسے فقرے نکل ہی جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم مذہب کے معاملات میں بھی مجھ سے مشتبہ ہو جاؤ۔ مصلحت کی قائل تو مجھ سے زیادہ تم ہو نہیں سکتیں۔ دیکھتی نہیں آج کل چوروں کی وجہ سے تمام لوگ کس درجہ پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ ہم تم کس قدر بے فکر ہیں۔ بچّی کی بیماری چوروں سے نجات کا باعث ہو گئی ورنہ مکان ٹوٹا ہوا ہے چور گھس آتے تو ہماری تمہاری بے پردگی تو ہوتی ہی۔ تمہاری کفایت شعاری اور میری زیر باری دونوں مالِ مسروقہ بن جاتیں۔ بیوی نے کہا اچھا چپ ہو رہو۔ رات کے وقت چور ڈاکو کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن آخر برسات میں مکان چھیڑنے کو کس نے کہا تھا۔ میں نے کہا، کہا کس نے تھا مصیبت کہیں کہہ کر آتی ہے۔ ضرورت اور اتفاق کس کے بس کے ہیں۔ تم ہی بتاؤ ہماری تمہاری شادی کو کس نے کہا تھا کہ عین طوفان کی حالت میں ہو اور رخصتی طوفانِ نوح اور کشتیِ

نوحہ میں ہو۔ بیوی نے جھلا کر کہا: کہانی بات کہاں پہنچا دی تم تو مجھے ہمیشہ سے وبالِ جان ہی سمجھتے رہے۔ میں نے کہا: بڑی مشکل ہے میں نے چوروں کا تذکرہ کیا تو تم نے کہا رات کے وقت اس کا ذکر نہ کرو۔ میں نے سوچا نیتِ شب بخیر، شادی کا قصہ چھیڑوں اس پر تم چراغ پا ہوگئیں؛

تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اتنے میں بچّی نے چیخ ماری اور میں پھر ٹہلنے لگا اور موسیقی کی وہ دھن شروع کردی جو موسیقی کی ایجاد سے بہت پہلے مدّون ہو چکی تھی اب بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہوا چلنے لگی۔ شب کی تاریکی و خاموشی میں ایک طرح کا غم آلود سکر پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ دماغ، اعضا اور عضلات میں سرایت کرنا شروع کیا۔۔۔۔۔۔۔

مریض بچّی کو میں نے چارپائی پہ آہستہ سے سُلا دیا۔ خیال آیا کہ بیوی کو جگا کر خود سو رہوں۔ اتنے میں چوکیدار کی چیخ سنائی دی ہمارے محلّے کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے گویا چور دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہو۔ بیوی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بشرے سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا میں نے ہی چیخ ماری ہے۔ فرمایا: دیکھتے نہیں بچّی بیمار ہے۔ میں نے کہا دیکھنے کی کون بات ہے۔ میں تو اس کے علاوہ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ آرام فرما رہی ہیں۔ چوکیدار چیخ رہا ہے بارش ہو رہی ہے اور میں اُلّو کی طرح بیٹھا ہوں۔ فرمایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کس طرح بیٹھے ہیں۔ اچھا اب جاکر سو رہیئے تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ آپ کو ڈاکٹر بٹ صاحب کے پاس جانا چاہیے اور ہاں —— اُس دن آمنہ بی کہتی تھیں کہ آپ نے کوئی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا جسے اب تک پورا نہیں کیا اب میرے تحمّل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے جھلا کر کہا وعدہ تو میں نے کیا تھا آپ کیوں سر پہ سوار ہو گئیں۔ جی میں آیا لکھوں گا، جی میں نہ آیا، نہ لکھوں گا۔ نیک بخت بولیں اچھا شور نہ مچایئے۔ اتنا تو لحاظ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب ہم لوگوں پہ کتنا کرم کرتے ہیں اُن کی ایک ذراسی فرمائش تو پوری نہیں ہوتی۔ سارا گھر سر پہ اُٹھائے

پھرتے ہیں ۔ آپ کا مضمون میری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں ۔ میں نے کہا جس دن میرا مضمون آپ کی سمجھ میں آگیا اُسی دن میں خودکشی کر لوں گا فرمایا ،خودکشی کے اس سے بہتر مواقع پیش آیا کیے ہیں لیکن آپ نے اپنا ارادہ ملتوی رکھا۔اب اس وعدہ فراموشی کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے ۔

مَیں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ اس لیے نہیں کہ اس سے رفع شر مقصود تھا بلکہ کوئی جواب ہی نہ سوجھا ۔ جاکر چارپائی پر دراز ہوگیا ۔

(بہرحال) اب پانی سر سے گزر چکا تھا ۔ ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھوں گا۔ خیال آیا کہ کمرہ میلا ہے ۔ تمام چیزیں بے ترتیب ہیں ان کی صفائی کر لوں تو پھر اطمینان سے لکھوں ۔ چنانچہ کمرہ صاف کیا گیا ۔ سب چیزیں قرینے سے رکھی گئیں۔ قلم اُٹھایا تو معلوم ہوا روشنائی نہیں ۔ فوراً بُک ڈپو پہنچا کہ روشنائی کی شیشی خریدوں۔ وہاں معلوم ہوا کہ بُک ڈپو کی چھت ٹپک رہی ہے ۔ فلاں کتاب نہیں آئی ، پارسلوں کی بلٹیاں وی ۔پی ، آئی ہیں ، روپیہ کا انتظام کیجیے ۔ ۔ ۔ ۔ تین گھنٹے اس کی نذر ہوئے ، شام ہوگئی ، مکان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ داخلے کے سلسلے میں لڑکے "معہ والدین" آئے ہوئے ہیں تھرڈ کلاس پاس ہوئے ہیں ۔ گھر سے ایک پیسے کی امداد نہیں. ہوسکتی فیس معاف ہونی چاہیے ۔ قرض حسنہ دلوائیے ، آفتاب ہال میں جگہ مل جائے ۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا بندوبست کیجیے ، فرنیچر گھر سے دیجئے صبح حبیب صاحب سے ملائیے وائس چانسلر صاحب کے ہاں لے چلیے قوم کی غفلت ،مسلمان بچوں کی تباہی پر ان کے ساتھ ۔ ماتم کرتا رہا اور ما حضر کھاتا کھلاتا رہا ۔

نو بجے رات کو زنان خانے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ دو ایک صاحب بیمار ہیں ۔ ایک صاحب کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں ۔ دوسرے صاحب اس قدر کھا رہے ہیں کہ اُن کی صحت خطرے میں ہے اور ماں عنقریب ایسا سلوک کرنے والی ہے ،جس سے اُن کے اعضاء جوارح خطرے میں ہیں ۔ اُن کے قضیئے فیصل کر کے

لہ مضامینِ رشید ، ۱۸۹

بیٹھا تھا کہ (خیال آیا) اب کلاس پڑھانے کے لیے کچھ پڑھ لوں - کچھ دیر تک مراقبے میں رہا کہ ایک طرف سے سسکنے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی - پوچھا کیا ہے - آواز آئی پانی پیوں گا جب تک پانی مہیّا کیا جائے ایک دوسرے بزرگ نے ایک نالہ سر کیا - اُن کی خدمت میں حاضر ہوا - فرمایا ہم بھی پانی پیئں گے - اُن کے حکم کی تعمیل کی گئی - واپس آکر پھر کتابیں اُٹھائیں - اقبال سے رُجوع کیا گیا - کل کا سبق ہے "ارتقاء" نظم نکالی گئی:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفوی سے شرارِ بولہبی!

بات تو ٹھیک ہے لیکن آج کل کے مسلمان نوجوان اسے سمجھیں گے کس طور؟ "چراغِ مُصطفوی" پر ایمان نہیں "شرارِ بولہبی" کے قائل نہیں - اچھا مسئلہ خیر و شر سے بحث کی جائے گی لیکن خیر و شر کو سمجھتے تو "چراغِ مُصطفوی" اور "شرارِ بولہبی" کے سمجھنے میں کون چیز حائل تھی - اچھا، یہ بھی نہ سہی، سرمایہ دار اور مزدور کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کروں گا، چلو آگے پڑھو:

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سَرِشت اُس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

اس شعر کو سمجھانا ذرا دُشوار ہے - ایسی حیات جس نے "مشکل کشی" اور "جفاطلبی" سے ترکیب پائی ہو ان نوجوانوں کی سمجھ میں کیسے آئے گی جو حیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی کفالت کے ذمہ دار ان کے والدین یا مُسلم یونیورسٹی ہو اور . . . . تکلیف ہو تو چیخنے لگیں راحت ہو تو کسی اور کی چیخ سنائی نہ دے - اَچھا - ان کو مثال دے کر سمجھایا جائے گا - مُسلمانوں کی تاریخ تو ان کے نزدیک افسانۂ کہن ہے موجودہ ترکوں کی مثال ان کی سمجھ میں آجائے گی لیکن اگر کوئی "شمشیرِ بے نیام" یہ بول اُٹھا کہ موجودہ تُرک مسلمان کب ہیں تو کیا جواب ہوگا؟ — کچھ ہرج نہیں حکومتِ ترکیہ جدیدہ اور حکومتِ ترکیہ اِسلامیہ کے مَظاہرِ شخصی بھی دو ہیں، مُصطفیٰ کمال

اور رؤف بے ---- بہرحال اس پر مفصّل بحث کرنی ضروری ہے - ہاں یہ بھی دیکھ لینا چاہیے اگر بعد کے اشعار مشکل ہوئے تو پھر محفوظ طریقۂ کار فریقین کے لیے یہی ہوگا کہ ساغر اور شراب کے قصّے کو اور پھیلا کر بیان کیا جائے - گھنٹہ ختم ہو جائے گا اور جان بچ جائے گی!

اچھا تو اس بحث ہی کو کیوں اُٹھایا جائے - "مشکل کشتی" اور "جفا طلبی" کا فلسفہ موجودہ جرمن قوم کی مثال سے سمجھایا جائے گا - چلیے ساری دقت حل ہو گئی - ان مسلمان نوجوانوں کی سمجھ میں اس وقت تک کوئی چیز نہ آئے گی جب تک آپ اسلامی ادبیات تاریخ کی مثالیں پلیش کرتے رہیں گے - ہاں آپ کسی غیر اسلامی چیز کو اُٹھائیں اور یہ آپ کے معتقد اور ہم نوا بن جائیں گے لیکن اس وقت اس کا موقعہ نہیں ہے کہ قوم کا ماتم کیا جائے کسی نہ کسی طرح سبق پر نظر ڈال لینی ہے:

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

خدا کا شکر ہے کہ اس شعر کے سمجھنے میں زیادہ دقّت نہ ہوگی اوّل تو یہ بحث مشکل کشی اور جفا طلبی کے سلسلے میں آ چکی ہوگی لیکن اگر کچھ کسر رہ گئی تو پھر اُن کو وہ زمانہ یاد دلاؤں گا جب امتحان قریب ہوتا ہے اور کورس کورا! شام کو بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتے ہیں - نیند آتی ہے تو اُٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں پھر پڑھتے ہیں - نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو چائے کی تیاری میں ہر قسم کی زحمت اُٹھاتے ہیں - پھر پڑھائی شروع ہوتی ہے - زور کی نیند آتی ہے - تھوڑا سا کورس باقی رہ جاتا ہے - اب بغیر دودھ اور شکر کے چائے پی جاتی ہے اور آخری حملہ ہوتا ہے کہ کورس ختم ہو جاتا ہے اور پاس کے درختوں پر پرندوں کا پہلا نغمہ شروع ہوتا ہے۔ اُفقِ مشرق سے آفتاب اُبھرتا ہے یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبریل!

کشاکشِ زم دگرا تب و تراش و خراش
نہ خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

مقام بست و شکست و فشار سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی

یہ دونوں اشعار "گوئٹے" کے ہیں۔ اس عہد کے نوجوان "ساغر اور شراب" کا مفہوم ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ دقت اس وقت پڑتی ہے جب ساغر اور شراب کو تصوّف یا تصوّف کو ان کے قالب میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سہولت یہ بھی ہے کہ آج کل فنِ تعلیم یا فنِ معلّمی کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے، موضوع کو دلچسپ بنا دیا جائے اور ساغر اور شراب وہ چیزیں ہیں جو "دلچسپ" بھی ہیں اور "لذیذ" بھی!

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اس "کشاکشِ پیہم" پر بحث ہو چکی ہے۔ ملّت عربی کو پیش کرنے کا موقعہ دیکھا جائے گا۔ آخری شعر فارسی کا ہے۔ موجودہ دور میں اُردو ہی کون سمجھتا ہے کہ یہ فارسی کا شعر پیش کر دیا گیا۔ ستارہ می شکنند آفتاب می سازند کی بلندی اور بلاغت سے ان لوگوں کو کیسے آشنا کیا جائے گا۔ جب میں ایک صاحب "فغان" پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ اگر سمجھا نہ سکا تو اُردو کا ایک شعر پڑھ کر بھاگ کھڑا ہوں گا:

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چند بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

دوسری کلاس میں غالب پر درس دینا ہے رات زیادہ آگئی ہے مگر کوئی مفر نہیں ہے۔ خدا کرے سبق آسان ہو، غالب کا دیوان کھولا گیا ہے سبق ہے:

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

لیکن اب الفاظ اور سطروں کی بجائے کچھ اور پیشِ نظر ہے۔ مفہوم کی بجائے نیند چلی آتی ہے۔ پہلا مصرعہ، امرِ مسلّم ہے لیکن دوسرا قطعاً خلافِ واقعہ ہے۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دوسرے دن علی الصباح مضمون لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا روشنائی کی شیشی خریدنا بھول گیا۔ پنسل ڈھونڈ کر نکالی۔ مضمون کا عنوان کیا ہو۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر طے کیا، عنوان نہ سہی، مضمون کی فکر کرو لیکن مضمون کا پتہ نہیں اچھا عنوان پر زور لگاؤ مثلاً ۔۔۔۔۔۔۔

چل[1] مرے خامہ بسم اللہ — [2] ہم مضمون لکھ رہے ہیں اور یونیورسٹی کے گھنٹے پر کان لگائے ہوئے ہیں۔ یہ لیجئے گھنٹہ بجا ۔۔۔۔ دوسرا گھنٹہ اور ہم اس طور پر جھپٹے جیسے کوئی فائر بریگیڈ، آتشزدگی فرو کرنے کے لیے جا رہا ہو۔ بیوی تو زد سے بچ گئیں لیکن دو ایک بچے اور اسی قسم کے چند اور متفرق ذی حیات اور غیر ذی حیات چیزیں جھپٹے میں آتی گئیں۔ ہم غالب رہے اور کہیں مغلوب، کسی کو روتے، کسی کو بسورتے، کسی کو مجروح کرتے ہوئے صاف نکل گئے اور یک[3] لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں۔ بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والوں کے لیے (خاصا) بصیرت افروز اور دلچسپ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہر اُس گزر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہار خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے! (بہر طور، کلاس[4] میں پہنچ کر کرسی پر اس طور جا کر بیٹھے جیسے سینکڑوں عقل مندوں میں ایک بیوقوف یا سینکڑوں بیوقوفوں میں ایک عقلمند!!

---

[1] مضامینِ رشید، ۱۹۲ — [2] مضامینِ رشید، ۲۷۰
[3] مضامینِ رشید، ۱۴۲ — [4] مضامینِ رشید، ۲۷۱

لاحول[1] ولاقوت کہاں سے کہاں جا پڑا، ہاں تو تذکرہ[2] تھا یہ کہ "میں[3] کام اس وقت زیادہ کرتا ہوں جب فرصت کم ہو۔ موسم خراب ہو اور طبیعت بھی اچھی نہ ہو، ایسے مواقع پر ــ کام میں لگ جانا یوں مفید ہوتا ہے کہ میرا ذہن اس تکلیف اور نامساعد حالات کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ کام کرنا وہ نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر قسم سے مصائب غرق کیے جا سکتے ہیں ۔ جب موسم خوشگوار ہو اور طبیعت بحال تو مجھے کام کرنا مطلق پسند نہیں ہوتا ۔ میری لغت میں تعطیل منانے کے یہ معنی ہیں کہ کسی کو مزے کا خط لکھا جائے ۔ گھر سے باہر قدم نہ نکالا جائے ۔ باغ میں کام کیا جائے، گھر کی صفائی کی جائے ۔ ایک آدھ وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے یا دو چار وقت کا کھا لیا جائے ۔ بیوی بچوں کو بھی کوئی کام نہ کرنے دیا جائے جو ملنے آئے اُس سے طرح طرح سے بچا جائے ۔ غسل کا اہتمام کیا جائے اور صرف ہاتھ پاؤں کو جھاڑ پونچھ لینے پر اکتفا کیا جائے !!

تعطیل[4] میں کام کرنے کا جو وعدہ کر لیا جاتا ہے اسے تعطیل ہی میں پورا کر دینا نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں ۔ تعطیل میں وہ کام کرے جسے کام کرنے سلیقہ نہ ہو یا جو کام نہ کرنے کے فن سے ناواقف ہو ۔ میں نے اس فن میں بڑا ریاض کیا ہے ۔ اوّل تو یہ کہ یہ بڑی کم ظرفی ہے کہ اِدھر کام آیا، اُدھر لگے اُسے کرنے ۔ میں پہلے تو ہر قسم کا کام اکٹھا کرتا جاتا ہوں اور جب سمجھ لیتا ہوں کہ کاموں کی اچھّی مقدار جمع ہو گئی ہے تو پھر ان کی کھتونی شروع کرتا ہوں ۔ بڑے کام، اوسط کاموں کو چھوٹے کاموں سے ٹکراتا ہوں اس میں سارے چھوٹے کام پاش پاش ہو کر ختم ہوتے ہیں اور اوسط کام بھی اچھّی خاصی تعداد میں مجروح ہو جاتے ہیں... اب اوسط کو بڑے کاموں سے ٹکراتا ہوں ۔ ظاہر ہے کہ سارے اوسط کام، کام آجاتے ہیں اور بڑوں میں بھی مقتولین، مجروحین کی تعداد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] مضامینِ رشید، ۲۳۴ [2] مضامینِ رشید، ۱۳

[3] سہیل کی سرگزشت، ۱۸ [4] دیباچہ "دنیائے تبسم" (از رشید صاحب، تصنیف شوکت تھانوی) ۶۰

اس کے بعد جو جانچ پڑتال کی جاتی ہے تو صرف بعض سخت جان باقی ملتے ہیں اُن کو اپنی سہل انگاری، حیلہ پردازی ناکسی و نااہلی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی زد میں، جن کا اعلان نامناسب ہے، لاتا ہوں ۔ نتیجہ اکثر خاطر خواہ نکلتا ہے ۔ میرا کچھ نہیں بگڑتا لیکن کاموں کا مطلع صاف ہوتا ہے ۔ قرض کے معاملے میں بھی یہی اُصول جزئی ترمیم کے ساتھ کام میں لاتا ہوں!

لکھنے[1] میں ظاہری ارادے کو بھی دخل ہوتا ہے اور مَیں خود بھی ارادہ کرتا ہوں لیکن دراصل میرے لکھنے میں میرے ارادے کو اتنا نہیں، جتنا ایک خاص لمحے کو دخل ہوتا ہے ۔ یہ مَیں کبھی نہ دریافت کر سکا کہ وہ لمحہ کب اور کیسے میسّر آ سکتا ہے ۔

مَیں لکھنے میں ابتدا اور ارتقا اور عروج وغیرہ قسم کی بات ملحوظ نہیں رکھتا ۔ مخلصانہ اور بے تکلّف گفتگو میں ان اُمور کی پابندی نہیں کی جا سکتی اور نہ کرنا چاہیے ۔ مجھے مضمون نگاری کے آداب و تسلیمات بھی نہ آئے ۔ مَیں قارئین کو اپنا اچھّا اور بے تکلف دوست سمجھ کر گفتگو کرنا شروع کرتا ہوں ــــ اچھا اور بے تکلّف دوست ہی نہیں بلکہ اچھّا اور بے تکلّف خاندان بھی ۔ جس میں جوان، بوڑھے، بیمار، تندرست، مُلول، مسرور سبھی ہوتے ہیں ۔ مَیں اپنے آپ کو اس حلقے میں ایک اچھے رفیق کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں (یا کم از کم نیت اور کوشش ضرور ایسی ہوتی ہے!!)

اَچھی گفتگو کسی پروگرام کے تحت نہیں ہوا کرتی کہ صرف یہ ہوگا اور یوں ہوگا ۔ گفتگو کرنا ایک سفر کی مانند ہے جس میں مختلف مَناظر، مختلف اشخاص اور مختلف حالات و حوادث سے سابقہ ہوتا ہے ــــ ایک اچھا آدمی ہم سفر کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور اُن کے رنج و راحت کو اپنے رنج و راحت پر ترجیح دیتا ہے یہ شرافت ہی کی نہیں، اَچھّے لکھنے والے کی بھی پہچان ہے ۔ لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں بھی رونا، گڑگڑانا، رُعب بٹھانا اور قابلیت جتانا نااہلوں کا کام ہے ۔ میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے ہیں، مربوط اور مُسلسل نظم کی مانند نہیں ۔

---

[1] سہیل کی سرگزشت ۔ ۲۸۰

اِن مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق ہیں۔ مَیں خود بھی بہکتا ہوں اور دوسروں کو بھی بہکنے کی فرصت دیتا ہوں۔ عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جا سکتی ہیں، نہ سُنائی جا سکتی ہیں!!

۱۸

"میری داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ..."

o

مجھے[1] اچھے کھانے، اچھا پہننے اور راحت کی زندگی پسند نہیں۔ یہ باتیں دراصل عورتوں اور بچوں کو زیب دیتی ہیں۔ لباس[2] و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے۔ اس مسئلے پر یہاں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لیے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے۔ پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارے میں نہیں نہ ان کو ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اُن پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔

میں[2] سب سے کم وقت کھانا کھانے، کپڑا پہننے، مُنہ ہاتھ دھونے حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے یا سفر کے لیے آمادہ ہو جانے میں لیتا ہوں یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی ہے کہ دل میں خوشی اور خلوص ہو تو رسمی تکلفات بے معنی ہیں۔ مجھے اپنے اوپر وقت، دولت، راحت اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا بڑا شاق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھے یہ چیزیں بجائے خود ناپسند نہیں۔ مجھے ہر پسندیدہ چیز پسند ہے، البتہ میں اس کے درپے رہتا ہوں کہ اپنے بجائے اِن کا فائدہ دوسروں کو پہنچاؤں۔

---

[1] سہیل کی سرگزشت، ۱۶ [2] گنج ہائے گراں مایہ، ۲۰۲

دولت[1] اور فراغت کے خلاف ہوتا آرٹ، ادب، زندگی اور اس طرح کی دوسری باتوں کے صحیح و صالح تصور کے لیے آج کل ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔ میں اس کا کچھ زیادہ نہیں قائل ہوں اس لیے کہ آرٹ، ادب، امیری غریبی وغیرہ کے بارے میں میرا کچھ ایسا خیال ہے جیسے وہ میرے لیے ہوں نہ کہ میں اُن کے لیے۔ اُمیری غریبی افراد کی زندگی پر ان کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن یہ بات بھی بھلانے کی نہیں کہ افراد کی زندگی کا امیری غریبی پر بھی بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ آرٹ اور ادب اشخاص پر معمولی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن غیر معمولی شخص سے آرٹ اور ادب زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ زندگی اپنا چولا افراد میں بدلتی ہے، جماعت میں نہیں۔ جماعت اختراع و انقلاب سے مُعصوم ہوتی ہے۔ اختراع و انقلاب صرف افراد کا حصّہ ہے دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے نہیں بے نقاب ہو جاتے ہیں!

مجھے[2] زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی جو میرے اطمینان کے مطابق پوری (ہوتی دکھائی نہیں دیتی) یعنی یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجت مند کی اپنے اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا یا میرا کوئی ایسا دولت مند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی تو وہ میری خاطر اور مجھ پر بھروسہ کر کے اُسے پورا کر دیتا۔ میں خدا کی ناشکر گزاری نہ کروں گا اس بارۂ خاص میں میرے دوستوں ہی نے نہیں بلکہ میری تحریک پر بعض اجنبیوں نے غیر متوقع مدد کی لیکن واقعہ یہی ہے کہ میری تمنا اُس حد تک پوری نہ ہوئی جس حد تک میں اُسے پوری دیکھنا چاہتا تھا۔

میں[3] اُس آدمی سے بہت خوش رہتا ہوں جو مجھ سے کم سے کم ملے اور زیادہ سے زیادہ مجھ سے کام لے۔ مجھے دَرباداری سے سخت نفرت ہے۔ دربارداری کے محتاج وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لیے وہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اپنا نفس لعنت بھیجتا ہے تو وہ

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ۱۱   [2] سہیل کی سرگزشت، ۱۶

[3] سہیل کی سرگزشت، ۲۳

قصیدہ خوان اپنے ارد گرد رکھتے ہیں ۔ طوائف سے ہمدردی بھی کی جاسکتی ہے، دَربارہ والوں پر صرف لعنت بھیجی جاسکتی ہے ۔ مُصاحبین کی عقل و ذہانت کا مُغالطہ ان کی سرکار پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نظامِ شمسی اور کائناتِ عالم میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اُس کے مصاحبین سے زیادہ باوقعت اور قابلِ توجہ ہیں ۔ یہ مُشیر اور مصاحب اکثر تیسرے درجے کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی مثال بعض جزئی ترمیم کے ساتھ اُن مردہ کیڑوں کی ہے جو انجکشن کے ذریعے سے جسمِ انسانی میں پہنچائے جاتے ہیں اور زندہ کیڑوں کو ہلاک کر ڈالتے ہیں ۔ مصاحب اور مُشیرکار ناگزیر خرافات میں سے ہیں ورنہ رؤسا کی غیر ضروری آمدنی کا غیر ضروری ترمصرف ہی کیا ہو!

زیادہ[۱] سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست در بدتوفیقی ہے یہ باتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لیے رَوا رکھی جاسکتی ہیں ۔ دُنیا اور اس کے کاروبار اتنے دلچسپ ہیں اور ہر آن انسان کو بہتر و برتر بنانے میں اس درجہ مُعاون ہوتے ہیں کہ مَیں سونے میں ان کو کھونا گوارا نہیں کرسکتا ۔ سونا محض سونے کی خاطر میرے نزدیک فعلِ عبث ہے ۔ دُنیا دیکھنے اور برتنے کا جو لُطف اور ذمّہ داری ہے اُس کو آدمی سمجھ لے تو میرا خیال ہے کہ وہ بغیر اشد ضرورت کبھی سونے پر آمادہ نہ ہوگا۔

بڑا[۳] قرض لے کر چھوٹے چھوٹے قرض دینے اور اس کے ادا کرنے کی بے حد خوشی ہوتی ہے ۔ مَیں قرض کو فنونِ لطیفہ میں سے سمجھتا ہوں ۔ کب لیا جائے کس سے لیا جائے ۔ اس سے دوستی بڑھائی اور گھٹائی کس طرح جاسکتی ہے ۔ میرے ایک دوست اکثر بے وجہ مجھ سے خفا اور اپنی بیوی کی طرف سے مغموم ہوجایا کرتے تھے چنانچہ کبھی میں اُن کو ایسی حالت میں پاتا تو فوراً کسی بہانے سے قرض مانگ بیٹھتا اور وہ یک لخت چوکنے اور چونچال ہوجاتے تھے!

---

[۱] مضامینِ رشید ، ۱۵۷ [۲] سہیل کی سرگزشت ، ۲۳

[۳] سہیل کی سرگزشت ، ۱۸

سفر[1] میں آپ کم ایسے ساتھی پائیں گے جو اچھی جگہ پر خود قبضہ پانے کی فکر نہ کریں۔
ہار جیت کا کوئی تفریحی کھیل آپ ہارنے یا جیتنے لگیں تو فوراً ظاہر ہو جائے گا کہ آپ شرافت و انسانیت کی کس منزل میں ہیں۔ شاپنگ میں معمولی ساتھی بہت جلد اُکتا جاتا ہے اور چاہے وہ کتنی ہی کوشش اس کے خلاف کیوں نہ کرے اُس کی بیزاری ظاہر ہو جائے گی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب وہ اپنا کام ختم کر چکا ہو اور سب سے بڑھ کر آزمائش تو وہ ہے جب آپ کی قسمت میں خواتین کے ساتھ شاپنگ کرنا لکھا ہو ......

شاپنگ کا تو مجھے مرض ہے جس طرح بعض خبطی علی الصباح بلا قیدِ موسم و موقع بے ضرورت غسل کرنے یا ٹہلنے سے باز نہیں آتے اور شریفوں کے سامنے فخر کرنے سے نہیں شرماتے اور اس روزمرّہ میں خلل آجائے تو تمام دن سکرات میں مبتلا رہتے ہیں ویسے ہی اگر میں کسی نئی جگہ جاؤں اور وہاں محض قوم کے درد میں مبتلا رہوں اور شاپنگ کرنی نصیب نہ ہو تو میں بھی آپے میں نہیں رہتا اور سمجھتا ہوں کہ لوگ انسانیت پر فخر کیسے کرتے ہیں جب مجھے شاپنگ کرنے تک کی فرصت یا مقدرت نہیں!

شاپنگ کا میرا اُصول یہ ہے کہ روپے کم خرچ کیے جائیں۔ اشیا زیادہ خریدی جائیں۔ دوڑ دھوپ زیادہ کی جائے۔ روپے زیادہ ہوں تو کم خرچ کرنا آسان ہے۔ جب کم ہوں تو کم خرچ کرنا بڑا مشکل فن ہے اور بالکل نہ ہونے پر بھی خرچ کیے جانا تو خاصانِ خدا ہی کا خاصا ہے! ایسی حالت میں اگر کوئی نادر چیز نظر آجائے تو کسی صاحبِ مقدرت کی تلاش کروں گا اور اُس سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے لیے اسے خرید لے اور میرے ذوقِ خواری یا خریداری کو تسکین پہنچائے!

جو[2] بات (کوئی) صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے، اُس کو اُن کے سامنے میں کسی شکل میں نہیں چھیڑتا۔ نہ اس ٹوہ میں رہتا (ہوں) کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ میرا یہ رویّہ تنہا (کسی ایک) صاحب ہی کے ساتھ نہیں اپنے سب ہی) عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ ...۔ تمام عمر یہی رہا۔ تاوقتیکہ مجھے اس کا یقین نہ ہو جاتا کہ وہ اپنی دشواری

---

[1] ذاکر صاحب، ۳۱ [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۲۳

میرے سامنے اس لیے نہیں پیش کرتے تھے کہ اُن کے خیال میں اس سے میرے تردّدات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا۔ ایسی صورت میں اُن کے فکر اور پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرورت کوشش کرتا ہوں۔

مَیں مسلمان پیدا ہوا۔ نہ میری پیدائش میں میرا کوئی دخل تھا اور نہ مسلمان ہونے میں؛ لیکن زندگی بھر جب مجھے ہر بات میں دخل تھا خودکشی بھی کرسکتا تھا اور اسلام سے بھی مُنحرف ہو سکتا تھا، مَیں نے زندگی اور اسلام دونوں کو ایک ہی بات سمجھا۔ ظاہر میں بھی، باطن میں بھی۔ مجھے اسلام کا پابند رہنے میں کبھی کوئی اہتمام نہ کرنا پڑا۔ بُری بات کو مَیں نے ہمیشہ بُرا سمجھا اور ہر اچھی بات میں اسلام کو معاون پایا۔ مَیں مُسلمان نہ پیدا ہوا ہوتا تو بھی شاید مُسلمان ہی رہتا، یہ اور بات ہے کہ مُسلمان نہ کہلاتا۔ مَیں خدا سے سلوک کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہا۔ بغیر اس خیال کے کہ خود خُدا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا اور بغیر اس بات کو ذہن میں لائے کہ خُدا کا تصوّر مُسلمانوں کا کہنا ہے یا کسی دوسرے کا کہنا ہے قطع نظر اس کے کہ حضرت رسالت مآب کا تصوّر میرے ذہن میں ہمارے ہی جیسے ایک انسان کا تھا جس سے بڑے اور برگزیدہ انسان کا تصوّر میرے ذہن میں بھی کبھی نہ آیا۔ مَیں کیا اور میرا تصوّر کیا لیکن میرے لیے تو یہ سب کچھ ہے!![1]

یونیورسٹی[2] میں رہ بس جانے کے سبب سے مَیں نے مسلمانوں کی گذشتہ (۵۰، ۵۵) سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا۔ اطمینان یوں کہ مجھے ازل سے ایمان، عقل، آرٹ وغیرہ کا جو حصّہ ارزانی ہوتا تھا وہ ذرا واجبی ہی تھا۔ اس لیے کوئی تحریک یا تہلکہ کہیں اُٹھتا، کیسا ہی اُٹھتا، مَیں اپنے اُس بہرہ کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا یعنی نہ ان تحریکوں اور تہلکوں سے آنکھ مچولی کھیلی، نہ زور آزمائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا عقل، صحت، آبرو سب بحال رہے!!

گذشتہ (۵۰، ۵۵) سال[3] میں علی گڑھ کا کوئی انقلاب ایسا نہ تھا جس میں بحیثیت طالب علم، یا ممبر اسٹاف نہ گزرا ہوں۔ میری زندگی کا سب سے وقیع حصّہ علی گڑھ کے لیے صَرف ہوا۔

---

[1] سہیل کی سرگذشت، ۱۹   [2] ہم نفسانِ رفتہ، ۴۷

[3] سہیل کی سرگذشت، ۱۵

مَیں نے یہاں شہرت حاصل کی اور آسودگی پائی ۔ علی گڑھ کی فیض بخشیوں نے مجھے دوسرے کے فیض سے بے نیاز کر دیا ۔ علی گڑھ میری زندگی، میری شخصیت اور میری تحریر میں جاری و ساری رہا !

میں[1] اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا ہوں ۔ مجھے کم و بیش ہمیشہ ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی مَیں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے ۔ ۔ ۔

علی گڑھ آئے ہوئے (مُدّت) ہوئی ۔ گھر سے پہلے پہل نکلا تو زندگی کچھ اور تھی، اب کچھ اور ہے ۔ پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا اب خُدا کے فضل سے ہر طرح کی کامرانی اور فراوانی حاصل ہے یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے کہ (قریبی اعزہ) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری کامرانی سے خوش اور مطمئن ہیں لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی، یہاں کی ہماہمی، بیوی بچے، دوست احباب، وطن سے دُوری اور اس قسم کی بہت سی باتوں نے کبھی اِس کا مَوقع نہ دیا کہ اُن لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور شہرت میں شریک ہونے کا حق رکھتے تھے ۔ مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں ۔ ان حقوق کو مَیں تھوڑا بہت اُدا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہیے اور جتنا کرنا چاہیے، اُس سے اغماض کرتا ہوں ۔ بہنیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں ۔ بھائی بھی برسرِکار ہیں ان میں کوئی آرام سے بسر کر رہا ہے اور کوئی تنگی ترشی سے ۔ ۔ ۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں اور جلد واپس [illegible] ہوں ۔ مجھے معلوم ہے اگر مَیں ان سے ملنے کے لیے ذرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو اُن کی [illegible] کی کوئی انتہا نہ ہو گی لیکن وہ جانتے ہیں کہ مَیں بیوی بچّوں میں جلد سے جلد واپس آ جانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں ۔ اس لیے اشارۃً کنایۃً بھی کبھی اِس کا اظہار نہیں کرتے کہ مَیں تھوڑے عرصے کے لیے اور ٹھہر جاؤں ۔

میری[2] داستان کا خُلاصہ یہ ہے کہ میری علی گڑھ کی زندگی اُس زندگی سے بالکل مختلف ہو گئی ہے جو مَیں اپنے والدین اور اعزّہ کے ساتھ وطن میں بسر کر چکا ۔

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ ، ۵۵ [2] گنج ہائے گراں مایہ ، ۵۷

اِس زندگی میں جہاں میں گذشتہ آلام و مصائب کو بھول چکا ، وہاں اُن ذمہ داریوں کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کرگیا جو اَپنے بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عاید ہوتی ہیں ۔ وُہ مجھ پر اَب بھی جان چھڑکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں اُتنا ان کے رنج و راحت سے میں محزون یا محظوظ نہیں ہوتا فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لیے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے ۔

مَیں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں ۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اُن کے مسرت کے پیالے کو جو بہت ہی اُتھلا ہے اپنی ادنیٰ توجہ سے لبریز کر دوں لیکن مجھ سے یہ ہو نہیں پاتا ۔ نفس حیلے تراشتا ہے تو مَیں اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں ۔

(پھر بھی) علی گڑھ مجھے عزیز ہے ، اس کی کوتاہیوں کے باوجود اگر وہ قابل اعتنا ہوں ۔ یقیناً اُن عزیزوں اور بزرگوں کو بھی عزیز ہوگا جن کو اِس نے اَپنے فیض تربیت سے اخلاص و افتخار سے رہنے سہنے اور دوسروں کو رکھنے کا سلیقہ اور حوصلہ دیا اور انسانی زندگی جن قیمتی اَقدار و روایات کے سہارے نمود و نمو پاتی اور برگ و بار لاتی ہے اُن سے آشنا کیا ۔ (پچاس) سال تک مسلسل جس کو علی گڑھ نے اپنی ان نعمتوں سے بہرہ مند رکھا ہو علی گڑھ کے بارے میں اُس کے تصوّرات و تاثرات اگر :

بے ربطیٔ شیرازۂ اجزاے "حواس" [1]

کی حد تک پہنچتے ہوں تو کیا تعجب — !

جیسا کہ وقتاً فوقتاً اعتراف کرتا رہا ہوں مَیں بذاتِ خود کچھ "مقامی" سا آدمی واقع ہوا ہوں ۔ "آفاقی" یا "ماورائی" قسم کا ہونے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں ، نہ حوصلہ ، نہ ہوس ۔ اِس لیے میری فکر و نظر بھی محدود "آنی و فانی" قسم کی چیز ہے ۔ ہر شخص کی ہمت اُس کی طبعی اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق ہوتی ہے ۔ اِس لیے اگر میں علی گڑھ

---

[1] آشفتہ بیانی میری ، ۹ [2] آشفتہ بیانی میری ، ۱۲

گو اصغر مرحوم کے اس شعر سے تطبیق دیتا آیا ہوں یا دے لیا کرتا ہوں تو کیا ہرج :

یہی تھوڑا سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا میخانہ
اسی سے رند رازِ بلند مینا سمجھتے ہیں

میری "ہمت" یقیناً بلند نہیں ہے ۔ اس لیے ممکن ہے "پیشِ خدا وخلق" میرا اعتبار بھی کچھ زیادہ نہ ہو ، بایں ہمہ خود اپنی نظر میں کچھ ایسا نا معتبر بھی نہیں ہوں !

داستان طویل ہوگئی ۔ عام طور پر اس کے دو اسباب ہوتے ہیں ۔ تبحرِ علمی یا ہرزہ سرائی ، یا دونوں ۔ ناظرین میں سے کچھ میرے تبحرِ علمی کا حُسنِ ظن رکھتے ہوں گے ، کچھ میری ہرزہ سرائی کے مُعتقد ہوں گے اور کچھ بلحاظِ رفعِ شر دونوں کے قائل ! بہرحال ہر ایک کے لیے کافی مواد ہے ۔ البتہ دُعا یہ ہے کہ اِن سُطور کا حشر ایسے ہاتھوں سے ہو جو متذکرہ صدر ہرسہ محرومی سے مامون و مصئون ہو ۔ اپنی طرف سے البتہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اِس قسم کے "جراَتِ رندانہ" یا "شوقِ فضول" کا آئندہ عزم نہ کروں گا ۔

ناظرین دُعا کریں "فسخِ عزائم" کی نوبت نہ آئے کیونکہ مَیں وجودِ باری کا قائل ہوں ، علماً ، عملاً ، فطرتاً ، اخلاقاً ، ضرورتاً ـــــ اور وغیرۃً !!

٥

---

[1] مقدمہ دیوانِ فانی ، باب دوم ، ۱۷

286
1179

• — لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گزرا۔ اچھّے ساتھی، اُن سے اچھے اُستاد اور سب سے اچھّے اپنے ماں باپ، بھائی بہن؛ پھر دوستوں کے ماں باپ، بھائی بہن، سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کردی تھی، اور دُوسروں کی عزّت و خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کردیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔

O

" — مُدّتِ حیات کا حساب کتاب، سال اور ماہ کے گزرنے سے نہیں کرتے، عزیزوں کی مفارقت سے بھی کرتے ہیں — وہ اُٹھا لیے جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ختم ہوگئی۔ عمر چاہے جہاں تک پہنچے، عمر پانے کو زندہ رہنا نہیں کہتے۔ زندگی، اپنی زندگی سے اتنی عبارت نہیں ہوتی، جتنی عزیزوں کی زندگی اور خوشی سے ہوتی ہے — "

O

" — آپ میری سوانح زندگی سے واقف ہیں۔ خدا نے علم کی دولت عطا فرمائی، کھانے پینے سے خوش رکھا، جاں نثار احباب و اعزہ دیے، شہرت اور قبولِ عام ارزانی فرمایا — مجموعی طور پر یہ نعمتیں ایسی ہیں، جن کے وجود پر ہر سمجھدار انسان کو شکر گزار ہونا چاہیے — میرے اُستاد حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ میں نے یہ استدعا کی تھی کہ حریمِ قدس میں میری طرف سے یہ عرض کردیا جائے کہ اے خدا تیرا ایک عاجز بندہ تیری دی ہوئی نعمتوں کا شکر گزار ہے۔ وہ کچھ مانگتا نہیں، اس کا صرف سجدۂ شکر قبول فرمایا جائے — "

— رشید احمد صدیقی

"سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے جس طور پر میری آپ بیتی کو ترتیب دیا ہے،
اُس سے، اُن پر کیا بیت گئی ہوگی، اس کا اندازہ، وُہ نہیں، میں کر سکتا ہوں —
مُعین صاحب نے محبّت و عقیدت میں ہر دشواری کو آسان ہی نہیں، پُر لُطف
بنا لیا ہو تو عجب نہیں ——"

—— پروفیسر رشید احمد صدیقی